

سنگزشت

دسمبر 2022

سورج

فتح: چونکا دینے والی سچ بیانی
زخم خوردہ: اردو کے ایک اہم قلم کار کی داستان
بقلم خود معروف مصنف مہتر رام کی خوشگشت

سورجی ٹیبلیٹ سے نونین دسمبر 2022 کا حسین شمار

پاکیزہ

ناہید سلطانہ اختر، شیریں حیدر و شہینہ گل کی قسط اور تحریریں ایک پوکا سینے والے دہریہ

سبحر سجاد کی اپنے قصوں میں انداز تحریر کے ساتھ میرا بخت کی سورجی

عالیہ حرا، فرح بختو، دردانہ نوشین خان کی دلچسپ اصلاح کن تحریریں

شمس عذابت کے سلسلے میں اختر شجاعت اور حضرت خدیجہ بی بی انور رضی اللہ عنہا

شانستہ زریں

وہ آنے لزم میں

اپنے سلسلے گھر آگن کے تاریے میں لاتی ہیں

ماہریت کیجئے غمخواری میں نے والی قلمبر

نیلو فر عباسی کی ان کا نثر شمع سوار

مذہبہ شاہد

کے بچپن کے گمشدہ لحاظ

پڑتے حیدر نوشین، فوزیہ احسان رانا، نزہت حسین، سیما بنت عاصم

دو بکرہ عظمت کی پرشش جہیز کن کہانیوں

پڑتوں سلسلے سے بہ خوب صورت تراشیں پتی، شعر و شاعری سے مرصع اور حسن و بخت

کے حلق متن سے آراستہ ایسا پاکیزہ صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

سورجی ٹیبلیٹ

Qarshi

آج کل کی حالت یہ کہ آپ ہوں بڑی کمزور ہے اور کوئی اس سے ڈر کر دوی
ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہت ہی کمائی ہو صرف سورجی ٹیبلیٹ کو کھائیں۔

نہ رہے کوئی COUGHZADA

نہ ہی کوئی KHAUFZADA

Qarshi Pakistan | www.qarshi.com | www.qarshihealthshop.com



سبق
سیدہ شاہ شاہ
پچھلے ایسے ان کے جملے سارے
بھی ہوتے ہیں



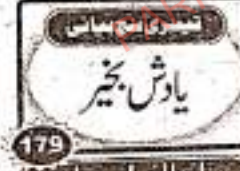
خونی شیرے
سلطانہ سلیم
عوام کو توجہ دے میں کو تباہی
حسان لے لیتی ہے



فطرت
سلطانہ سلیم
اس کی جنونیت نے
سیدان دکھائے



فتح
علی اسقادر
ان کی فتح کے لیے اس
نے کیا کچھ کیا



یادش بخیر
اموالغراء مجاہدین
ایک معمولی غلطی نے
بڑے حادثے کو جنم دیا



تمہی دامن
خلیل خان
قسمت زندگی کو تسلی
کہانی پسند آتی ہے



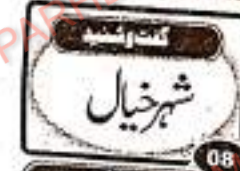
پارچے
تاریقین/ادارہ
دنیا بھر کے مختلف موضوعات
پر معلومات کا انشائیہ پارچے



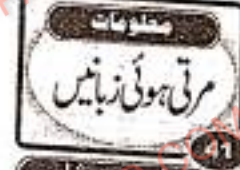
انصاف
سلیم شیخ
برا کر کے برا ملے گا یہی
مت قانون دست ہے



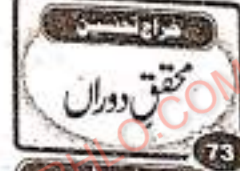
جنت
علی اسقادر مجاہدین
زندگی و عبادت اور اعمال
سے بہتر ہوتی ہے



شہر خیال
محبیر قارین
آپ کی باتیں آپ کے
مشورے اور آپ کے سوال



مرتی ہوئی زبانیں
امانہ صاحب
مال بولی کس طرح
دم توڑ رہی ہے



محقق دوران
مذراہ حسین
اس نے اردو کے محققین میں
ایک بلند مقام حاصل کیا



نوح اردو ادب
ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک
نادرووزگار کا تعارف خاص



زخم خوردہ
رویا صفوان
صوفیائے پاکستان پر تحقیق کا نیا
پابستم کرنے والی شخصیت



بقلم خود
خود میں
ایک مصروف قلم کار
کی سوانح نامہ کی زبانی



روسیاہ
عاطف سائین
ایک شوریدہ سرنو جوان
کی داستان جنوں خیر نی



فراری
زین سیدی
اس بوجھ کے لیے پہلی
بار شہر دیکھا تھا



سنہرے دن
علی سلطان آفاق
پاکستانی مسلم منہ کی
ان کی کہانیاں

نوح اردو ادب

دہلی کا حسن شباب پر تھا۔ شہر علماء، فضلا، شعرا سے لہا لب بھرا ہوا تھا۔ گو کہ مغل حکومت لال قلعے تک محدود ہو چکی تھی۔ فرنگیوں کا دور دورہ تھا۔ اسی دور میں 5 مئی 1830ء کو ایک صفائی کے گھر میں اس نے جنم لیا۔ اس وقت شیخ ابراہیم ذوق کی شاعری کا طوطی بولتا تھا۔ انہی کی زیر سایہ تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ ابھی وہ صرف چار سال کا ہوا تھا کہ اس کی ایرانی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس صغیر سنی میں یہ ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ ایسے وقت میں اسے چھوٹی بہن اپنے بازوؤں میں لے لیا لیکن یہ سہارا بھی دیر پا عایت نہ ہوا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ بھی انتقال کر گئیں۔ یہ در پہ ان حادثات نے ان کے ذہن پر بڑا اثر ڈالا لیکن ابراہیم ذوق کی وجہ سے وہ سنبھل گئے اور دوبارہ سے تعلیم کی جانب توجہ دینے لگے۔ اسے دہلی کالج میں داخلہ ملا تھا، ابھی تعلیم حاصل کرتی رہے تھے کہ کئی حالات بگڑنے لگے۔ والد کا اخبار ملک بھر میں شہور تھا۔ اس اخبار میں وہ بھی اپنی تحریریں دیا کرتا تھا۔ ان کی تحریریں بھی ہوتیں اس لیے خوب پسند کی جاتیں۔ اسی دوران 1857ء کی پہلی جدوجہد آزادی کی آگ بجڑک اٹھی۔ انگریزوں نے ان کے والد پر سنگین الزامات لگائے اور سرٹیفکیٹ نامی فرنگی افسر کے قتل کے الزام میں انہیں قو پ سے باندھ کر آویزا گیا۔ والد کی شہادت کے بعد وہ چھپتے چھپاتے گھسوا گئے۔ تقریباً دو ڈھائی برس گزار کر وہ لاہور کے لیے نکل پڑے۔ پورا کنبہ ساتھ تھا۔ کسپری کی حالت میں لاہور پہنچے۔ یہاں آکر انہیں محکمہ ڈاک میں سر نوشت دار کا عہدہ مل گیا۔ اس عہدے پر تین سال رہے پھر قسمت نے یادری کی اور ڈائریکٹر پبلک انشوریکشن کے دفتر میں ایک اہم عہدہ مل گیا۔ اسی دوران انہیں پنجاب کے سیکریٹری بھی مقرر ہو گئے۔ یہاں آکر ان کے جوہر کھل کر سامنے آئے لیکن جب گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی پروفیسر کا عارضی عہدہ ملا اور پھر اسی عہدے پر مستقل کر دیے گئے تو زندگی میں ایک سکون آ گیا۔ ایک اچھی ملازمت نے ذہنی طور پر فکر سے آزاد کر دیا تھا۔ انہوں نے اسی دوران سیاحت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایشیا کا سفر کیا اور سفر کے مشاہدات و تجربات کو قلمبند کیا۔ سیر ایران نامی سفر نامہ نے ان کی شہرت کو اونچے پر پہنچا دیا۔ اس کے بعد تو تصنیفات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ محمد ان فارسی، قصص ہند، دربار اکبری، نگارستان قاری، سپر ایمان، دیوان ذوق، نیرنگ خیال کے علاوہ فضائی کتابیں بھی مرتب کیں۔ اردو کی پہلی کتاب، اردو کی دوسری کتاب، اردو کی تیسری کتاب، قواعد اردو جیسی اہم کتب پیش کیے مگر جب انہوں نے ایک لازوال تاریخ ادب اردو کی کتاب مرتب کی تو ان کی شہرت آسمان پر پہنچ گئی۔ وہ کتاب آج بھی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس میں تاریخ ادب اردو، شاعری پر بحث وغیرہ شامل تھا اسی وجہ سے آج بھی اس کے حوالے دیئے جاتے ہیں کیونکہ کتاب نثر کا اعلیٰ نمونہ مانی جاتی ہے۔ اس کتاب کا عنوان ہے ”آب حیات“۔ مولوی محمد باقر مدیر ”دہلی اردو اخبار“ کے فرزند محمد حسین آزاد نے نظموں کو بھی نیا مزاج عطا کیا۔ انہیں محسن العلماء کا خطاب عطا ہوا تھا۔ انہیں ”نوح اردو ادب“ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ وہ 22 جنوری 1910ء میں لاہور میں تھے کہ بلاوا آ گیا۔ اس سرزمین پر آخری سانس لی اور پوند زمین ہو گئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

سیلاب آیا اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔ عوام نے، حکومت نے، مختلف مقامی تنظیموں نے متاثرین کی امداد کی۔ کھانا، کپڑے دیگر ضروری سامان کے ساتھ کئی علاقوں میں مکانات بھی تعمیر کرا دیئے۔ یہی ہم میں خوبی ہے کہ جب جب قدرتی آفات یا کوئی سانحہ ہو تو ہم سب مل کر وطن بازو بن جاتے ہیں۔ اس بار بھی اہل وطن نے عملی ثبوت پیش کیا۔ ہر قسم کی امداد پہنچائی لیکن اب ایک اور معیشت نے سراغ لیا ہے۔ کیپوں میں موسم، سیلاب کے ستارے لوگوں پر مشقت الارض ٹوٹ پڑے ہیں۔ ہر جگہ سے پتھر، بکھی، سانپ، پتھولی اطلاعات آ رہی ہیں۔ وہاں امراض بھی کہیں کہیں پھوٹ پڑے ہیں۔ اس جانب توجہ دینا ضروری ہے۔

آلام و مصائب میں گرفتار کسی اک جہد مسلسل کا سزاوار کسی

جلد 32 شمارہ 08 دسمبر 2022ء

ماہنامہ
نوح اردو ادب

مدیر: علی: عذرا رسول
مدیر: پرویز بلگرامی
نائب مدیر: فیصلہ ظہیر

مارکٹنگ منیجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789
سرکولیشن منیجر
سید ضیہ حسین
0333-3285269
محمد شہزاد خان
0333-2256789

قیمت فی پرچہ 150 روپے، ڈیڑھ سالہ 2000 روپے

پبلشر: پرویز بلگرامی: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63، ٹیکس ٹیشن
پتھر کٹر لبریا میں کوئی ڈالا
75500
پرنٹر:
مطبوعہ:
ایڈیٹر: پرویز بلگرامی
بانی: اسٹیفن بلگرامی

مکتوبات: 404 • پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200
Email: jdggroup@hotmail.com



شہر خیال
مدیر / قارئین



میں چاروں لکھنؤ میں ان کی ادب سے محبت کا نشانہ دیتا ہوں۔ میری خیال میں ان کا شمار ہے۔ پورے شہر کے جاہل اور گھریلو کے خلو میں جبر و جبر اور جبر و جبر سے
سزاوار کوئی صدارت مبارک ہو۔ بیسٹ کی طرح ہوگی۔ پورے شہر کے جاہل اور گھریلو کے خلو میں جبر و جبر اور جبر و جبر سے
بہت سے پہلو پر ہو رہی ہے۔ جیسے ہوتے ہیں۔ راحت و قناعت کی ان کی چوٹی ہے۔ آج کل چوٹی اور بڑی چوٹی کا ہونا ہے۔ جیسے
پڑے ہیں۔ ان کی چوٹی چوٹی کی چوٹی ہے۔ پورے شہر کے جاہل اور گھریلو کے خلو میں جبر و جبر اور جبر و جبر سے
پڑے ہیں۔ ان کی چوٹی چوٹی کی چوٹی ہے۔ پورے شہر کے جاہل اور گھریلو کے خلو میں جبر و جبر اور جبر و جبر سے
سزاوار میں ہوتا ہے۔ اور یہ خواہش کا فرض ہے کہ وہ اخلاق و دوری برقرار رکھیں۔ تمام قادیان صاحب کی چوٹی ہے۔ جیسے
بجڑ میں چوٹی کی۔ سستی شہر اور ہندو کی چوٹی میں بہت سے قابل لوگ اپنی صلاحیتیں بروئے کار نہیں لاتے اور جو عزت انہیں اپنی
قابلیت سے ملتی ہوئی ہے وہ ہر چاہی ہوئی ہے۔ انسان محنت کرے تو کامیابی ہو سکتا اور اس بات کو سب سے بڑا کام کرنا بہت
ہوتا ہے۔ اس طرح صحت کا حال دیکھ کر تعلیم کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے تعلیم کے لیے جس کی قید ہے اور نہ ہی عمر کی۔ رشتوں کی سزا پر
چلتی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔ ان کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔
وزارتیہ موصوفات نے چوٹی کی چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔
ملاقات کرنا اور پھر نہ کرنا چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔
کام تھا۔ اور مسلمان اس کی خدمت کرتی تھی۔ عرب قبیلے کی سزا کی خوف کی نے دل دلا دیا۔ ظہر کاٹنے میں جبر و جبر اور جبر و جبر سے
بڑوں کے جبر و جبر کی آگ سے پہلے خود اپنی نفس کو چوٹی کی چوٹی ہے۔ جس کے اندر اس کا جبر و جبر ہے۔ معتمد علی عباسی کا انتقام بھی ان کو قتل لے
ڈوبا۔ حیات قوی کر دیتا ہے۔ اور وہ چوٹی کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔
بہت دردناک انجام دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور یہی جبر و جبر اور جبر و جبر سے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔
یکے ہونے چوٹی نے ہر گھانا کام کرنے پر مجبور کیا اور جب انجام سامنے آیا تو کب اور خشکی کے پہاڑ کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اسلامی حکم کے
پس ملنے والے دنیا میں جبر و جبر ہیں اور آخرت میں بھی مایوسی اور جبر و جبر سے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔ چوٹی کا کارڈ کوئی چوٹی کی چوٹی ہے۔
میں چوٹی نے حیات کی فانی جڑیں ہر عام و خاص کے گرد پھیل دی ہیں۔ دوستوں کو عزت دینا اور اپنی عزت کو دوستوں کے سامنے لا دینا اور انک
مسلک ہیں۔ دوست آپ کا ہونا کوئی نہیں ہونے۔ اپنی آپ کے دوست کو مائی کے دوستوں پر لحاظ سے، مگر ہوتے ہیں اور شہر کا حال کشش بھی

یہی اثر دکھلا سکتی ہے۔ حتر یہ اور حرکت کار شد بھائی بہن کا ہی کسی فرمان نے جب ان دونوں کو اپنی غیر موجودگی میں کشتے پیٹھے دیکھا تو پیش میں آ کر روی کیا جو پیشہ کا اصل کام ہے۔ لیکن سے ہی کھلی کی کہانی ہے شہر بارہی اور دوسری ہے سب جہاں بھی کھلی نام نہانی دے سحر میں آوارہ گردی کرتا جنوں لاشعور سے نکل کر شعور میں کھیلنے لگتا ہے سیر حزر شریف کی ”پگیا“ ایسی ہی جگہ تھی جہاں کاشانی کردار کھلی تھی۔ محبت کیا ہے، کیوں ہوتی ہے جیسے سوالات کے ان وقت جوابات ہیں مگر انسانی عقل آج تک سے نہیں کر پاتی کہ اس جذبہ کو کیسے ختم کیا جائے یا خود سے کیسے ختم دیا جائے۔ ہاشم اور کھلی کی محبت نے بھی معاشرتی پریشانیوں کو کوامان سمجھا کر جب دور حاضر میں تھے تو کسی کو انکار کرنے کی ضرورت تھی اور اس وقت تو بالکل نہیں جب دونوں میں خون کار شد بھی تھا۔ لیکن اعتقاد ہی ہوا جو ازل سے ہوتا آیا ہے۔ والدین اگر چاہا لاؤ کہ ہر شخص جو ہے مگر انسان کب غلطی کر جائے یا احساس بہت دیر سے ہوتا ہے۔ ہاشم کو دل میں بسائے والی کھلی نے بھی والدین کے انتخاب کو پسند نہیں کیا اور چل کر مروی میں چوہدری زمان کو ایک باکل لڑکی ملی جو اپنے حواس محبت کے خون کو کھائی آتی تھی۔ وہ نہ ہاشم کو ملی اور نہ چوہدری زمان کو بلکہ اس کا دل کا باکل خانہ ضمیر کی ”قسمت“ قدرے افسانوی رنگ میں تھی۔ پراسراریت پر مبنی کج عیانی ”میزبان“ ممدوری۔ سادہ سادہ سبب بیان میں بھائی کی مختصر کج عیانی دوستی اور باوقی اضطراب جیسے عناصر میں تقسیم ہری سالمہ حسن نظامی کی تحریر ”بوس“ کا کج جیسے اے پرستار تھی۔ کج ہے کہ دنیا کی رنجشیاں انسان کو گمراہ کر دیتی ہیں مگر گمراہی میں بھی کھیلنے کا موقع ہمہ جا ہے۔ رستم نے بھی ہوش کار عیانی ہلا اور انجام کار ملی کی سلا میں اس کا مقدر نہیں۔ محمد فاروقی ملاہر کی نوکل دلچسپی تھی۔ بیاد پور کی رشتہ سرن زمین پر نور کل کا وجود تھے سحر میں بارش کی طرح ہے نور کل کی سیر میں نے 2018 میں کی تھی اور آج تک اس کا سحر محسوس ہوتا ہے۔ موت سے انسان کا گہرا رشتہ ہے لیکن آدم زاد ہر ممکن کوشش کے لئے موت چھوڑنا چاہتا ہے۔ مرے ہوؤں پر ہر لمحہ ماتم کرنا چاہتا ہے لیکن ان کی تحریریں دور قریبستان میں نہایت سے کجا جاز کی شکل ہر وقت کیسے ہی جائے؟ مضمون ہاں۔ بہ نظر امام صاحب خوب یاد ہے جس۔ نوشہ قضا پر مبنی خوب لطف ملا۔ مسامتہ ریں سر۔ ن۔ م۔ راشد کو انہیں جانتا ہر اہل ذوق شخص اس شاعر باکمال سے واقف ہے۔ گمراہ سواری اور شعر جن کے شوقین ن۔ م۔ راشد نے اپنی شاعری میں بھی سے حتر سے کھیلے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ نفیات اور جذبات کو یوں بیان کیا جیسے دونوں ہی گمراہیاں ہوں۔“

۱۰؎ اچانک حسین سحار کا تیرہ نور پور قتل سے۔ "پر چا کر پا جی سے ایک ہزار کو مٹو کا سفر طے کر کے تیسرے دن میرے گھر پہنچ گیا، میرا اخلاص صداقت کے لیے کیلئے دو سال میں تیسری بار منتخب ہوا ہے (یا ایک نیا ریکارڈ بنا رکھا) ملک سے آفت زدہ علاقوں سے سیلاب کا زور و حمل شمع ہوا ہے، یہ ایک ساتھ کی خوشیاں اکٹھی ہوئی ہیں تو قدرے سکون کا احساس لیا ہے۔ کیا چونکی خوشیاں ہمارا سرمایہ ہیں وگرنہ مصیبتیں پریشانیوں اور مسائل نہ کھولے دانت و کھارے ہیں لیکن ہم ایسے نصیب حالات کا سامنا کرنے کے شروع سے غامدی ہیں، زندگی صحت سلامت رہی تو سب سے نعمت نہیں گے، اب مضامین، کہانیاں اور دیگر مسلسل کا چا بڑھ لیتے ہیں۔ "بقلم خود" میں مختصر اہم صاحب اپنے بچپن، جوانی، بڑھاپے کے قصے دلچسپ انداز میں سنارہے ہیں، شاعری، ادب، محفل میں ہم عمر لوں سے دوستیاں، اور اس وقت کے عشق و ملاقاتیں، معصومانہ باتیں اور سرگوشیوں سے آگاہی لاری ہی ہے، یہ سلسلی کی بانگ چلتے چاہے ہم بھی ذاتی لذت حاصل کر کے جوانی کے دور میں پیچھے ہوئے ہیں، جسم میں فنی ترنگ، توانائی اور جذبوں کے ٹکھرنے، الجھنے کی خوشبو عروس کرد ہے، محفل خوب جچی ہوئی ہے۔ میں نے پہلے حصے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ سلسلہ مقبولیت حاصل کرے گا۔ ادارہ نے یہ سلسلہ شروع کر کے کاروبار کے لیے نیا باب کھول دیا ہے جس کے لیے ہم سب شکر گزار ہیں۔ "باتے" سے متعلق مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے ہوئے، چائے کے نوٹ، اقدام پر عمل کر رکھا گیا ہے لیکن جب معاملہ شرکار کا ہو تو پہلی چائے چاہی ہی بہت کام ہے۔ منطقی نہ ہو جائے نہ بیوقوفی ہی ممکن ہے۔ جہاں دوسری مشغلی چیزیں، نوٹیں چھوٹی جاں تو اس نامراد کے لیے کسی صبر کر سکتے اور ان محمد شاہزادہ کو درس کے جو پیکا مشروب پی کر کبھی صبر بشکر کا مظاہرہ کر دے ہیں۔ "قلم و ادب" میں دیگر شعبوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہ "مولانا جنت" کا اضافہ کر رہی ہے۔ جب کہانی نویس، پروڈیوسر، شیعہ موسیقی، نئے بیگ سنگرز اور فلم سازوں کی کامیابی کا براہ راست ہونا ہے، انتہا خوبی ہوتی ہے کہ کسی ناخاندانہ ذوق و ہمارے قلم اندازی میں دستیاب تھے، ہنرمند تھے، ذہین اور منتہی تھے اسی لیے کامیابیاں عجیب لیکن ناب کیے بازار ال آیا ہے کہ گذار خانے، سینما گھر اور فلمی کلور خواب و خیال بن گئے ہیں بلکہ عروج کے وقت بھی مولانا جنت کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی گئیں جس کا قلم ساز کو فائدہ حاصل ہوتا ہوا اور قلم کی مقبولیت بڑھتی رہی، ہمارے جو ہنرمند وفات پاچے ہیں اللہ انہیں جنت میں مقام عطا فرمائے جو زندہ ہیں انہیں صحت و قدرت بخشی ملے اور جو امی تک ڈٹے ہوئے ہیں ان کو کامیابیاں ملیں آم آئیں، "جیسے اللہ رکھے" ایسا مجزوہ ہے جسے عقلی اور حاجتی انگیزوں نے دیکھا، جولیا جہاز حادثے میں قح جانے کے بعد بھی موت سے جنگ لڑتی رہی، مسلسل بھوکے، پیاسے، خطرات سے جنگ لڑتے اور غیر معمولی حالات میں جہاں منتہی اور خوار اعتمادی سے آگے بڑھتی رہی اور آخر منزل پالی اور ہنگامہ خیز خوشگوار اور کامیاب زندگی گزار رہی ہیں جوان کی بہت، صبر اور جدوجہد مسلسل کی مرہون منت ہے اور بڑھنے والوں کے لیے مشکات میں راہ سے کی نشاندہی ہے (مزے کی بات ہے کہ اس کہانی پر جب مطالعہ کر رہی تھی تو تھمر کر میسر ہو گیا تھا کہ وہاں ایک سو فیصد کی کامیابیوں کا بیان ہے)۔

directed with free version of Watermark

دانت ہیں۔ یہم جگر تارخ کے جھرو کوں سے بہتر کاوش تھی۔ معص نے تجھے ہونے انداز میں واقعات کو تحریر کیا۔ جسے اللہ کے رحم و کرم سے
 ایک بچے والے کو تم کے ذریعے بہت بہتر انداز میں پیش کیا۔ اچھا سنی بھی دیا۔ یہاں پہلے کے حالات میں ایک لڑکی کا چھوٹی طبع پر بیٹا جانا
 اور زندگی کی بدولت جو معص نے بہت اچھے انداز میں لکھ کر کرین کو اچھا مواد بننے کو سہا کیا۔ اسے آرزویت کو اس سے قبل بھی سرگزشت کی
 توسیط سے پڑھا ہوا ہے۔ بلاشبہ اسے آرزویت بہترین معص ہیں۔ گمشدہ بادشاہ فرانس کے بادشاہ پر کسی کی تحریر چارخ کے ہم پیلو کا کارکردگی
 ہوئی منفرد کہانی تھی۔ فرانس کی تاریخ کے بارے میں پڑھ کر خوشگوار احساسات سے دوچار رہی۔ انوکھی چوری معاشرے کی ایک لکھی کہانی کو بے
 غلب کیا کیا جو پھر نظر میں آتی مگر خاموش قائل ہوئی ہے۔ معص نے آپ تینا کو بہت پڑھیں اس انداز میں تحریر کیا۔ خرمش بھی دعا ہے کہ اس کے
 باہر سرگزشت جلد موصول ہو جائے۔

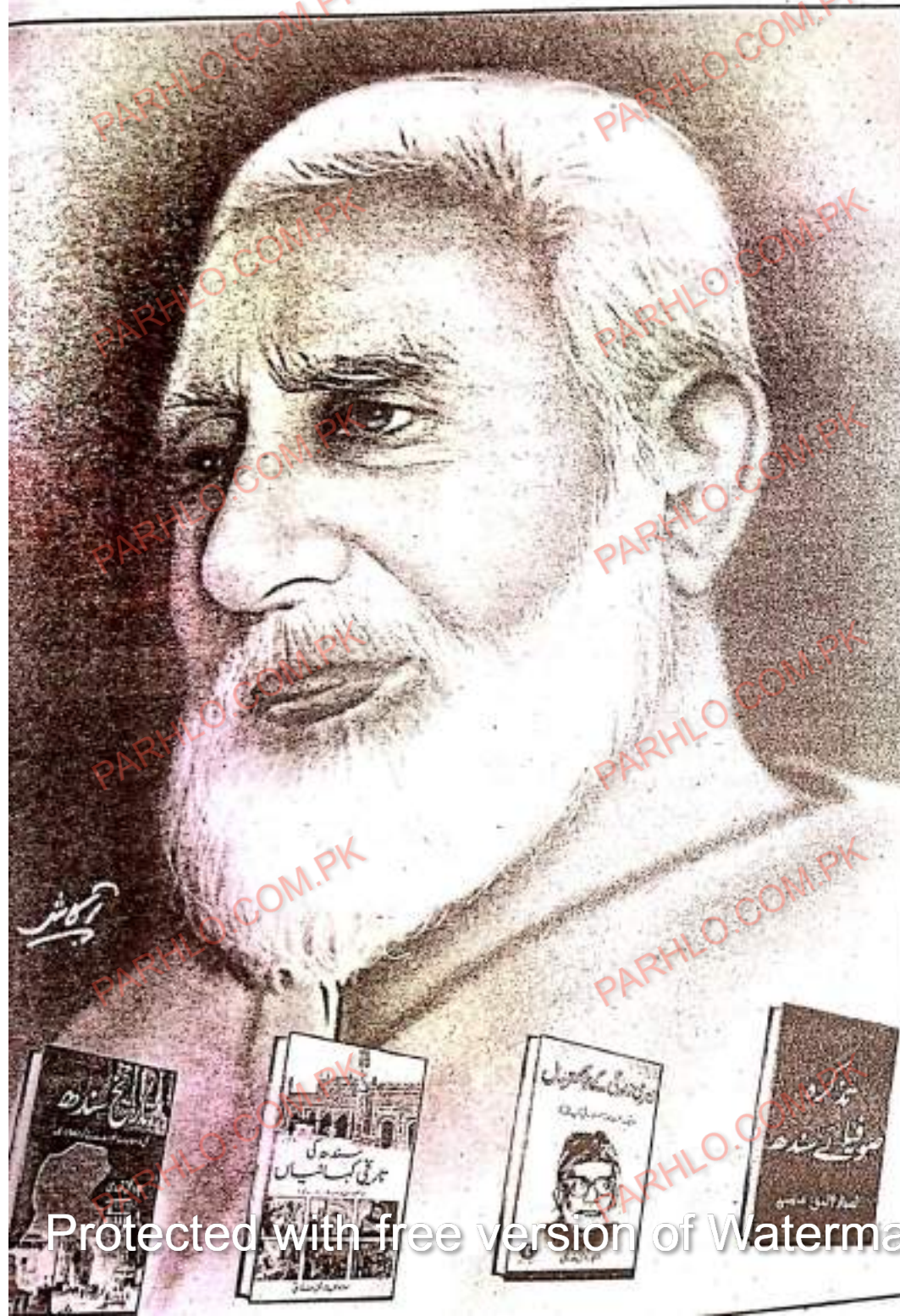
بٹو قیصر خان بھکر سے رقمراز ہیں۔ "اداریہ میں انجی کا شوق کا حیرت انگیز کارنامہ بیان کیا گیا ہے۔ وطن عزیز میں احتجاجات میں
 پورے جہر لیے والے اظہار کا کھانا کھانا اقبال کی پیدائش کا پوچھا جائے تو معلوم نہیں ہوتا ہے لیکن پہلی کام نمبر 2 کہ یہاں آسمان سے
 یہاں مسلمانوں کو کھڑے بنادو فروخت کیا جا چاہے تم کاروبار کے بارے میں ایک مسلمانوں میں کسی کی پہلی بار اس شخصیت سے تعارف ہوا ہے
 اللہ تعالیٰ فریق رحمت کرے۔ آج کل شہر خلی میں کئی حدادت ملک اعجاز حسین سٹار کے پاس بھی بہت عمدہ جہر پڑھنے کو ملے۔ انہیں تو علامہ
 عباس کے ساتھ سید امتیاز حسین بخاری، سید شاہد شاہد حسین بخاری اور عیسیٰ علی مطہر خان تھے۔ بہترین جہر کے ساتھ حاضر تھے۔ عربیہ نفس
 اردو کی ایک بہترین شاعر کا حالات زندگی پڑھنے کو ملے ہیں بہترین شاعر کا قصب بہت زیادہ تھا بہت دود کا حالات زندگی پڑھنے کو ملے
 ہیں۔ نوبل انجیل بہت عمدہ اور تاریخی سر کرنے کو ملے ہے چارہ گراستا دہائی قوم کا معیار ہوتے ہیں۔ بقلم خود پھر امام کی کہانی پڑھنے کا حیرت انگیز
 ہے۔ آج کل جب شروع کر دو خاکسار کے چھوڑنے کا دل نہیں کرتا ہے انتظار ہے اور بہت سے معصین کا چاہے ہے۔ قلم و ادب۔ ہم جہر ہے اللہ کے
 کشیدہ شام مضامین عمدہ لکھے۔ ملی اسپتال اچھی آپ تھی تھی۔ مہاجر جہر بخاری اگلی انداز کی کہانی تھی کہ ان کا نامہ سامان تھی۔"

بٹو رانا محمد شاہ پورے والا سے لکھتے ہیں۔ "نمبر کا سرگزشت چاہے نظر تھا۔ اداریہ نہایت اہم تھے پڑھا۔ اداریہ پڑھنے ہوئے
 مجھے قرآن کی آیت یاد آئی۔ جس کا مطلب ہے کہ "کیا جانے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔" اس جہانی انجیل پڑھنے سے بھی ایک
 پند ہے جو تحقیق کے بعد جہانی عوام کی بڑی پیمانی کا مل نکالا۔ سوچنے کی بات ہے کہ عوام کی سہولت اور اس کے لیے آسانیاں پیدا کرنے
 کے حوالے سے ہم افرو اور اوجا جی سا پر کیا کر رہے ہیں؟" حبیب الرحمن خان شروانی کی ایک مٹی سرگزشت اس حوالے سے واقعی حیران کن
 تھی کہ وہ دینی راست ہونے کے ساتھ ساتھ 30 کتابوں کے معص بھی تھے۔ کتابوں سے اتنی محبت تھی کہ 4 جہاز سے زائو کتابوں کا ڈالنی
 سب خانہ بنایا۔ دہائی "تھم کاروبار" تھے۔ شہر خیال میں اعجاز حسین سٹار کا پھر پڑھو۔ اچھا لکھا۔ شہر نیم دہرہ آج کل آپ فیصل آباد ہوتے
 ہیں کیونکہ پورے آپ کے نام کے ساتھ حیدر آباد لکھا دیکھا تو سوچا شاید جاب وغیرہ کے سلسلے میں ہجرت کی ہو۔ عیسیٰ علی مطہر خان صرف
 سرگزشت ہی نہیں سیلاب کی وجہ سے ڈاک کا نظام اس حد تک متاثر تھا کہ 10، 12 دن تک گراما سے کوئی ڈاک موصول نہیں ہوتی۔ جب
 فریوں کا نظام بحال ہوا تو کوئی رسالہ لکھتے گئے۔ سیلاب زدگان کن مصائب و مشکلات سے گزر رہے ہیں، شاید انھوں میں بیان نہ کیا جاسکے
 سیلاب کے حوالے سے ہماری جھوٹی دودھ چھاننا کو تو قیصر خان نے خوب لکھا ہے۔ ذرا بھلاؤں، زیادہ خاتون شروانی کی سرگزشت کے ساتھ
 موجود ہیں۔ وہ بہت کم عمری میں اردو ادب کو بہت کچھ دے گئے۔ اس حوالے سے وہ بہت قسمت رہیں کہ بہت کم عمری میں اس گروہ کو زیادہ عرصہ
 زندہ رہیں تو قیصر علامہ اقبال کا کہا بھی سچ ثابت ہو جائے کہ "وہ شہر جب میری عمر کو نہیں کی تو ان کا شمار بھروسہ ان کے چوٹی کے شعراء میں
 ہوگا۔" نور مجتبیٰ کے نکاح میں 2014ء میں دیکھا تھا۔ نکاح کی تقریب نور علی کے لان میں تھی۔ محمد فاروق طاہر کی اس تاریخی یادگار پہ
 معلوماتی تحریر بھی تھی۔ مظلوم امام کی آپ تین کا دوسرا حصہ بھی حیران کن تھا۔ دیکھتے یہ بات ہمارے لیے بھی محابہ کو معص نے ایک وقت میں دو
 دوستوں کو کیا بلایا۔ پھر صاحب کے بچے حقیقت کے بہت قریب لگے کہ "کب ہم لوگ ایک دوسرے کی تحریر میں معلوم کرتے ہیں بلکہ ایک
 دوسرے کی مالی حالت کا جائزہ لینے کے لیے جاتے ہیں۔ جس سے جتنا زیادہ فائدہ اس سے اتنی زیادہ دوستی۔ ہم سب کمرشل ہو کر رہ گئے
 ہیں۔" منہوں چانے کی اشاعت کا شکر یہ سن سنا کہ اس کے حوالے سے ذہن مہدی کی تحریر بھی دلچسپ رہی۔ ان کی مشہور نظم "زندگی سے ڈرتے
 ہو۔" تو بہت پسند ہے۔ ان کی میزب و صیت کے مطابق ان کی لاش کو نظر آگئی کیا گیا۔ یہ بات بھی حقیقت طلب ہے کہ انہوں نے عجیب وصیت
 کیوں کی تھی۔ نرسن اختر بیان کی تحریر بھی پسند آتی۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

انور حسین، بٹوار۔ فرزا خان، اسلام آباد۔ انجم اختر، حیدر آباد۔ شاہد عباسی، مظفر گڑھ۔ سکر علی، ایبٹ آباد۔ محمد رحیم، لاہور۔ احمد
 صدیقی، کوئٹہ۔ سر فراز خان، پیر پور خاص۔

معاذ اللہ سرگزشت



زخم خور وہ

زویا صفوان

حالات کا موافق نہ ہونا، زمانے کی بے ثباتی اور دوستوں کی بے مہتری آنے آ رہی تھی پھر بھی وہ ارادوں کا پکا، ادب دوستی سے پیچھے ہٹنے پر تیار نہ تھا۔ مسلسل خدمتِ ادب میں کوشاں رہا، تبھی سقوطِ حیدر آباد کا المیہ رونما ہوا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کراچی آنے پر مجبور ہو گیا۔ یہاں آکر اس نے تحقیق کا ایک نیا در کھولا اور اپنا نام اوج کا حامل بنا گیا۔

ایک مہینہ دورانی زندگی کا تس

ہے؟“ وہ توشیح سے بولیں۔
”نہیں! کہا تو کچھ نہیں۔“ اس نے انہر وکی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”بری بات ہے میرے چاند! آپ کو پتا ہے ناں کہ اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ ہمیشہ بڑوں سے جگ کہتے ہیں۔“

والدہ کی اس یاد دہانی پر اعجاز نے اثبات میں سر ہلایا اور وحشی آواز میں بولا۔ ”بچے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرے ابا کہاں ہیں؟“

”تو آپ انہیں بتا دو ناں کہ وہ اللہ پاک کے پاس چلے گئے ہیں۔“ سعیدہ خاتون نے رساں سے جواب دیا۔
”بتایا تھا، وہ پھر بھی پوچھتے ہیں کہ کون تھے؟ کیا کرتے تھے؟ تمہارے کوئی دادا دادی چچا یا بھائی بھینٹو ہوں گی۔ وہ کہاں ہیں؟ تم کبھی ان کے پاس کیوں نہیں جاتے؟“

میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں

سعیدہ خاتون نے گھر کے کام کاج سے فراغت پاتے ہی روٹی بنانے کا آغاز کر دیا۔ انہیں علم تھا کہ ان کا سات سالہ بیٹا اعجاز الحق مسجد سے نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد گھر آتا ہی ہوگا۔ وہ اس کے آنے سے قبل ہی روٹی تیار رکھنا چاہتی تھیں۔ بیٹے کا تصور ذہن میں آتے ہی وہ ماستا کے جذبات سے بے طرح مغلوب ہو گئیں۔ روٹی بناتے ہاتھ مزید متحرک ہو گئے تھے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انہیں محسن میں آہٹ محسوس ہوئی اور اعجاز الحق ان کے پاس یاد دہانی خانہ میں ہی چلا آیا۔ وہ معمول سے زیادہ سنجیدہ اور خاموش دکھائی دے رہا تھا۔

وہ خاموشی سے برآمدے میں بھی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ سعیدہ خاتون نے اس کے سامنے روٹیوں کی چٹھیری اور رساں کا پیالہ لاکر رکھ دیا۔ وہ روٹی بے دلی سے ہی کھانے لگا۔

”کہا ہوا ہے نہ؟ شہزادے کو؟ کسی نے کچھ کہا

خاموشی سے سر جھکا لیتا ہوں لیکن اس طرح کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اب مجھے چڑانے لگے ہیں۔" اعجاز کی افسردہ سی حرکت بھری ہوئی۔

سعیدہ خاتون ایک سر آدھ بھر کے رہ گئیں۔ انہیں اپنے مرحوم شوہر شاہ ظہور الحق کی بہت شدت سے یاد آتی تھی۔ انہوں نے ایک لمبی وقت کے بعد اپنے پر آواز مائش اور پوچھنا مائشی سے پردہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ سات سالہ بیٹا اب اس ذاتی حق پر غصے چکا تھا کہ حالات کا کج معنوں میں اور ان کے اسکول اور اپنی سوچ و نظریہ کے مطابق فیصلہ کر لے۔

"تمہارے والد گورنمنٹ ہائی اسکول جالندھر میں استاد تھے میرے بچے؟" وہ دیر سے سے بولیں۔

"اوہ۔۔۔ کیا واقعی؟" اعجاز پر جوش ہوا۔

"ہاں میرے چاچا بہت شاعرانہ بے مثال اور ہر طرح پر۔" وہ خیالات میں کھو گئیں۔ "تمہاری پیدائش بھی مشرقی پنجاب کے مشہور شہر جالندھر محلہ چچ پیراں میں ہوئی تھی۔ تمہاری پیدائش کا بہت انتظار تھا انہیں۔ اس سے پہلے ہماری بیوی اولاد میں پیدائش کے کچھ روز بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔ تمہارے والد اس بات پر بہت افسردہ رہا کرتے۔ گمان کی بجائے پتی سے ایک بیٹا اور بیٹی بھی موجود تھے لیکن اس کے باوجود ان کے دل سے اپنی دائمی طور پر کھوجانے والی اولاد کی غلطی بھی ختم نہیں ہوئی۔ پھر اللہ پاک کی جانب سے تمہاری آمد کی کوئی فیصلہ ہم سب خوشیاں منا رہے تھے کہ ایک روز تمہارے دروازے پر ایک درویش آ گیا۔"

"اوہ پھر..... پھر کیا ہوا؟ اس درویش نے کیا کہا؟"

وہ تجسس ہوا۔

"تمہارے والد نے اس کی جھولی بھر دی۔ فقیر نے انہیں بہت دعا مانگیں دیں اور کہنے لگا:

"سماں اللہ کی رحمت سے بھی مایوس مت ہونا۔ وہ پروردگار بہت مہربان اور بے نیاز ہے۔ اس کے ہاں کسی بھی شے کی کمی نہیں ہے۔ وہ ہمیں اپنی نعمت سے ضرور نوازے گا۔ تم جس ایک کام کرنا؟"

"جی حکم کیجیے۔" ظہور الحق نے فوراً ہی بھری۔

"اگر تمہیں بیٹا نصیب ہو تو اس کا نام چچا کوٹیک 'اودان' شاہ رکھنا۔ یہ بیٹا انشا اللہ طبیعتی طور پر پچھلے گا۔"

"اودان شاہ۔" اس نے زبردست دہرایا۔ اسے یہ نام بہت منظر دار دلچسپ محسوس ہوا تھا۔ "تو پھر میرا نام کیسے رکھا گیا؟"

اعجاز نے خاندان کے کبھی ناموس میں حق تلاوی جزو رہا ہے اس لیے تمہارا نام اعجاز الحق رکھ دیا گیا۔ اللہ جنت بخشے تمہارے والد بے حد خوش اور مسرور تھے۔ انہیں گھنٹوں اپنی گود میں اٹھائے پھرے۔ ایک سال بعد انہیں بغداد کے کسی کالج سے فوری کاروائی ملا۔ بخودا بے حد محنت کش تھی۔ انہوں نے فوراً ہی بھری۔ تمہارے دادا دادی بھی اس نئی پیشکش پر بہت خوش تھے۔ آج یاد کرنے بغیر تو گھر پر کئی خوشیوں کا وہ عالم ہی نہ اٹھتا۔ آدھ کے خبر تھی کہ یہ سر میں بہت جلد کرنا جانے والی ہیں۔ تقدیر کے اس موقع وار سے بے خبر ہم لڑھکیاں سے کرا رہی روانہ ہو گئے۔ تمہاری بہن آمنہ خاتون اور بھائی اظہار الحق بھی تمہارے ساتھ تھے۔

"کراچی تو بہت دور ہے۔ وہاں آپ کس کے پاس ٹھہرے تھے؟" اعجاز نے حسرت سے آنکھیں پھیلایا تھا۔

"ہاں اور تو ہے۔ وہاں تمہارے والد کے دو شاگردوں نے ہماری میزبانی کی۔ سب کچھ بہت شاعرانہ تھا۔ پھر ہمیں اچانک کیا ہوا۔ ان کی طبیعت یکدم بد ہو گئی۔ بیماری کی نوعیت بھی بہت عجیب و غریب تھی۔ میں نے تو اپنی زندگی میں ایسی کوئی بیماری دیکھی نہ تھی۔ تمہارے والد بالکل ہی بے رحم تھے۔ ان کے مزاج پر ناقص فہم سکوت غامض ہو چکا تھا۔ کچھ بولنے لگے ذہنی چنگ سے اٹھ پاتے۔ ان کے دونوں شاگرد اس صورت حال پر گھبرا گئے۔ انہوں نے بہت دیر تک سوچ کی۔ کراچی کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے بھی رجوع کیا۔ ان ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ وہ کافی قریح کا شکار ہوئے ہیں۔ دونوں بیماریوں نے متعلقہ علاج میں کوئی کسر اٹھانہ رہی لیکن ان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس دوران میں وہ صرف ایک ہی بار بولے تھے۔

جاڑے کی اس سرد اور افسردہ رات میں تمہیں اپنی گود میں لیے میں ان کی پٹی سے لگی بٹنی تھی۔ ایک ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے تمہیں دیکھتے رہے پھر ان کی زبان سے میرے بیٹے کے الفاظ برآمد ہوئے۔ میں اتنے دنوں بعد ان کی آواز سن کر کھل سی گئی۔ دل میں ہزاروں امیدیں جاگ اٹھیں۔ کچھ دنوں بعد میزبان میرے پاس آئے اور نہایت غلوں سے سمجھانے لگے کہ اس حالت میں بغداد کا سفر کیونکر کر سکیں گی۔ میں نے بھی سوچ بچار کے بعد لڑھکیاں دہرائیں کہ فیصلہ کر لیا۔ انہی دنوں نے تمہارے لیے ریل کی بستی پر ریزو کروائی اور ہم لڑھکیاں نہ بٹنی

"دادا دادی تو بہت پریشان ہو گئے ہوں گے؟"

اعجاز نے قیاس کیا۔

"ہاں! وہ بہت قیامت خیز تھے۔ بوڑھے ماں باپ انگلیوں میں ڈھل گئے تھے۔ انہوں نے بھی بیٹے کی بعد اور دائمی اور اپنی ملازمت کے سلسلے میں بہت خواب سنائے تھے۔ وہ بیٹے کی محنت یابی کے لیے دی طور پر دعا گو تھے لیکن کوئی دعا کام آئی نہ ہی دوا۔ تمہارے والد محض چالیس سال کی عمر میں مجھے بیٹے کی جائزہ لے رہے تھے اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب ہماری ذمہ داری تمہارے دادا نے اٹھائی۔ جو اس سال بیٹے کی موت نے ان کے اعصاب میں شکنجہ پیدا کر دی تھی۔ وہ ہم سب سے چھپ کر رو پھا کرتے تھے۔ راتوں میں اللہ کر سکیاں بھرتے تھے۔ مصائب نے اس خاندان کا دامن پکڑ لیا تھا۔ دو سال بعد تمہارے تباہی مظاہر حق بھی انتقال کر گئے۔ ان کی وفات سے گھر کا رہا سا سکون اور خوش حالی بھی رخصت ہو گئی۔ ابا کی کی کمر ٹوٹ گئی۔ انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی زندہ لاش ہیں۔ اب ان پر ہمارے علاوہ تمہارے تباہی کے خاندان کی پرورش کی ذمہ داری بھی آپڑی تھی۔ یہ مصائب ابھی کم نہ ہوئے تھے کہ ایک اور مصیبت نے دروازے پر دستک دے دی۔ ... ان دنوں لڑھکیاں میں بیٹنے کی دبا پھوٹ پڑی تھی۔ شہر میں موت کا بازار گرم ہو چکا تھا، پھر یہ دبا جانے کیسے ہمارے گھر میں چلی آئی۔ پہلے ایک رات تمہاری تائی اور پھر دادا بھی اس مرض میں مبتلا ہو کر چل بسے۔ آہ..... بہت ہی قیامت خیز لمحات تھے لیکن ہمیں کیا علم تھا کہ اصل قیامت تو ابھی ٹوٹی تھی۔ گھر بلیہ اخراجات کا بوجھ تمہارے بہنوئی مشکور الحق اور بڑے بھائی اعجاز الحق پر آن پڑا تھا۔ دونوں کی تنخواہ کل ملا کر صرف ساٹھ روپے بنتی تھی اور کھانا پندرہ افراد کی ہوتی تھی۔ اس افلاس نے خاندان میں پہلے ذاتی انتشار پیدا کیا اور پھر خود غرضی کی راہ پر چلنے کو بہت جھڑپوں تک پہنچی۔ اس ماحول میں میرا دم بٹھنے لگا تھا، میں نے تمہارے تانا کوٹھ لکھا اور ہم یہاں سب سہاراں پورے آئے۔"

سعیدہ خاتون کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اعجاز کے ہونٹوں پر بھی سکوت کی مہر لگ گئی تھی۔ چہلے اسی افسردہ بھری خاموشی میں بیت گئے پھر اعجاز نے حسرت بھرے لہجہ میں کہا۔ "میرا تانا اب ان دنوں بہت

مراسلات:

اعجاز الحق قدوسی کی تعریف کردہ کتب:-
 تذکرہ صوفیائے سندھ تذکرہ صوفیائے پنجاب
 تذکرہ صوفیائے بنگال تذکرہ صوفیائے سرحد۔
 شیخ عبدالقدوس کلکوی اور ان کی تعلیمات تزک
 جہانگیری کا اردو ترجمہ خواجہ شمس الدین عظیمی سندھ۔
 اقبال اور علامہ پاک و ہند تاریخ مغربی پاکستان
 رسول اکرم ﷺ کی صاحبزادیاں۔
 سندھ کی تاریخی کہانیاں اقبال کے محبوب
 صوفیائے کرام برصغیر پاک و ہند کے ملاح حق پرست۔
 سیر ادلیہ (مترجم) سندھ کے فاری گوشہ راہ
 مسلمان تھیں۔
 سراپائے رسول ﷺ پاک بیاباں سیرت جہول۔
 ہمارے نبی ﷺ کے صحابہ کرام و سیرت امام حسن
 عہد رسالت کے دو بیٹے۔
 درس کار و رسول ﷺ کے دو طالب علم۔

☆☆☆

اعجاز الحق کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے۔
 اعجاز الحق نے پہلی ہی ملاقات میں اپنی شائستگی و خوش گفتاری سے میرا دل موہ لیا تھا۔ ہاتھیں ایسے کرتے جیسے شہد محمول رہے ہوں۔ ٹھنڈے انساب، میٹھی ہانسی، مہذب اطوار، شائستہ انداز، خاکسارانہ وضع، عالم فاضل، حلیمہ روایت کے عین مطابق، خوش خوشی پھوڑی داڑھی بڑی چمک دار آنکھیں، کشادہ پیشانی، گٹھا ہوا جسم بھرے بھرے گال، سر پر گھنے بال، مگر حد کے اندر۔ قد چھوٹا مگر پست قدی سے بالا۔ چھوٹی مودی کا پاجاما، ٹکا بند شیر وانی، یہ ان کی ایسی کئی بندوبست تھی کہ جہاں جاتے دور سے پہچان لیے جاتے۔

☆☆☆

اعجاز الحق قدوسی فاری اور عربی پر فاضلانہ استعداد کے حامل تھے۔ "تزک جہانگیری" کا اردو میں ایسا ترجمہ کیا جو نہ صرف مستند مانا جاتا ہے بلکہ اپنے خواجہ کی وجہ سے بڑی افادیت کا حامل ہے۔ "سیر الادول" کا

ایک بار مل سکا۔
 ”اب میری زندگی اور خوشیاں صرف تم سے وابستہ ہیں میرے چاند زندگی میں خوب محنت کرنا۔ میری ہر عمری کا ازرا اب صرف تم ہی کر سکتے ہو۔“ انہوں نے بوجھل سانس لی۔
 ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ زندگی میں خوب محنت کروں گا۔“ اگلا کرنے ایک عزم سے کہا۔
 سیدہ کی نظریں ٹٹاؤں میں اپنے بے باروں کے نقوش کھو گئے تھیں۔

ہوئی حسین اعجاز کی عربی رانی مسائل کا یہی حکار رہی۔
 ”ایسا کیسے چلے گا میرے دوست؟ مجھے تو اس
 صورت حال کی بالکل سمجھ نہیں آ رہی۔ تم اپنی اچھی اردو کیسے
 بولنے لگے ہو؟“ اس نے حیرت سے استفسار کیا۔
 ”کیونکہ تم عربی میں صرف کتابوں پر زور دیتے ہو۔
 اپنی جھجک دور کرو کے جوابات بنے گا۔“
 عبداللہ کی یہ بات اس وقت اعجاز کے ذہن میں نہ
 سمائی۔ اس نے مولانا محمد امجد اللہ رام پوری سے عربی کی تعلیم
 حاصل کرنی شروع کر دی۔ چند روز بعد اس نے اپنی اہلیں
 ان کے گوش گزار کر دی۔
 ”حضرت! عبداللہ نے عربی اور میں نے ایک ساتھ ہی
 زبان کی یہ تعلیم شروع کی تھی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ
 اردو میں عربی کے کلمات بھی سمجھنے لگے ہیں جبکہ میں عربی زبان
 کے ادب میں بالکل بدحوہ ہوں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“
 ”میت سادہ سی وجہ ہے خود روزانہ وہ بے لنگان اردو
 بولتا ہے اور خیمیا یہ زبان بولنے میں جھجک محسوس ہوتی ہے۔
 بس اتنا سا فرق ہے۔ اسے دور کر لو گے تو کامیاب ہو جاؤ
 گے۔“

بیدار ہونے لگتی کر کسی طرح وہ بھی تھکاف و تالیف کی ایسی صلاحیت حاصل کر گئے۔

یہ وہ دور تھا جب اچانک کے حراج میں ایک نئی تہذیبی دروہا ہو رہی تھی۔ وہ اپنی اس تہذیب سے قدرے خائف بھی تھا۔ اس نے اپنے خاندان میں وضع قیدم ماحول کے تحت کی علمی و شرعیہ کی تعلیم حاصل کرنے کا آغاز کیا تھا۔ اس کی خاندانی روایات میں شاعری گناہ اور شعر پڑھنا جرم سمجھا جاتا تھا۔ ایک طرف دھندلاری اور روایت پسندی کا یہ عالم تھا کہ دوسری جانب جانے کب اور کس لمحہ اچانک کے حراج شعر و شاعری سے مناسبت پیدا ہو گئی تھی۔ درحقیقت یہ وہ زمانہ تھا جب داغ اور امیر کے چرے فہرے ہونے کے بعد یہ شاعری کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ مولانا حالی کا مقدمہ اور شاعری بھی منظر عام پر آچکا تھا جو اس دور میں ایک انقلاب کی نوید بننے لگا تھا۔ انہی دنوں جوش شیخ آبادی جو جوئے چھوٹے کے سب سے مقالات زیریں و غیرہ کی عت عمل میں آئی تھی، ان کی نظم و نثر کے چند مجموعے بھی ان کی نظروں سے گزرے۔ اس کا ذوق ایک نئی لذت آشنا ہونے لگا۔ یہ بہت اونٹنی کیفیات تھیں۔

بعد وہ سب طلبہ اپنے اپنے کمروں میں چلے آئے۔ اب اسے شدت سے رات کا انتظار تھا۔ دوسری جانب خلیق کا بھی کم و بیش یہی عالم تھا۔ اس نے ساقی طلبہ کے جو خواب ہوتے ہی آنکھوں سے اچھاڑ کے کمرے کی زنجیر کھٹکھٹادی۔ اس کی بغل میں ایک خوبصورت رومال میں لپیٹی ہوئی کتاب تھی جسے اس نے نہایت مضبوطی سے دبا ہوا تھا۔ اچانک پہلے ہی بے چینی سے اس کا ہتھکڑا اس نے آنکھوں سے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

”لے کر آئے ہو کیا؟“ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں تمہارا۔“ وہ غلٹ میں بولا۔

خلیق نے کتاب تپائی پرکھی اور پرجوش مسکراہٹ سے بولا۔

”یار قہ وہی اتم یقین نہیں کرو گے آج تک ہم شاعری میں صرف جھک ہی مار رہے ہیں۔ واللہ! ہمیں تو علم ہی نہیں کہ جدید شاعری کا آفتاب کونسا لوں پہلے ہی طلوع ہو چکا ہے۔ ہم تو اب تک پرانے ساغروں سے دلی بھلا تے رہے ہیں۔ میں آج سنے جام وینا کا اہتمام کر کے آیا ہوں۔“

مضطرب کر گیا۔
"کرتی تو ہے۔" وہ تذبذب ہوا۔
"تو مجھ پر کس بات کی؟ کوئی کوشش کرو۔" انہوں نے تحریک دی۔
"مجھے یہی تو اعزاز نہیں ہو رہا کہ ملازمت کے لیے کیا طریق کار اختیار کروں۔ بہر حال کوشش کر کے دیکھ لوں گا۔" اس نے لڑا۔
کچھ وقت حریف گذرا تو سعیدہ اور اعجاز کی یہ بحث ایک معمول بن گئی۔ والدہ کے بار بار اصرار پر وہ انہیں کسی نہ کسی طرح نال ہی دیتا۔ ایک روز سعیدہ خاتون کے صبر کا پیمانہ بڑھ گیا۔
"تم نے کیا حیرت اختیار کر رکھا ہے؟ روزگار کے حصول کے لیے سعیدہ کیوں نہیں ہوتے ہو؟ آخر کمر لے کر اخراجات کیسے چلیں گے؟ ہم کب تک تمہارے منہ بول پر بوجھ بن رہیں گے؟"
والدہ کی یہ بات اعجاز کے دل کو لگی۔ وہ ایک لخت شہید ہو گیا اور ان سے کہنے لگا۔ "مجھے ڈیڑھ روپہ اسے دینا۔ ملازمت کا انتظام جلد ہی ہو جائے گا۔"
سعیدہ خاتون نے چونک کر اسے دیکھا اور کچھ سوچ کر مظلوم پر اسے تھما دی۔
اعجاز فوری طور پر لڑا کہ خانا گیا اور ڈیڑھ روپے کے کارڈ خرید لایا۔ ہر کارڈ پر تیس سو روپے اسلام آباد شہروں کے نام درج کر دیے۔ معمول کا متن تقریباً یکساں تھا۔
"میں نے سنا ہے کہ آپ کے در سے کو ایک مدرس کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہے تو میری خدمات حاضر ہیں۔"
اسی شام کمرہ انہوں نے سعیدہ خاتون نے اسے ایک بار پھر گھیر لیا۔
"کیا انتظام کر کے آئے ہو بیٹا؟"
"میں نے ملازمت کا ڈول تو ڈال دیا ہے۔ آپ دعا کرتی ہیں کہ ملازمت کا کوئی دور مکمل جائے۔" وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔
"اللہ مالہ! اچھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی بہترین سہیل ہی پیدا ہوگی۔" انہوں نے غصے سے کہا۔
کچھ روز بعد اعجاز کو نین فلوٹا موصول ہوئے۔ وہ فلوٹا لیے والدہ کے پاس چلا آیا اور پینٹا خط ان کے سامنے رکھ دیا۔
"یہ پیشکش مدرس اسلام آباد کی جانب سے ہے۔ انہیں ایک مبلغ کی ضرورت ہے۔ تھوڑا مہینہ روپے ہوگی۔"
"اجمالہ اور یہ باقی رو فلوٹا؟" ان کا چہرہ مکمل اٹھا۔
"ایک خوبصورت عمارت کا ہے۔ انہیں دس روپے کے عوض ایک مہینہ کی ضرورت ہے۔ تیسری پیشکش پیر سنڈنٹ پولیس تھانہ عبدالرحمن نے کی ہے۔ وہ بچوں کو تعلیم دلوانا چاہتے ہیں۔ تھوڑا چند روپے ہوگی۔ قیام و طعام بھی وہی فراہم کریں گے۔"
"تیسری پیشکش قبول کرلو۔" سعیدہ خاتون نے ایک توقف سے جواب دیا۔
اعجاز نے سمجھ لی کہ اثبات میں سر ہلادیا۔ اسے اپنی طبیعت میں ایک بوجھل بین محسوس ہو رہا تھا۔ والدہ سے دوری کا احساس ایک السرد کی میں چٹا کرنے لگا۔ دوسری جانب سعیدہ بھی اسی کیفیت کا شکار تھیں۔ انہوں نے کسی طرح قرض کا بندوبست کر کے دو تین چوڑوں کا بندہ است کر دیا۔ اس کے علاوہ دس روپے حریف قرض لے کر کرانے کے اخراجات کے لیے تھما دیے اور ایسے 1927 میں وہ اہل سے کوئی کچھ سعیدہ خاتون است رخصت کرنے کے لیے انہیں تک آگئی اور اسے میں میں سوار کرنے کے بعد رخت سے بولیں۔ "جائے اللہ انہیں راجہ بھان ہو۔"
والدہ کی ایک آلودہ آنکھیں دیکھ کر اعجاز بھی آبدیدہ ہو گیا۔ سڑکی کوفہ، انتہوں سے ملاقاتوں کے آداب بچپن کے ساتھیوں موجود وقت اور اپنی سرزمین سے دوری کا احساس اسے ایک مارنے لگا تھا۔ وہ سڑکی کی مرکز ٹراپٹ اور پینٹا کن خیالات میں نام نہاندی گزار رہا تھا۔ صبح سات بجے تھکا ہوا اور تھکے پیر سنڈنٹ کی کوئی پکائی گئی۔
بندر میں ابتدائی طور پر کچھ ملازمت کا سامنا کرنا پڑا تاہم وقت گزرتا گیا۔ عبدالرحمن خانی سے بھی دوسرے دوسرے قدم سے بے غلغلی پیدا ہوئی تھی۔ اسے عبدالرحمن خاں اور ان کے دو بھائیوں احسان الرحمن خاں اور ذاکر لطف الرحمن خاں کے بچپن کی تعلیم کے قرائن سونے لگے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بچوں کو پڑھانے کے عوض بھرتیون کھانا آرام روزہ پائش اور ذاتی خدمت کے لیے والدہ کی ہرگز نہ سوا انہیں تھا۔ تھوڑا عرصہ سے دس روپے سعیدہ خاتون کو بھیج دیا کرتا تھا۔ شام کے اوقات عبدالرحمن خاں کے ساتھ کپ شہ میں بسر ہوتے۔ یہ محفل نصف شب تک جاری رہتا۔

راتی۔ ایسی ہی ایک محفل میں اعجاز نے بلا ارادہ کہا۔ "یہ جو وقت ہم کپ شہ میں صرف کرتے ہیں یہاں اس کا کوئی بھرتیون صرف نکالا جائے۔"
"کوئی تجویز ہے تمہارے ذہن میں؟" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔
"جی ہاں! کسی انگریزی جاسوسی ٹول کا ترجمہ کر لیتے ہیں۔ آپ اردو ترجمہ لے جاتے۔ میں نکلتا جاؤں گا۔ ٹول مکمل ہو جانے کی صورت میں ہم کسی ناشر کو دے دیں گے۔" اعجاز نے اپنا ارادہ بتایا۔
"نیک ہے! میں کوئی انگریزی ٹول تلاش کرتا ہوں۔ کل سے ہم یہی معمول اختیار کر رہے ہیں۔" عبدالرحمن نے کہا اور ایک انگریزی جاسوسی ٹول دی کاسٹ لے آئے۔
ترجمہ کا آغاز بہت بھرتیون اور سوا ارادہ میں ہوا۔ یہ کارڈ ان کی نصف کے قریب پہنچی تو ایک روز سعیدہ خاتون کا خط موصول ہوا۔ ابتدائی ملک سلیک کے بعد انہوں نے لکھا تھا۔
"سعیدہ یاد رکھیے! ایک صاحب آئے ہوئے ہیں۔ وہ سعیدہ یاد رکھیے! پاس روپے کی ملازمت دلوانے کی پیشکش کر رہے ہیں۔ اگر تم اس کے لیے تیار ہو تو بلا تخریب اہل دین آؤ۔"
والدہ کے اس خط نے اعجاز کو مکمل میں چٹا کر دیا۔ وہ بھید کی سے بھلائی ملازمت چھوڑ کر میدرا پاد مکمل ہونے پر نمودار کرنے لگا۔ ترقی کے لیے بھرتیون مواقع شادی وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ اس لیے پہلے پہل دور مد میں قیامت صرف یہ تھی کہ عبدالرحمن خاں سے کس طرح بات کی جاتی۔ کچھ روز سوچ بچار کے بعد اس نے خاں صاحب سے کہا۔
"بھئی والدہ تخریب کا خط آیا تھا۔ آپ کو بہت سی دعائیں اور سلام پہنچا رہے ہیں۔"
"ارے ماشاء اللہ! بہت شکر۔ اس اپنا ہیت کے لیے میں ان کا بہت شکریہ ادا کروں۔" وہ غصے سے بولے۔
"امید ہے ان کا حراں بھی خیر ہوگا۔"
"جی ہاں! ابھی کچھ اندر وہی رات ہی ہیں ان دونوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک سال سے یہاں سے ملاقات کے لیے بہت دن چکا ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔
"وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔" عبدالرحمن نے حیرت سے کہا۔

ڈاکٹر سہیل جانی نے ایک اور مقام پر اعجاز کی قدوی کے بارے میں لکھا۔
"مولانا نے بیٹے تو ان کے چہرے کی شکل ان کے مسکراتے ہونٹ ان کی بڑی آنکھیں آپ کو کسی احساس نہیں ہونے دیں گی کہ انہوں نے ساری عمر مفلسی میں بسر کی ہے۔ معمولی آمدنی بڑا اکبر اور کھٹے پڑنے کا پیدا کنی ذوق۔ یہ وہ شلٹ ہے جس کے خیمے میں آکر لکھنے پڑھنے والے انسان کے لیے ہمارے سفاک معاشرے میں سانس لینا بھی دھیر ہو جاتا ہے۔
لطف یہ کہ اس کام میں ضرورتی ہے نہ عزت و احترام۔ معاشرہ لکھنے پڑھنے والے کو ایک ایسا دیوانہ سمجھتا ہے جو اپنا وقت اپنی عمر اور اپنی زندگی بے کار گزار رہا ہے۔ مولانا قدوسی اگر مسکرائیں گے تو یہی اسی لکھنے کے ساتھ ٹھیکہ لگاتے تو تیس سال میں مذہب انشاء اسٹریٹ انارکلی پارا پار میں ان کی بڑی کامیابی ہوتی۔ کار میں کوئی سے نکلتے۔ بچوں کو انگلستان اور امریکا تعلیم کے لیے بھیجتے۔ معاشرے میں دولت کی وجہ سے ان کی عزت ہوتی۔ بڑی بڑی دھڑوں میں بلائے جاتے۔ اہل سیاست ان سے چہرہ لینے آتے اور اقتدار ملنے پر انہیں خطابات اور درجہ دی ہٹوں سے نوازتے۔ مولانا کی حالت یہ ہے کہ آج سے انیس سال پہلے بھی بے لاری کا شکار تھے اور آج بھی۔ چند روزہ ملاقات اور پچاس لاکھ سے زیادہ اخلاط لکھ کر کچھ ستر سال کی عمر میں ہی طرح مفلس اور تلاش معاش میں سرگرداں ہیں اور رشتہ زدہ ہاتھ سے لیاقت آباد (لا لکھیت) کے کرسیوں میں گرم اور سردیوں میں سردیوں میں بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کو کچھ کمرہ ت ہوتی ہے اور اپنے سفاک معاشرے کے خلاف اعجاز جہاد کرنے کوئی جاتا ہے۔ وہ معاشرہ جہاں اہل علم ہے عزت ہوں جہاں ادب و فن گھاس پھوس سے بھی زیادہ بے قیمت ہوں جہاں اہل ادب کے ساتھ بدسلوکی و بے اعتنائی برتی جاتی ہو جہاں انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اور اہل اقتدار منافقت کے ساتھ بے لطف تعریف کرتے ہوں وہاں علم و حکمت اور عقل و دانش سے بددعا کیسے مکمل کیسے ہیں؟ اور سرسید احمد خان، محمد علی احمد، علامہ اقبال، یسے یہ کہہ سکتے ہیں؟"

20
3 ستمبر 2022

"سو تو ہے۔ مجھے ایک ماہ کی رخصت درکار ہے تاکہ میں والدہ کی قدم بوسی کر سکوں۔" اس نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا لیکن بس وعدہ کیجیے کہ واپس ضرور آئیں گے۔" عبدالرحمن نے یقین دہانی چاہی۔

"جی ہاں! میں ایک ماہ بعد ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔" اعجاز نے سنجیدگی سے کہا اور اپنا رخصت سفر یاد دہائی۔

اعجاز نے سامان میں اپنی ضرورت کی ہر چیز رکھ لی تھی۔ عبدالرحمن کی جہاز پر وہ اور عطا علی نظروں سے اس کی یہ حرکت پیشہ وندہ نہ کی۔

"کیسے صاحب! کیا ارادے ہیں؟" انہوں نے معنی خیزی سے دریافت کیا۔

"والدہ سے ملاقات کا ہی ارادہ ہے۔" اعجاز سادگی سے بولا۔

"بہر پولیس والے ہیں میاں! ہماری نظر کچھ اور رہی ہوتی ہے آپ کے سامان یا مکتبے سے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

"ابھی ایسی کوئی بات نہیں۔ میں واپس ضرور آؤں گا۔" اعجاز نے اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

اس شفیق اور بہترین مہمان نواز شخص کی رہائش گاہ پر اودھائی لگا دیں دوڑاتا اعجاز اہلہ لوٹ آیا۔ سعید و خاتون نے بہت محبت اور مانتا بخیری کر بجوٹی سے اس کا استقبال کیا۔ کچھ دیر بعد اعجاز نے دریافت کیا۔

"اس ملازمت کے بارے میں تفصیل تو بتائیے جس کا ذکر آپ نے خط میں کیا تھا۔"

سعید و خاتون نے اسے مذکورہ عزیز سے ملوایا۔ اس شخص نے اعجاز کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "حیدر آباد کن میں ایک انجمن اسلامیہ ہے جس کے معتد عبدالرحیم میرے دوست ہیں۔ اس انجمن کو سرکاری طور پر پچاس ہزار روپے سالانہ کی امداد ملتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ وہاں ملازمت کے بالکل اہل ہیں۔"

اعجاز کو یہ پیشکش اور ملازمت کا ایسا مستحکم کافی دلچسپ محسوس ہوا اس نے کچھ دیر سوچ بچار کے بعد سعید و خاتون

چھوڑنے کا یہ سرفہرست و شمار ثابت ہوا۔ اس کے عزیز جو انہیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ان کی لاپرواہی فطرت نے سفر میں بے پناہ مسائل پیدا کیے۔ ان کے ساتھ سامان کا ایک انبار تھا۔ یہ سامان اتارنے وقت کھات ہات ہتھوڑے بھٹی جس کے قبضہ میں ان دونوں ماں بیٹے کا سامان دھیر دھیر رہا۔ حیدر آباد کے انجمن میں کوڑو پر اتارتے وقت ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا صرف ایک چوٹی سلاست تھی۔ پریشانی اور آشوب حال میں وہ کسی طرح اپنے میزبان کے گھر پہنچے اور اگلی صبح ہی ملازمت کے لیے مولوی عبدالرحیم کے پاس چل دیے۔

حیدر آباد کی کشادہ سڑکوں پر چلنے کا تجربہ بھی اعجاز کے لیے بہت اٹوکھا تھا۔ اسے اپنا وجود مرا کوڑی محسوس ہو رہا تھا۔ حیدر آباد کے بارے میں اس کا ابتدائی گمان بھی تھا کہ یہ شہر سارن پور جیسا ہوگا لیکن حقیقت بالکل متضاد تھی۔ وہ ایک کھلیات عالی شان اور خوب صورت شہر تھا۔ تہذیب و معاشرت بھی مثالی مندر سے مختلف تھی۔ چرخ شیر وانی میں لمبوس دکھائی دیتا۔ بازاروں کی جگہ دینج اور دکالوں کی سجاوٹ سے اعجاز کو یہ خطہ جنت ارضی کے مشابہ معلوم ہونے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے میزبان کی معیت میں معتد انجمن اسلامیہ مولوی عبدالرحیم کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ میزبان نے اعجاز کا تعارف کروایا اور ایک رسی انٹرویو کے بعد اسے جڑ چلنے شغل محبوب مگر میں ایک مدرس کی نوکری دے دی گئی۔ ماہانہ تنخواہ پچاس روپے تھی جس میں نصف کی ادائیگی مرکزی انجمن اور باقی نصف مقامی انجمن کے ذمے ہوتی۔ اعجاز خوش خوشی گھر آیا اور جڑ چلنے جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

جڑ چلنے محبوب مگر کا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کی آبادی تقریباً تین سے چار ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ یہاں آمد کے بعد اس نے مولوی عبدالرحیم سے ملاقات کی۔ اسے مسجد کے ایک حجرہ میں ٹھہرایا گیا جولا میری کا کام دیتا تھا۔ مولوی عبدالرحیم نے اس کی مہمان داری میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ وہ اس کے لیے دونوں وقت کا کھانا بھی خود فراہم کرتے۔ اعجاز کی ملازمت کے اوقات بعد از مغرب شروع ہو کر عشاء تک جاری رہتے تھے۔ وہ اپنے بھی امور نہایت لگن و لہجہ سے داری سے سرانجام دیتا۔ قیامت صرف یہ تھا کہ گھر کی طویل دوپہر میں کالے نہ تھیں۔ اس بیزاری کے

دیا۔ ابتدائی چند مہینے تو قدرے ہموار انداز میں بیت گئے۔ اس کے بعد یہ معمولات اسے دل برداشتہ کرنے لگے۔ وہ فطری طور پر شہری زندگی کا عادی تھا۔ وہ اپنی اپنی زندگی کی یہ سرگرمیاں حرات کے مطابق نہ تھیں۔ اس کے علاوہ کھانوں میں اگلی کالے درجہ استعمال صحت کے مسائل میں بھی اضافہ کرنے لگا۔ اگلے چھپیس روز شدید کھٹکھٹ میں پیچھے آ کر ایک رات شدید گرمی اور جس کے باعث نیند نہ آنے کے بعد اس نے عید اسی سے جی بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"آپ کی مہمان نوازی اور مہربانوں کے لیے میں بہت مشکور ہوں لیکن اب یہ ملازمت جاری رکھنا میرے بس نہیں ہے۔ مجھے حیدر آباد واپس جانے کی اجازت دیجیے اب۔"

اعجاز کی اس بات پر عبدالحق بھونچکدہ گئے اور ایک توقف کے بعد گویا ہوئے۔ "ہم سے کیا قصور ہوا ہے کہ آپ ہمیں چھوڑ رہے ہیں۔"

"ارے نہیں یعنی اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جڑ چلنے کی آپ دھو بھوسے میں آ رہی۔ دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ اس گاؤں میں میرا دل بھی نہیں لگ رہا۔" وہ صاف گویا سے بولا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی بھی! آپ وہاں میرے دھیرے داس آئی جانے کی اور ذرا وقت گزارے گا تو دل کھٹکے کے اسباب بھی پیدا ہو جائیں گے۔" انہوں نے سنجایا۔

"بہت کوشش کر کے دیکھی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس معاملہ میں بالکل ناکام ثابت ہوا ہوں۔" اعجاز نے عاجزی سے کہا۔

اس کے بعد بھی عبدالحق نے اسے سمجھانے کے لیے بہت دلائل دیے لیکن اس کا انکار قرامش تہہ دل نہ ہوا۔ چارواں چار انہوں نے اعجاز کی بات تسلیم کر لی اور چھپیس روز کے بجائے پورے مہینے کی تنخواہ بھی دے دی۔

حیدر آباد واپس کے بعد اس کے میزبان نے بہت دیکھا بیکار کر دیا۔

"میری محنت خراب ہوئی تھی اس لیے وہ نوکری چھوڑ آیا ہوں۔" اعجاز نے ان کا دل میں محسوس کر کے صاف گویا کر دیا۔

سے بھی جواب دیا۔

"مجھ سے ایک بار بات تو کر لیجئے کم از کم انجمن خیر جہاں تک میرے وعدے کا تعلق تھا میں نے اپنا وعدہ بھادیا ہے۔ ملازمت چھوڑنا آپ کا ذاتی فیصلہ ہے۔ اب میں کوئی دوسری ملازمت دلوانے کا پابند نہیں ہوں۔"

اس بات پر اعجاز کے چہرے پر کچھ گھٹکھٹ گئے۔

"میں آپ کو یہ زحمت دینے نہیں آیا۔" وہ بھی سنجیدہ ہوا۔

"خیر! جب تک آپ کو ملازمت نہ ملے میں آپ کو دونوں ماں بیٹے کے اخراجات کا دفتر لے لیتا ہوں۔"

میزبان نے بے نیازی سے کہا۔

"اس احسان کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں محترم! لیکن عمر بھر تو کوئی کسی کا دفتر نہیں اٹھا سکتا ہوں۔ اب ملازمت کی تلاش میری اپنی ذمہ داری ہے۔" اعجاز نے وقار سے جواب دیا۔

وہ رات بے حد کھنسن تھی۔ اسے اپنی زندگی قاتی بدایونی کی رہائی کی فکریہ معلوم ہو رہی تھی۔

"مجھے جی نہیں چاہیے جیل جاتی ہے سستی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے جاری ہے۔" اس کی آواز دھن دھن تھی۔

سچے میں فکری سے کہنے لگا تھا۔

اگلی صبح وہ دوبارہ انجمن اسلامیہ کے دفتر میں اور مولوی عبدالرحیم سے دوبارہ ملاقات کی۔ ابتدائی ٹیک سلیک کے بعد وہ کہنے لگے۔ "آپ تو جڑ چلے گئے تھے۔ اب کیسے آنا ہوا؟"

جوابی طور پر اعجاز نے اپنی چٹا مختصر انہیں کمر سنائی پھر بولے۔ "اگر مجھے نہیں کوئی جگہ مل جائے تو میں مشکور رہوں گا۔"

"یہاں ہمارے پاس ایسی کون سی جگہ ہے جو آپ کو دی جاسکے۔" وہ پوچھے۔

اعجاز نے اپنا اصرار جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد مولوی عبدالرحیم نے کسی خیال کے تحت کہا۔ "ایک کام ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس زیر تربیت طلبہ کا ایک کھٹا سیرت الہی کی تعلیم پڑھا دیا کریں۔ ماہانہ تنخواہ چند روپے دی جائے گی آپ کو۔"

اعجاز نے ہائی بھری اور ان کے دارالافتاء میں ایک کھٹا سیرت الہی کی تعلیم پڑھا دیا کریں۔

دیکھئے۔ بس انہیں کہتا دیکھ نہیں ہے۔“
 ”عجب حسن اتفاق ہے۔“ اعجاز نے سر دھو کر بھری۔
 پہلی بیوی کا راز بعض کی ملی اور اب یہ حضرت باگل سی
 تو اب ہیں۔“
 ”لطف امرا نصاریٰ جتنے ہوئے ہوئے۔“ اس شہر میں
 کے سند میں چاندی کا بچے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے
 دیئے سے دوسروں کو بھی رزق مل جاتا ہے۔ یہ شہر
 چاکر داروں اور نوادروں کا ہے۔ تم بھی اس بستی ہوئی کچھ میں
 ہاتھ دھو لو۔ میرے خیال میں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں
 ہے۔“
 اعجاز نے اگلے ہی روز شہر حیرت کے پورے
 ہاؤس میں کاظم پاشا کو پڑھانے کا آواز کر دیا۔ کاظم پاشا کا
 مزاج نہایت شانہ تھا۔ وہ آئے روز اسے کہتا۔ ”مشر
 صاحب آج تمہارا پڑھنے کا نکل باگل موڑ نہیں۔“
 اس سے اگلے روز کہا جاتا۔ ”ہمارا بی بھینے کو چاہتا
 ہے۔ آج بس کیلتا ہے۔“
 اعجاز اس صورت حال پر سخت مضطرب رہتا۔ اسے
 اپنا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کاظم کے قبضے میں دے دیا گیا ہے
 اعجاز نے یہ جبرائیل دوسال تک کسی نہ کسی طور برداشت کیا
 اسے یہ رشتہ استادی شاگردی سے زیادہ ایک ”مذہب نظام
 محسوس ہوتی تھی۔ ان دوسالوں میں اس کی کارکردگی
 صفات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس نے بالآخر ایک بار پھر
 ذمے داری مزید نبھانے سے معذرت کر لی۔
 ☆☆☆☆
 حیدر آباد میں قیام معاش کے حوالے سے سبھن
 تاہم یہاں اسے مختلف ہم ذوق افراد کی صحبت ضرور
 آ رہی تھی۔ نعم طباطبائی، خواجہ حسن نظامی، مولانا مناظر
 گیلانی جیسے افراد سے ملاقات ہوئی۔ شناسائی بومی پھر
 رو کر کٹھنوں میں شہر میں خیر آبادی سے خط و کتابت کا
 شروع ہوا پھر ان سب سے بڑھ کر اپنے زمانہ طالب
 سے ہی پسندیدہ ترین شاعر ”جوش ملیح آبادی“ سے ملاقات
 تکمیل تک آئی۔
 اس روز اعجاز اپنے دوست غلام حیرت بدایونی
 ساتھ کب شب میں مصروف تھا۔ حیرت بھی اعجاز کی
 سے عابانہ عقیدت سے واقف تھے۔ وہ حکیم کی
 خیال کے تحت کہنے لگے۔ ”قدوسی پارانہ نے بھی جوش
 بننے کی کوشش نہیں کی۔ تم تو ان کے اتنے عقیدت مند ہو

حق کی اس طرح ہے ہر چیز کو حق مل جائے تو آدمی میں طبع
 اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ حالت عظیم شہر ہو سکے مطلب پر ہم
 ہوئی۔ عظیم صاحب نے دسی سوالات کے بعد اسے کہا۔
 ”اگلے سے کر لے آئیے گا۔ میں بہر حال آپ کو اپنے
 بیٹے جیسے ملواتا ہوں۔“
 یہ کہہ کر انہوں نے اپنے بیٹے کو بلوایا۔ عظیم صاحب
 سترہ سالہ اس لڑکے کو دیکھ کر شہرہ درو گیا۔ اس نے پہلی
 نظر میں ہی عظیم صاحب کی طرح نہیں ہونے دیا۔
 ہے تاہم اس نے اپنے منظر ابھی تک پر غماز نہیں ہونے دیا۔
 تعلیم کا آغاز اگلے روز سے ہی ہو گیا۔ تیسرے
 روز اچانک عظیم صاحب سے عاجز ہو کر کہا۔ ”تعلیم اس
 بچے کو نہ دیا جائے۔ بس لا روٹ نہیں ہے۔ اگر تیسرے
 مرحوم والدہ کی قبر سے گل کر آ جائیں تو جب بھی اس بچے کو
 میں چڑھائی۔ چڑھا جائے گا۔ آپ اپنا روٹ اور میرا روٹ
 مٹانے دیجئے۔“
 اچانک اس بات پر عظیم صاحب نے ہلکا سا ہتھ پڑا دیا
 اور وہ اسے کہنے لگے۔ ”میں ایک طبیب ہوں یہاں اچھے
 اچھے طریقے علم سے کہ کوئی سنا ہے کہ عظیم صاحب سے
 اور کوئی نہیں۔ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ آپ کی صحبت
 میں بیٹھ کر کثرت و برکت کے آداب سیکھے۔“
 عظیم صاحب کی یہ بات ذہن میں رستے دو اسی
 نوعیت سے چل کر چلے گئے۔ یہ سلسلہ اگلے دو بڑے سال
 تک جاری رہا لیکن عظیم صاحب نے اس وقت سے آگے نہیں بڑھ
 سکا۔ اپنے عزیز کے بوجھ سے مطلب ہو کر اچانک بالآخر
 عظیم صاحب سے مصدقہ کر لی۔
 اس کے بعد اچانک اپنے خال خال احمد انصاری
 سے رابطہ کیا جو حیدر آباد کے گرامر اسکول میں ملازم تھے۔
 اس اسکول میں جاگیرداروں اور لوگوں کے لڑکے زیر تعلیم
 تھے۔ انصاری صاحب ٹیوشن حاصل کرنے کے معاملہ میں
 خاصے خوش تھے۔ اچانک فرمائش کے چند روز بعد وہ
 اسکول سے واپس آئے کہنے لگے۔
 ”میں نے تمہارے لیے ایک ٹیوشن اور صفی نکالا ہے
 یہاں اگلے سے تم سب سے بڑے لڑکے کو ملاں جانا اور
 ٹیوشن سے ہزار ماہ لینا۔ دو نو اب ہرام الدلہ کے بچے
 نو اب کاظم پاشا کا ٹیوشن ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ کاظم
 پاشا کی آمد ہر ایک دو چہ دار مان کے جلوس ضرور ہو
 گا۔ اگر نہیں تو وہاں جہ کہل جائے گا۔“
 عظیم صاحب نے اس بات پر ہلکا سا ہتھ پڑا دیا۔

”میں یاد رہی جس جہت ہی نہیں ہو پائی۔“ وہ جیسے پتہ نہ لگا سکا۔

”اماں چھوڑ دو بھئی! چلو آج میں تمہیں ان سے ملواتا ہوں۔“ حیرت جہاں پونی نے جوش سے کہا اور اس کے تذبذب کے باوجود اپنے ساتھ لے گیا۔

جوش تلخ آبادی سے ملاقات اجازت کے لیے یادگار بت ہوئی۔ جوش اپنے اس ”دیریدہ عاشق“ کی قابلیت اور ذوق سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے انہی کی فرمائش پر اپنی ایک نظم کے اشعار بنا کر اس پر ملاحظہ دیے۔

اس کے بعد جوش نے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دیر سے دیر سے بے تکلفی پر وہ ان پر ہنسنے لگی۔ مگر غور اور مشرب و مسلک کے اختلاف کے باوجود ان دونوں میں ذوق شعری و نقد مشترک تھی جس کی بدولت یہ تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہو رہا تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ ہر دوسرے سے دیر سے روز رات کو اجازت کے یہاں آتے اور بے تکلفی سے کہنے لگتے۔

”حیرت کہاں ہے؟ جاؤ اسے ملا کر لاؤ۔ لطف ساری کو لاؤ۔ میرا بن مل کو لاؤ۔ جاؤ! ان سب کو بلا کر۔“ میں آج شام کے موڈ میں ہوں۔“

اجازت فرمائش پر بھی کواٹھکا کر لیتا۔ جوش تلخ آبادی پر اپنی کس کس کھول کر مختلف پٹریاں برآمد کرتے اور ان کی خزانہ کے تحت ایسی فن گرج سے اپنا کلام بھرتے کہ مردے بھی قبر سے نکل آتے۔ ایک حسین چاندنی ت ایسی ہی محفل اپنے جو بن رہی۔ جوش نہایت گلن سے شاعری کا چادو چگاتے سامعین کو مسحور کر رکھتے تھے۔ اس گانے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جوش کی ان تمام نظموں کا مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جاسکتا ہے۔

وہ رات اسی خیال کی جریات طے کرنے میں بیت نماز فجر کے بعد وہ پہلی فرصت میں ”حکیم آزاد انساری“ پاس گیا اور اپنا یہ خیال ان کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ بھی خوب سے بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔

”اگر تم نے یہ کام کر لیا تو جوش کی تاریخ میں تمہارا نام دو جائے گا مگر قہاح صرف یہ ہے کہ کتاب کی ت کے لیے رقم کا بندوبست کیسے کرو گے؟“

”قبل! صرف آپ کے صادر کرنے کی دیر ہے۔“

ت کے بارے میں ذہن سازی کر چکا ہوں۔ گذشتہ جوں سے میں نے اپنی خواہ سے کچھ رقم جس انداز کی

ماہنامہ ”مگر“

ہے۔ میرے پاس اس وقت سو روپے موجود ہیں۔ میں اس تمام رقم سے یہ ہادی کھینے کے لیے تیار ہوں۔" وہ ایک مزم سے بولا۔

"فیک ہے میاں اس کام کو کروالو۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔"

حکیم صاحب کی اس تحریک پر وہ سیدھا جوش صاحب کے پاس چلا آیا۔

"آج صبح صبح کیسے محسوس؟" انہوں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"آپ کے دور پر سوالی بن کر آیا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے سوال کو رد نہیں فرما میں گے۔" اعجاز نے التجا کی۔

"کچھ کہو گے تو ہی علم ہو گا ناں۔"

"آپ صرف آج رات کے لیے مجھے اپنی تمام بیاضیں دے دیجیے۔"

"کیا کرو گے ان کا؟" وہ چونکے۔

"میں ان سے اپنی مطلوبہ چیزیں نقل کرنا چاہتا ہوں۔ کل صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی ان بیاضوں کے ساتھ آپ کے سامنے موجود ہوں گا۔" اس نے عاجزی سے کہا۔

"بہت مشکل مطالبہ کر رہا ہوئی۔ یہ بیاضیں میری عمر بھر کا سرمایہ ہیں۔ اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں بھی ہادی نہ جبرتا لیکن تمہیں انکار نہیں کر سکتا میں۔ وہ اچھی نہیں سامنے رکھا ہے۔ اٹھاؤ اور لے جاؤ لیکن خدا کے لیے میرے اس سرمایہ کی حفاظت کرنا۔"

جوش شیخ آبادی کو یقین دہانی کروانے کے بعد وہ ٹیپنی کیس لیے گھر چلا آیا اور رات کے متعلق حتی المقدور نظائیں رہا عیاں اور تعلقات ایک مخصوص ترتیب میں نقل کر لیں۔ اس صبح شدہ مواد کے ساتھ عنوانات تبدیل کر کے اپنے موضوع کے مطابق ڈھالا اور ایک چھوٹا سا مقدمہ لکھ کر مجوسے کا نام شاعری کی رائیں رکھ دیا۔ اس کتاب نے ہندوستان بھر میں دھوم مچادی۔ فروخت ہاتھوں ہاتھ ہوئی۔ اعجاز کو اس کتاب سے ایک ہزار روپے وصول ہوا۔ وہ بڑے مذہب سے چھ سو روپے لیے جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور قدرے خائف ہو کر ان سے کہنے لگا۔

"بندہ پرور! آپ کے لگائے ہوئے درخت میں کچھ م آئے ہیں۔ ان کے پھل لایا ہوں۔ آپ انہیں قبول

سہری یادوں کا سفر

یادیں سدا انسان کے ساتھ رہتی ہیں چاہے وہ خوش گوار ہوں یا

ناخوش گوار۔ کبھی یہ دل میں کک چگاتی ہیں تو کبھی امید کی کرنیں

پھیلاتی ہیں۔ ایسی ہی خوب صورت باتوں اور حسین یادوں کا

ایک سفر آج سے قلم سب سے آٹھ سال پہلے

سفر کے ہر فرد کے لئے

پاکیزہ

کی صورت شروع ہوا۔ پاپو ادب کی دنیا میں ایک قدیل روشن ہوئی جو دست بدست چلتی نکھرے اور معطر
اجالوں کی بیاہر بنی۔ بقول حبیب جالب

اسے بچھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چلے ہیں لبو سے جو ہم چراغِ سحر

الحمد لله انتم اهلنا نحن اهلہ کے دو دے گزر رہے ہیں

انکس سہری یادوں میں آپ کا بھی رو پھیلا اور سنہرا خوب صورت سا حصہ کتنا ہے؟
ہمیں بھی بتائیں۔ سب سلسلہ آپ جیسے باذوق و تارکین ہی کے لیے تو ہے۔

1..... ماہنامہ پاکیزہ سے پہلا تعارف.....؟

2..... پاکیزہ تحریروں سے کوئی تین ایسی باتیں کیا سیکھیں جو آج بھی زندگی کا حصہ ہیں.....؟

3..... سینئر یا دور حاضر کے پسندیدہ قلم کار کہ جن کی تحریریں پڑھنے کو آج بھی بے چین رہتی ہیں.....؟

4..... کوئی فراموشی سلسلہ ہے تو ضرور بتائیں۔

میں چربی و زریلی کی جینی خورشیدہ خاتون سے ہوگئی۔ اجاز
نے آواز میں ہی شریک جیات کو دم دار یوں اور قہقہوں

سے آگاہ کر دیا۔

”ایک اچھی بیوی کی کیا علامت ہوتی ہے تمہارے

نزدیک؟“ اس نے کھٹکھٹا آواز کیا۔

”وہ مگر میں خوشی کی طرح مہکا کرے اور مگر کی رونق

بھی رہے۔ اپنی تدبیر منزل میں مصروف رہ کر کام کاج میں کی

دیا کرے۔“ خورشیدہ نے اپنی سوچ جان کی۔

”اگر آپ مختصر و مفید وضع داری اور شرافت کا پیکر ہے۔“

اس نے اہلکوتہ کیا۔

”آپ مجھے بھی انہی خوبیوں سے مزین پائیں

گے۔“ وہ میرے بولی۔

”میری والدہ سے زیادہ اہم کچھ بھی نہیں ہے میرے

لیے۔“ اجاز نے اسے ایک اور حقیقت سے آگاہ کیا۔

”بالکل! ہونا بھی نہیں چاہیے۔ میں انہیں یا آپ

کو بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ اس نے یقین دلا دیا۔

”معاذی حالت ادب کے کھٹکھٹا کر بھی ہو سکتے ہیں۔“

”اس میں انسان کا کیا مل دخل؟ یہ تو قدرت کی رضا

ہوتی ہے۔“ وہ حائن سے بولی۔

”ابھی تو ایسے ہی کہہ رہی ہو، بعد میں کھوے

کھانوں کا ذکر کرنا کرنا تو نہیں لگاؤ گی؟“

اجاز نے ایک ممکنہ حقیقت بیان کی۔

”جی نہیں! جو پہنا نہیں گے مہین لوں گی۔ جو کھلائیں

گی کھالوں گی۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”میں اپنی پوری خواہ نور آدی والدہ کے ہاتھ میں

رکھا کرتا ہوں۔“ اجاز نے اس کے لیے ایک اور سد بندی

واضح کی۔

”یہ انہی کا حق بنتا ہے۔ والدین سے بڑھ کر کسی کا

کوئی حق نہیں ہوا کرتا۔“

”میں جنہیں پانچ روپے جیب خرچ دیا کروں گا۔“

اجاز نے کہا۔

”نہیں بھی دیں گے تو کیا فرق پڑتا ہے؟“ خورشیدہ

نے غلوس سے جواب دیا۔ ”میرا مانا و نفقہ آپ کی ذمہ

داری ہے اور مجھے علم ہے کہ آپ مجھے بھوکا بھی نہیں ماریں

گے۔“

اجاز قدرے مطمئن ہو گیا۔ اس کی زبان شناس

نظریں بھانپ گئی تھیں کہ والدہ نے اس کے لیے چھپا ایک

کر لیں تو میری بہت عزت افزائی ہوگی۔“

اجاز نے اٹا کہہ کر چھ سو روپے پیش کر دیے۔ رقم

دیکھتے ہی وہ شدید برہم ہو گئے۔ ان کی برہمی دیکھ کر اجاز کو

ایسا محسوس ہوا گویا پتھر دل کے اچھے نے ماہیں دھجھلی ہو۔

وہ اسی پیش میں کہنے لگے۔

”قدرت ہی اچھے تم سے ہے۔ توقع نہیں تھی کہ تم مجھے اس

قدرت میں شرمناک فعل ہے۔ دوسری جانب میں تمہاری

نہایت شرمناک فعل ہے۔ بہت عرصہ سے تمہاری مدد

کر رہا ہوں۔ تمہاری مدد کا ایک موقع فراہم کیا ہے تو میں

قدرت نے مجھے تمہاری مدد کا ایک موقع فراہم کیا ہے تو میں

اس سے کہے چوک سکتا ہوں؟ جاؤا یہ روپے لے جاؤ۔“

اسے میری جانب سے میری کوتاہیوں کا تاوان سمجھ لو۔“

جوش صاحب کے اظہارِ ناراضگی پر اجاز نے خاموشی

میں ہی غایت سمجھی اور وہاں سے چلا آیا۔ جوش خج آبادی

کے بعد قاتی برائیوں سے بھی اس کے اچھے مراسم استوار ہو

گئے۔

شاعری کی راتیں کی بے مثال کامیابی کے بعد حیدر

خاتون نے اس پر ایک دراجتی دھاؤا لے کا آواز کر دیا۔

”میرے مگر کتنی کب تک دور کرو گے آخر؟“

”خجانی! کا کیا جواز ہے مجھی؟ اگر آپ کا دل چاہے تو

میرے میں کسی کے گھر چلی جا کر رہیں۔“ وہ ان کا اشارہ

بجائے کے ہاؤس روپے نیازی سے کہنے لگا۔

”میرے ساتھ یہ اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ میں جو کہ رہی ہوں اس پر تنیدگی سے غور کرو۔“

انہوں نے نئی سے ٹوکا۔

اجاز کچھ لوگوں کے لیے خاموش ہوا پھر سر جھکا کر بولا:

”مجھے یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں لیکن مجھ بھی کوئی ایسی

لڑکی تلاش مت کیجئے گا جو میرے ذوق اور شوق کے آؤے

آیا کرے۔“

”مجھے علم ہے کہ میرے چاند کے لیے کسی شریک

حیات کی ضرورت ہے۔ مگر نہ کروا میں بہترین عید تلاش

کروں گی۔“ انہوں نے یقین دلا دیا۔

1930ء میں اس کی شادی تھیالی قصبہ ایہد

ماہنامہ پاکیزہ

مجید ہی منتخب کیا ہے۔
خوشیہ خاتون نے اعجاز کے لیے شادی شدہ زندگی
سکون و راحت کا گہوارہ بنادی۔ ان دنوں ملازمت بھی ہے
بہ ہمدردی اور ہوشیاری۔ اس کی رہائش سلسلہ ملازمت و سکون کے
موسم و رنگ میں تھی۔ ایک سال بعد بیٹے کی پیدائش نے
اعجاز کو خوشی سے نہال کر دیا۔ اس نے بیٹے کا نام "موسم" رکھا۔
قدوسی رکھا۔ اس کے بعد "محمد احمد قدوسی" اور "احسان الحق
قدوسی" جیسے دیگر بچے، "فرحت" جیسے "نقرا جہاں" اور
قدوسی، "ہشیم اختر قدوسی" نے اسے خانگی ذمہ داریوں میں
"شہرت" جہاں کی پیدائش نے اسے خانگی ذمہ داریوں میں
مصروف کر دیا۔ وہ اپنا ہر فرض عمل خلوص اور لگن سے نبھا رہا
تھا۔

☆ ☆ ☆
دن کی ملی جمل میں ہم ذوق افراد کے ساتھ ادبی
مشتوں کا حصہ بننے والے اعجاز الحق قدوسی کے قلم میں بھی
ایک تحریک پیدا ہونے لگی تھی۔ اسی تحریک اور اپنی ادبی
تتمائوں سے مطلوب ہو کر اعجاز نے "مسلمان بیباں" کے
مقالات سے ایک شاعرانہ تصنیف تخلیق کی۔ اس کتاب نے
ادبی علم اور عوام الناس میں جھلک بجا دیا۔ دارالترجمہ سرکار عالی
کے باہم مولوی حمایت اللہ نے اپنی رائے دیتے ہوئے
لکھا۔

"میں نے مولوی اعجاز الحق قدوسی کی کتاب "مسلمان
بیباں" کے چند اوراق پڑھے۔ میری رائے میں یہ کتاب
مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کے حق میں نہایت مفید اور
اعتنا کا جہت ہوگی۔ میں نے مولوی صاحب ممدوح کا
مسودہ اپنے خاندان کی ایک بی بی کو پڑھنے کو دیا تھا۔ ان بی
بی کی رائے بھی یہی ہے کہ یہ ازاول تا آخر نہایت سودمند
باتوں سے ہماری ہے اور ایسی کتابوں کی لڑکیوں کو تعلیم و
تربیت اور مذہب کی ضروری باتوں سے آگاہ کرنے کے
لیے بہت ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ دارالترجمہ جس
اچھی غرض سے لکھی گئی ہے وہ پوری ہوگی۔"

جوش ملیح آبادی بھی اس موقع پر کیے بیچے رو سکتے
تھے۔ انہوں نے لکھا۔ "کتاب "مسلمان بیباں" مؤلفہ
ادیبہ فاضلہ مولوی اعجاز الحق صاحب جس شریفانہ قلم کے
محتوے ہماری گئی ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے بچیوں کے نصاب
میں داخل کیا جائے۔ یہ کتاب ہماری بچیوں کی دماغی اور
ذاتی تربیت میں بہت مفید ثابت ہوگی اور ان کے رویہ و ادب
ایسا نشانی بلند معیار پیش کرے گی جس پر عمل کر کے عورت

کمر کی ذہنیت اور سوسائٹی کی برکت بن سکتی ہے۔"
اس کتاب کی کامیابی نے اعجاز الحق قدوسی کو نیا
ادب میں ایک مستر شایعہ عطا کر دی تھی۔ ادبی قدرتی کافی
بلند ہو گیا۔ اس کامیابی نے اسے تحریک کر دیا کہ وہ
اس عرصہ بعد ہمارے قلمی حلقے کے ساتھ جڑیں کی۔ اس کاوش
نے بھی عوام و خواص کے دلوں میں گھر کر لیا۔ سید سلیمان
مدنی کی رائے نے اسے شہرت کی ایک نئی جہت عطا کر
دی۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"مسلمان بچوں کو اپنے بزرگوں کے قصے سناتا اور
خصوصاً ان لوگوں کے جو کہنے کے مجھے اور اسلام کی بچی
تصویریں تھے انہیں بچہ کرام رضی اللہ عنہم۔ یہ صحیح اسلامی
تربیت کی بہترین کوشش ہے۔ دارالمصنفین نے اسی خیال کو
پیش نظر رکھ کر اسوہ صحابہ کی دو جلدیں اور سیرۃ الصحابہ کا
خلوص سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس رسالہ کے مصنف نے
بچوں کے مناسب حال تعلیمات و واقعات کو خوبی و عمدگی
کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ اپنی غرض
حاصل کرنے کا اور اپنے پڑھنے والوں میں ان بزرگوں کی
بیرونی کا صحیح جذبہ پیدا کرے گا۔"

☆ ☆ ☆
ان کامیابیوں کے ساتھ اعجاز الحق کے حلقہ احباب
میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ احباب علمی افق کے درخشندہ
ستارے تھے۔ مولانا ہار القادری صدیق جاسی علی اختر
حیدر آبادی، نواب دین یار جنگ، سید ابوالخیر مودودی، مولانا
سید ابوالفتح محمد زفر فتح اللہ، جنگ، نواب بہادر
جنگ، حکیم محمد احمد اور ان سب سے بڑھ کر علامہ حمزہ
بدایونی سے بے مثال تعلقات استوار تھے۔ مؤرخ الذکر
تعلقات اس قدر تیزی سے پروان چڑھے کہ وہ محبت
انہیں "چون ساقی" کہنے لگے۔ دونوں کی رہائش گاہ
قریب تر تھی۔ ششاسانی کے مختصر عرصہ میں ہی باہمی
"بھائی" کا عالم تھا کہ:

"ہم میں تم اور تم میں ہم گم ہو گئے
ہوتے ہوئے ایک ہم گم ہو گئے"
اعجاز کا برسوں تک یہی معمول رہا کہ وہ بعد از سفر
حجرت بدایونی کے گھر چلے جایا کرتے اور سیاست سے
کرمشاعروں تک دونوں میں خوب گپ شپ ہوا کرتا
حیدر آبادی میں قیام بلاشبہ اعجاز کی زندگی کا بہترین
سنہری دور تھا۔ وہ ذاتی طور پر اس شہر کو عروس البلاد

کرتے تھے۔ اس شہر نے اعجاز کے ذاتی کو ایک نئی جہت عطا
کرتے ہوئے انہیں شہر کوئی کامیاب عطا کیا۔ انہیں زندگی
کے نئے مفہوم سے آشنائی ہوئی۔
حیدر آباد میں نو لڑکیاں اور چار گھروں کی محفلوں میں
شرکت اعجاز کا پسندیدہ مشغلہ رہا۔ یہ امراء و نواب عہد مظہر
کی یاد دلاتے تھے۔ علوم و فنون کی سرپرستیوں نے
ہندوستان کے لگاتار روزگار و باکمال افراد یہاں جمع کر
رکھے تھے۔ فن و کمال اور شعروادب کے آفتاب اسی شہر
میں جھلکے کرتے۔ شائستگی اور جذبہ ان محفلوں کا طرہ
اعتیاد ہوتی تھی۔ یہ نواب اور جاگیردار بھی علم و حکمت سے
آراستہ شہر و محفل سے ہی راستہ "عقوف" کی چاشنی سے بھی آشنا
ہوتے تھے۔ ان کی محفلیں مشرقی تہذیب اور روایات کا
موسم ہوتی تھیں۔ لطیفہ بذر، گنجیاں، چرخ، "عقوف" شعرو
ادب اور موسیقی سے روایتوں کا ایک الگ ہی ساں ہوا کرتا۔
امراء اور نواب بھی ہمیشہ اپنے ہم نشینوں اور ندیموں
کی عزت و خودداری کا پاس رکھتے تھے۔ اہل افراد کی اس
طرح مدد کرتے کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوتی۔ اعجاز
الحق بھی ایک مقامی امیر کی محفل سے وابستہ ہو گئے۔ وہ امیر
ہر دات آٹھ بجے اعجاز کو اپنے اپنی موٹر بھیج دیا کرتا۔ ٹوبے
کھانا کھایا جاتا اور پھر رات پارہ بیٹے تک محفل چلی جاتی۔
محفل پر نہایت ہونے کے بعد بھی شہر کا مہیز بان کی موٹر پر
یہ گھر جاتے تھے۔

حیدر آباد میں قیام کا ہر گزرتا دن اعجاز کو ایک ہی بات
یاد کروا رہا تھا کہ دن کے لیے نوائین اور امراء و نواب کے راجا
تھے۔ ان کی محفلیں رات کو رونق پاتا کرتیں اور دن سو
کر گزرتے۔ مہاراجا سرکشن پر شاہ نواب ولی الدولہ بہادر
نواب دوست محمد خان کا گیارہواں نواب عبدالباسط خاں
سویہ دار و درگاہ کی محفلیں شہر بھر میں مشہور تھیں۔ ایک رات
اب صاحب کی نظر اعجاز کی شیردانی کے مشت حال کار پر پڑ
ئی۔ وہ اعجاز کو رخصت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"کل گیارہ بجے ذرا فرمت نکال کیجیے گا۔ میں آپ کو
ایک ذاتی کام کے لیے کہیں لے جانا چاہتا ہوں۔"
"نہ نصیب! کیوں نہیں۔" اعجاز نے خلوص سے
"شکر! میں آپ کے لیے موٹر بھجوا دوں گا۔"
"کل گیارہ بجے ذرا فرمت نکال کیجیے گا۔ میں آپ کو
ایک ذاتی کام کے لیے کہیں لے جانا چاہتا ہوں۔"

نواب صاحب کی ڈیوڑھی تک پہنچے تو خود بھی گاڑی پر سوار
ہو گئے۔
"غائب میر حسن کی دکان پر چلو۔" انہوں نے ڈرائیور
کو حکم دیا۔
اعجاز میر حسن سے واقف تھے۔ وہ حیدر آباد کے امراء
اور نوائین کا مخصوص دکاندار تھا۔ اس کی دکان مختلف النوعیت
کے اسباب سے ہماری رہتی تھی اور وہ ہمیشہ منہ مائی قیمت
وصول کیا کرتا تھا۔ نواب صاحب نے اس کی دکان میں
داخل ہوئے ہی اپنے لیے شیردانی کے کپڑے کی فرمائش کر
دی۔ اعجاز الحق خاموشی سے مختلف اطراف کا جائزہ لیتے
رہے۔

نواب صاحب کی ڈیوڑھی تک پہنچے تو خود بھی گاڑی پر سوار
ہو گئے۔
"غائب میر حسن کی دکان پر چلو۔" انہوں نے ڈرائیور
کو حکم دیا۔
اعجاز میر حسن سے واقف تھے۔ وہ حیدر آباد کے امراء
اور نوائین کا مخصوص دکاندار تھا۔ اس کی دکان مختلف النوعیت
کے اسباب سے ہماری رہتی تھی اور وہ ہمیشہ منہ مائی قیمت
وصول کیا کرتا تھا۔ نواب صاحب نے اس کی دکان میں
داخل ہوئے ہی اپنے لیے شیردانی کے کپڑے کی فرمائش کر
دی۔ اعجاز الحق خاموشی سے مختلف اطراف کا جائزہ لیتے
رہے۔

"یہ کپڑا کیسا ہے بھئی؟ ذرا مشورہ تو دیجیے۔" نواب
صاحب نے ان سے استفسار کیا۔
"اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔" اعجاز نے کپڑے کی
ساخت اور رنگ جانچتے ہوئے جواب دیا۔
"اور یہ؟" انہوں نے اگلے کی بابت پوچھا۔ "یہ کیسا
ہے بھلا؟"

"آپ پر خوب ہے گا۔" اعجاز نے بے ساختہ کہا۔
کچھ دیر بعد نواب صاحب نے چالیس روپے کی گز
"نو۔" کپڑا خرید لیا اور نہایت سادگی سے اعجاز کو تھاپ کر
کے کہنے لگے۔

"میرے دل میں پونجی ابھی ایک خواہش نے جنم لیا
ہے کہ اس کپڑے کی شیردانی آپ بھی بنا سکیں۔"
"اس کرم فرمائی کے لیے آپ کا بہت شکر یہ نواب
صاحب! لیکن یہ شیردانی مجھے زیب نہیں دے گی۔" اعجاز
بڑبڑائے۔

"یہ آپ بھلا کیسے کہہ سکتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ یہ
کپڑا جیسے بنا ہی آپ کے لیے ہے۔" وہ معہ ہونے اور
اعجاز کے لیے شیردانی کا وہ کپڑا خرید لیا۔

اعجاز مررت و لحاظ میں خاموشی تو ہو گئے تاہم ذہن
میں ایک ہی کھلبلی چلی تھی۔

"کپڑا اتنا شاندار ہے۔ شیردانی کی سلائی بھی اسی
قسم کی ہونی چاہیے۔ لیکن جب میں یہ کہاں؟"
یہ سوچیں ابھی دماغ میں اوٹم چھائی رہی تھیں کہ
نواب صاحب کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔
"سکندر آباد عبداللہ ٹیٹر ماسٹر کے پاس چلو۔" انہوں
نے ڈرائیور کو حکم دیا۔



جاسوسی

موسم سہ ماہی گیلیلی

دسمبر 2022ء کے جاسوسی

کی اختتامی بریلیں

عشق ناتمام

زندگی تھی ہی کھن کیوں نہ ہو۔ جن سے چاہت کا تعلق ہو۔ وہ بھی فراموش نہیں کیے جاتے

احمد سلیم سلیمی کی مختصر داستان عشق

شعلہ زن

بے بسی کے اندھروں میں ڈوقی ٹوکی کی دردناک داستان حیات

روبینہ رشید کے قلم کی جاودہ گری

ذہن

دنیا جھوڑ کرتی ہے کہ ان پر قہرین کرکٹ چڑو۔ ایک ایسے ہی فوجان کی کوچہ گردی۔ زندگی اس کے لیے غالی نگاہ کے ماتحتی۔ حسام بیٹ کے قلم سے نئی سلسلے اور کہانی

سرواق کے آگے

پہلارنگ

محبت میں بے بقدر ہے بے وفائی میں ایک وحشی کے قاتلانہ جال۔ عبدالرب بھٹی کے قلم کا کمال

دوسرا رنگ

شکست ذات میں شام کو زندگی کروڑوں والے کردار کا حیرت انگیز احوال۔ عنایت چوہدری کے قلم کی نثر زنی

جنتی ننگہ جنتی

آپ کے تبصرے... مشورے... جنتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کتنا نہیں

افسردگی کی جھلکی۔ آپ کی طبیعت کی برسات اور جی افسردہ ہے۔ یہ گریز اسی افسردگی کا نتیجہ ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ ہم عالم سرگ مغاہات۔ صدر الہام مذہبی نے پروانہ جاری کیا ہے کہ آپ نور الدین صاحب کو یکاڑا ڈھوکا کا چارج دے دیں۔

”بھئی! انہوں نے حضرت کا کیا اور نور الدین کو چارج دینے کی تیاریاں کرنے گئے۔ نور الدین نے ہر ایک دستاویز کو جانچ اور سمجھ کر ہی اپنا عہدہ سنبھالا۔ اس دوران ایک ہفتہ بیت کیا۔ خورشیدہ خاتون معاش کے سلسلہ کا ایک در بندہ ہونے سے کافی تشویش زدہ تھیں۔

”پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ تو کل کرنا سکھو۔ اللہ نے اگر ایک لادینہ کیا ہے تو کوئی اور کھول دے گا۔ یہ تو نظام زندگی ہے۔“

”میں اس بات پر پریشان ہوں نہ ہی توکل کی دولت سے محروم۔ مجھے یہ معاملات مزید غراہوں کی طرف اٹک ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ شاید قدرت نہیں کوئی شاعر دے رہی ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم خواجہ و ہم مت پالو۔“

اجازت نے جلالہ ان کے دل میں ہنوز خوش فہمی سانس لے رہی تھی۔ کچھ وقت اور گذرنا خوشہ تبلیغ کی ملازمت میں بھی یہ فیصلہ ان کے لیے ایک اور جھکا ثابت ہوا۔ خوش فہمی اب دھیرے دھیرے سسکتی گئی۔ داخلی اور خارجی طور پر بھی بدتر ہو رہی تھی۔ ان کی جانب مائل تھا۔ انہیں سڑکوں پر سے غریبیت کے ناگوار قہقہے کا احساس پیدا ہوتا۔ اجازت الحق نے یہ محسوس کا شکار ہونے لگے۔ یہ کیفیات اس وقت مزید اجتر

”میں نے آتے ہی حدیث شریف کی نشریات سے جھیلنا شروع کر دی۔ ایک دفعہ اجازت کی تحریر کے فقرہ ’اسلام‘ کی خصوصیات میں میں ذاتی اصلاح کرتے ہوئے ’اسلام‘ لکھی یہ خصوصیات ہیں لکھ دیا۔

اجازت ان سے معنی و مطالب پر بے چین ہو کر رہ گئے۔

”کیونکر نے انہیں بخور دیکھتے ہوئے کہا۔“

”میں نے وہی بات بھی تو پہلے ہی نہیں ہوئے تھے۔“

”میں نے ان کی بات پر جواب دیا۔“ ہادی چوہدری پر عید حکومت کا حشر ہو رہا ہے۔ شہر بھر میں بد امنی پھیلی ہے۔ قریب و بھید اسے بھی بے دخل شہر کی روٹیں ختم ہو رہی ہیں۔ ایسے میں کسی کا ذاتی تو اذن لیکر رہے بھی تو کیسے؟

”مہاشے ای تو بھی شروعات ہیں۔ میری ایک بات لکھ کر رکھ لیجئے۔ ابھی بہت کچھ اور بھی دیکھنے کو ملے گا۔ ابھی حالات مزید بگڑیں گے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

اجازت نے اس بات پر کوئی رد و بدل نہ دیا تاہم مستحق قریب نے اس کیخبر کی بات بالکل درست ثابت کر دی۔ انڈین یونین حکومت کا قہم ہوتے ہی دکن کے مسلمانوں میں فتنہ کا مرض خود آ یا۔ پہلے تو بت دست و گریباں ہونے تک آئی۔ اس کے بعد صورت حال اس حد تک بگڑ گئی کہ وہ انڈین یونین کے نئے عہدے داروں سے ان کی خوشامدیں ایک دوسرے کی شکایتیں اور داستانیں خفیہ طور پر ان سے بیان کرتے گئے۔

اجازت اس صورت حال پر سخت ہنسٹ زدہ تھے۔ انہیں مسلمانوں کا یہ افغانی مرض کسی دبا کی طرح پھیلتا دکھائی دے رہا تھا۔ یہی حالات رہتے تو مسلمانوں کا برائے نام اقتدار مزید زوال پزیر ہو جاتا۔ اس اجتماعی قومی صورت حال پر کف انہوں نے ذاتی اور پیشہ وارانہ زندگی میں روٹل کے گرہن کا شکار ہو گئی۔ پولیس اسٹیشن کے بعد تحفہ دستاویزات اوقاف کے اوائل 1950 میں انہیں تحفہ دستاویزات اوقاف کے دفتر کی فضا کچھ بدلی ہی محسوس ہونے لگی۔ دفتر کا ہر شخص اس کے سترایا کرتا۔ وہ امور مذہبی کے مددگار انہیں احمد کے لیے غریبیت کے ناگوار قہقہے کا احساس پیدا ہوتا۔ اجازت الحق نے یہ محسوس کا شکار ہونے لگے۔ یہ کیفیات اس وقت مزید اجتر

عبداللطیف مسٹر نوادین کے پڑے سا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر نواد صاحب نے پہلے اپنا اور پھر اجازت کا بھی ہاپ دولا دیا۔ اگلے تین روز میں شہر والی تیار ہو گئی۔ نواد صاحب نے اجازت کے لیے خورشیدہ شہر والی اپنی موٹر میں انہیں بجاوا دی۔ بعد ازاں جب افغانی طور پر اجازت پر یہ عقدہ کھٹکا نواد صاحب نے ان کی شہر والی کا کشتہ حال کار دیکھ کر سب احتجاج کیا تھا تو وہ اپنی ذات میں بے حد شرمیلی محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی معاشی حالت میں مزید بہتری کی کوششیں شروع کر دیں لیکن انہیں علم ہی نہیں تھا کہ حیدر آباد دکن پر منڈلانے والی چابی ان کی ہر کوشش کو کامیابی کے کنٹرول پر طبعی مہیت کر دے گی۔

اجازت الحق نے دوڑ دھوپ کے بعد میں تحفہ دستاویزات حاصل کر لی تھیں۔ شبہ تبلیغ تحفہ امور مذہبی دستاویزات اوقاف اور دکن ریشم سے حدیث شریف لکھنے کا اعلان اس نے کران کی ابھی گذر رہی تھی۔ راوی میں ہی جن لکھ رہا تھا لیکن ہر ایک طوفان نے سب کچھ گھٹ کر دیا۔

برصغیر کی سیاست معاشرت اور جغرافیہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ پہلے ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے پھر ہندوستانی افواج کی حیدر آباد کی طرف پیش قدمی اور اطراف کے اضلاع سے آنے والی خبریں اجازت کو سخت تشویش میں جکڑ کر رہی تھیں۔ کچھ نمبر سے دہلی جہازوں کی گزراؤ بہت اضلاع میں قتل و خونریزی کی خبریں ان سے بھی علم دوست افراد کے لیے گھبراہٹ میں تھیں۔ اجازت نے اس عروج ابلا دین وحشت کا ایسا عالم بھی نہیں دیکھا تھا۔ ماحول کا یہ ناخود اجازت کو بھی حواس باختہ کیے ہوئے تھا۔

کچھ روز بعد وہ احباب اور اہل خانہ کے مشورے سے دکن تھک کے بینک میں اپنی جمع پونجی لٹوانے کے لیے چلے گئے۔ ذہن عجیب انداز میں پرمیٹ تھا۔ انہوں نے رقم من کر دیں کا اکثر پردگی اور بے دینی میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اے مہاشے! کیا ہو گیا ہے آپ کا؟“

”میں دکن کر کے جا رہے ہیں؟“ ہندو کیخبر نے انہیں لگا دیا۔

لے کر حریف بن کر بیٹھ کر رہا اور اس شخص سے منسوب ہو کر پانچ فریڈر یا پانچ دھڑا کر پاکستان روٹی کا ارادہ کر لیا۔
 "یہ فیملی تو آپ کو بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔"
 خورشید نے افسردہ کیسے کہا۔
 "میں اپنی ہر ممکن کوشش کرتے رہتا چاہتا تھا تا کہ دل میں کسی قسم کا کوئی شل نہ رہے۔" انہوں نے سر آدھ بھری۔
 "اب سزا خراج کا انتظام کیسے کریں گے؟" خورشید نے ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔
 اعجاز نے خاموشی سا دھ کی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ان کے پاس بھی اس مسئلہ کا کوئی حل نہ تھا۔ بہت دیر سوچ بچار کے بعد انہیں مکان کی فروخت کا خیال آیا۔ اتفاقاً طور پر ایک گاہک بھی میرا گیا۔ انہوں نے حریف تاخیر مناسب نہ سمجھی اور پہلی فرصت میں ہی بیچ کا نام کر لیا۔ یہ معاملہ پانچ ہزار روپے میں طے ہوا۔ اب یہ بھی قسمت کی یاد دہانی تھی کہ جس وقت بیچ کا نام نہ لیا گیا ہو اور قیمت فروخت کی ادا نہیں کی ہو تو سزا کا یہ طور پر حکم موصول ہوا کہ آئندہ اہلک فروخت نہیں کی جائے گی اور ہاجرین کی اہلک کمشنوین کے ماتحت تصوری جائیں گی۔ اعجاز کو اپنی خوش قسمتی پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ حکم ان کے مکان کا سودا مکمل ہونے پر آیا ہے۔ ان کے سزا خراج کے لیے پانچ ہزار روپے احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیے۔ وہ پاکستان جانے کی تیاریاں بالآخر ہی ہلا کر رہے تھے۔ اس ارادے کا علم صرف ایک ہی دوست کو تھا۔ پچھروڑ بھدو دوست کہنے لگا۔
 "اے اچھے نہیں لگتا کہ تم ایک فکری کر رہے ہو۔"
 "نہیں! لیکن جیسے ایسا کیوں محسوس ہوا ہے؟" وہ چمکے۔
 "سائے کی بات ہے۔ بھئی! اگر یہ سچا ہے۔ اعجاز ہاں ہے تو باطمینان امور مذہبی راجا ترمک لال سے اپنی زندگی کا مرکز داری کا کوئی صداقت نامہ لے لو۔ مستقبل میں اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔"
 یہ مشورہ اعجاز کے دل کو لگا۔ انہوں نے دوسرے ہی روز درخواست دائر کر دی۔ تیسرے روز صداقت نامہ مہیا کر دیا گیا۔
 "مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی یہ حیثیت جانب ختم سینہ اوقات کی جائیداد پر مامور کارکن اور ہے۔ اس مدت میں ریکارڈ سینہ اوقات کی ترتیب اور تنظیم جہ میں سررشتہ نے اپنا غیر معمولی مہارتوں سے قائم کیا۔

علاوہ اس کے اوقات کے اہم مقدمات اور مسائل شرعی میں حیثیت ایک عالم کے ان کی رائے حاصل کی گئی اور تاریخ و گن مذہبی کا ایک بڑا حصہ ادیب و معتمد کی حیثیت سے انہوں نے مرتب کیا ہے اور تحفظ اسانف اوقات کا بہترین کام انجام دیا ہے۔ کمال فرض شناسی و دلچسپی اور دیانت کے ساتھ اپنے کام کی تکمیل کی ہے لہذا منصفانہ حکم جہ ان کی دفتری ادبی اور تعلیمی قابلیت کی تصدیق کی جاتی ہے۔"
 صداقت نامہ کا یہ متن دیکھ کر اعجاز کا دل حریف بوجھل ہو گیا۔
 "سب کیا ہو گیا ہے؟ کیوں ہو گیا یہ سب؟" کاش ہم نے بروقت کچھ فیصلے لیے لیے ہوتے۔" انہوں نے افسردگی سے سوچا۔
 اگلے کچھ روز میں حالات مزید ابتر ہو گئے۔ مسلمانوں کو ملازمتوں سے دھرا دھرا نکال جانے لگا۔ برسرول کی عزت نفس اور خود داری بے طرح بھٹی ہوئی تھی۔ دکن میں جو سال حکومت کے بعد بدعنوانی کا تصور ہی سوا ہزار روپے لگا تھا۔ سیدہ خاتون کی طبیعت بھی بے حد افسردہ تھی۔ وہ بار بار اس سے ایک ہی سوال کرتی تھی۔
 "دب چلو گے پاکستان؟"
 "انشاء اللہ بہت جلد ہاں ہی! وہ دلا سہ ہے۔"
 "مجھے اس شہر میں ٹھہرنے ہوتی ہے جیسا مجھے بس کسی طرح لے چلو یہاں سے۔ میں ایک ٹی بھٹی یہاں نہیں رہوں گا۔ اگر اس کی ضروریات کے لیے کافی تھے۔ مزید مواقع کے لیے بہت سوچ بچار کے بعد انہیں ایک نیا خیال سوچا۔
 "تھوڑا دیر چرکے۔ صاف بے حد مشکل ہے۔"
 "توڑھا کا سے ہی لے چلوں! میں پاکستان! ان کی آنکھوں میں رنج و غصہ تھا۔ اس تجارت میں انہوں نے ایک دن میں پانچ سو روپے بھی کما لیے۔

اور پھر دھاکا پہنچنے کی تیاری مکمل کر لی۔ اپنی زندگی کے بھرپور دنوں میں صرف کرنے کے بعد اس مقام سے رخصتی پر دل خون کے آنسو رو بہ تھا۔ انٹین پہنچنے تک وہ ہر ایک مقام کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ دوران سزا بھی اپنے مقلد احباب سے غیر معینہ چھائی کی تلاش دل میں چکیاں بھرتی رہی۔
 گلہ بانی کر اپنے پاس موجود رقم پاکستانی مالیت میں تبدیل کر دئی اور کچھ روز ایک مسافر خانے میں قیام کے بعد دھاکا کا روانہ ہو گئے۔ دھاکا میں مشکلات آغاز ہی سے ان سے پیشگیر ہوئے لگیں۔ رہائش کا انتظام ہو سکے ہی نہ دے رہا تھا۔ ہوٹلوں کے کرائے ہوش بڑھاتے اور کسی سرائے میں کہیں کوئی کمرہ خالی نہ ملتا۔ خدا خدا کر کے ایک سرائے میں چند روز کے لیے سر چھپانے کو جگہ ملی۔ اب وہ اپنی اگلی منزل کرنا چاہتا جانے کے لیے سخت بے تاب تھے۔ دھاکا میں زیادہ دیر قیام نہ کر سکا اور تازہ گری اور تازہ گریاں انہیں بے طرح مٹھتے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اعجاز نے دھاکا میں رہنے پر انٹین پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ شوشی قسمت روح لگا تھا۔ سیدہ خاتون کی طبیعت بھی بے حد افسردہ تھی۔ وہ بار بار اس سے ایک ہی سوال کرتی تھی۔
 "دب چلو گے پاکستان؟"
 "انشاء اللہ بہت جلد ہاں ہی! وہ دلا سہ ہے۔"
 "مجھے اس شہر میں ٹھہرنے ہوتی ہے جیسا مجھے بس کسی طرح لے چلو یہاں سے۔ میں ایک ٹی بھٹی یہاں نہیں رہوں گا۔ اگر اس کی ضروریات کے لیے کافی تھے۔ مزید مواقع کے لیے بہت سوچ بچار کے بعد انہیں ایک نیا خیال سوچا۔
 "تھوڑا دیر چرکے۔ صاف بے حد مشکل ہے۔"
 "توڑھا کا سے ہی لے چلوں! میں پاکستان! ان کی آنکھوں میں رنج و غصہ تھا۔ اس تجارت میں انہوں نے ایک دن میں پانچ سو روپے بھی کما لیے۔

حزابی کے پاس ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثریت اعجاز کو دھاکا میں ہی مقیم رہنے کے لیے قائل کرنے لگی لیکن وہ سیدہ خاتون کی وجہ سے بھی مجبور تھے جو بہر صورت اپنے عزیز و اقارب کے پاس کراچی منتقل ہونا چاہتی تھیں۔ پھر بالآخر دھاکا سے روانگی کا وقت بھی چلا آیا۔ ایک ہفتے بعد وہ کراچی میں لاعت ہاؤس کے سامنے واقع دو کمروں کے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔
 کراچی آمد کے بعد پہلی رات بے حد شوہر تھی۔ ان دو کمروں کے فلیٹ میں وہ تقریباً بیڑہ درجن افراد ٹھہرے ہوئے تھے۔ کچھ روز میں میزبان ان سے آشنا کیا۔ ان کی بڑی بہن آمنہ کے ایک سرکاری عزیز ٹیکہ آبادی میں تھیں تھیں تھے۔ ان کی مدد سے لیاقت آبادی 5 میں سیدہ خاتون اور اعجاز کے نام دو کمرہ لائے ہو گئے۔ اعجاز حق اپنے اہل خانہ سمیت لیاقت آبادی منتقل ہو گئے جہاں ایک اور آزمائش ان کی منتظر تھی۔
 دونوں کوارٹروں کی چار دیواری نادر تھی۔ صاف بے سرو سامانی کا عالم محسوس ہوتا تھا۔ کچھ ہی روز میں مہاجرین کارواں کی صورت میں ان کوارٹروں میں اترنے لگے۔ ان ہزاروں بھٹی نیشوں کو دیکھ کر وہ خدا کا شکر بھی ادا کرتے کہ بے درود دیواری سہا ان کے پاس نوسے گز کے کوارٹرز تو تھے۔ شکر کا یہ جذبہ ان وقت حریف شدت اختیار کر لیتا جب برسات کے موسم میں یہ مہاجرین چار بانس کی بھٹی بنا کر پڑے رہتے۔ کوارٹروں میں مٹی کے ٹیل کی انٹینیں اور چراغ جلا کرتے۔ دھیرے دھیرے ہم ذوق افراد مختلف ٹولہوں میں بیٹھ گئے۔ رات کو کم روزگار سے فرصت پاتے ہی وہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق مختلف کوارٹروں میں جمع ہو جاتے۔ ان لئے بے قانون میں ادیب شاعر مناج کار بیکر اور مزدور بھی تھے۔ رات کو ان کی مجلسیں جیتیں گے شپ اور شعر و شاعری ہوتی۔ نصف شب کے بعد یہ مجلس برخاست ہوتی تو لوگ اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے۔
 اسی دوران اعجاز کو علم ہوا کہ لیاقت آبادی 2 میں ایک صاحب ذوق اور احباب نواز مقیم ہیں۔ ان کی مجلسیں اعجاز کے ذوق کے مطابق ہیں۔ انہیں ان مجلسوں میں ضرور شرکت کرنی چاہیے۔
 "آپ کی بات اپنی جگہ بجا لیکن ابھی تو ہم روزگار سے فرصت نہیں ہے۔ جب بھی فرصت ملی میں ان کی مجلس

ایک ات پر ہی موقوف نہیں پاکستان اس وقت مسلمان کا مرکز تھیں چھوٹے روز۔ یہ طوالت اور سزا کے استقامت سے ڈانٹ ہونے کے باوجود پاکستان سزا کشش بہت زیادہ تھی۔
 "بس دعا کرتی رہے کہ اللہ پاک میرے معاملات میں آسانیاں پیدا فرمائے۔"
 بیٹے کی اس التجا پر سیدہ خاتون نے اپنی دعاؤں حریف شدت پیدا کر دی۔ اعجاز نے اپنے بھی معاملات دہری سے نمٹائے اور تاریخ 1951 میں براستہ ہجرا

ایک ات پر ہی موقوف نہیں پاکستان اس وقت مسلمان کا مرکز تھیں چھوٹے روز۔ یہ طوالت اور سزا کے استقامت سے ڈانٹ ہونے کے باوجود پاکستان سزا کشش بہت زیادہ تھی۔
 "بس دعا کرتی رہے کہ اللہ پاک میرے معاملات میں آسانیاں پیدا فرمائے۔"
 بیٹے کی اس التجا پر سیدہ خاتون نے اپنی دعاؤں حریف شدت پیدا کر دی۔ اعجاز نے اپنے بھی معاملات دہری سے نمٹائے اور تاریخ 1951 میں براستہ ہجرا

”میری ولی دعا ہے کہ پروردگار جلد از جلد کوئی وسیلہ پیدا فرما دے۔“ خورشیدہ نے غلوس سے کہا۔

اجاز نے بھی پوچھل اعجاز میں زہرا ب آئین کہہ دیا اور پھر اس کے بعد جدوجہد کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ صبح سے شام تک بندرہ کی سڑکیں ٹاپتے لیکن ملازمت کی کوئی صورت بن کے ہی نہ دیتی۔ کچھ عرصہ بعد نوٹ یہاں تک آ پہنچی کہ ان کے بدن پر صرف ایک جوڑا سلامت رہ گیا۔ وہ اسی کو دھونے کے بعد پکن کر گندرا کر لیتے تھے۔ جب شیر وائیاں بھی پھٹ گئیں تو ان کے نظریوں کام چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب وہ بغیر شیر وائی کے ہی باہر آکا جایا کرتے تھے۔ کھانے کا حال ہو گیا کہ جو بے قہار باریاں کھاتے دکھائی دیتے تھے۔ اس سہری میں انہیں ایک وقت کھانا ترک کرنا پڑا۔

سعیدہ خاتون بیٹے کی اس حالت پر بہت آزرده رہیں۔ وہ اجاز کے لیے اپنے اماں کو صندوق میں بند کیے رکھ دیتیں تاکہ شام کو بھوکا پیاسا کھر آنے کی صورت میں طعام کا کچھ تو بندہ دست ہو۔ اجاز کی مایوسی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ایک شام وہ کھڑے آئے تو معمول سے زیادہ خاموش تھے۔

”کیا بات ہے بیٹا؟ کسی کی کوئی بات بری لگی ہے کیا؟ اس طرح خاموش کیوں ہو؟“ سعیدہ خاتون نے دریافت کیا۔

والدہ کی اس محبت پر اجاز کا منہ ختم ہو گیا۔ وہ گھبراہٹ سے پہلے ہی ارادہ کر کے آئے تھے کہ کسی سے کوئی ذکر نہیں کریں گے۔ والدہ کے انتظار پر پوچھل اعجاز میں کہنے لگے۔

”آج میرے میلے کپڑے دیکھ کر ایک حصول دوست نے مجھ سے کہا یا راتم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے غلامی کرو۔“

”تھوڑے سے کیا کہا بیٹا؟“ والدہ کے دل پر بھی دھچکا لگا۔

”کچھ نہیں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ بس اس کا یہ طعنہ کر ڈال دیا۔“

”ہاں ان سے کیا علم کہ دھلتے دھلتے ان کپڑوں کا رنگ ہی لگ گیا ہو گیا ہے اور دھوئی سے کپڑے دھلوانے کی ہمارا استطاعت ہی نہیں۔“ سعیدہ خاتون نے سر د آہ بھری۔

”جو کچھ خدا رکھائے سونا چارہ کھنا۔“ اجاز نے ایک

میں شرکت کر لیں گا۔“ اجاز نے چال دیا۔ غصہ جعفری کچھ عرصہ بعد اجاز نے ان مذکورہ غصہ سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔ لوگوں سے پوچھتے پچھاتے وہ ان کے کارڈ پینے تو کھا رہی تھیں دیکھ کر کئی کائی جبران ہوئے۔ انہوں نے لیاقت آباد کی آبادی میں ایسا شاندار ڈھنگ اور سلیقے سے بنا کارڈ پینے یاد کیا تھا جعفری صاحب اجاز سے بیت غلوس دینا تک سے لے کر اور وقت رخصت کئے تھے۔

”کئی روز فرغت نکال کر بوت شہ عریف لائے۔“ رات کو یہاں یارانان طریقہ جمع ہوتے ہیں۔ آپ ان سے جتارف ہو کر بہت خوش محسوس کریں گے۔“ اجاز نے کچھ سوچ کر ہی بھری اور اگلی ہی شب دوبارہ وہاں پہنچ گئے۔ جعفری صاحب نے انہیں غلام علی شہید ایلوی مرحوم عبداللہ بیگ اور اکبر خاں کا چوڑی سے متعارف کروایا۔ ان میں سے ہر شخص ہی اپنی ذات میں ایک اجنب تھا۔ دوسری جانب جعفری صاحب نے بھی ان سب کی سیر بانی میں کوئی کسر اٹھانہ دی ہوئی تھی۔ پان سگریٹ چائے کی ذرا سی بھی کئی دیکھتے ہی فوراً اٹھ کر زبان خانے میں جاتے اور مطلوبہ شے کا اہتمام کر دیتے۔

اگلے پندرہ روز میں اجاز ان سب سے خوب میل مل گئے۔ پھر صورت حال یہ ہوئی کہ آدھی برسات گر گئی یا سردی کوئی بھی موسم ان کی وہاں روانگی میں حائل نہ ہو پاتا۔ اگلے دو برس تک وہ رات آٹھ بجے تک جعفری صاحب کے گھر جاتے اور نصف شب تک ان محفلوں سے محفوظ ہوا کرتے۔ ان سرگرمیوں کا اختتام اس وقت ہوا جب غلام علی اور جعفری صاحب میں کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر شکر رشتی ہوئی اور کچھ ہی عرصہ بعد جعفری صاحب اپنا مکان فروخت کر کے فیڈل دی امریا منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد ان ادبی محفلوں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

کچھ ہی روز گزرے تھے کہ ایلہ نے انہیں تشویش سے کہا۔

”حالات بہت عجیب ہوتے جا رہے ہیں۔“

”اب کیا ہو گیا ایسا؟“ وہ چونکے۔

”جیت تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ آنا کو نہ جتے وقت ہزار لوگوں کے پاؤں دوریت سے اٹ جاتا ہے۔ آپ لوگ ریاضت کے کی کوٹش کیوں نہیں کرتے؟“

”بہت جگہوں پر کہہ من رکھا ہے۔ اب آگے جو قسمت۔“ اجاز نے سر د آہ بھری۔

مصرع دہرایا۔
”ملازمت کا کچھ بٹا ہے یا نہیں؟“ انہوں نے بڑی آس سے پوچھا۔
”نہیں اب تو بیک میں بھی صرف چالیس روپے باقی رہ گئے ہیں۔“

”ماپوس نہ ہو بیٹا! یہ بخیر ہی وقت بڑے بڑے لوگوں پر آتا ہے۔ جیسے کہ ہر حال میں خدا کا شہری ادا کرنا چاہیے۔ والدہ نے تسلی دی۔

”وہی تو کر رہا ہوں۔ مایوسی نہیں لیکن بس کبھی کبھی افسردہ ہو جاتا ہوں۔“ اجاز نے صاف کوئی نہ بتایا۔
”اچھا! ایک کام کرو۔ کل صبح یاد سے ایک ایک روپیہ ہر بچے کو دے دینا۔“

سعیدہ خاتون کی اس فرمائش نے انہیں چونکا دیا۔
”اس کی کوئی خاص وجہ؟“ وہ پوچھتے بغیر نہ رہ سکے۔
”ہاں! پھر خدا نے کب تمہارے ہاتھ میں روپیہ آئے اور کب تم انہیں دے سکے۔“ انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔

اجاز کے دل پر ایک گھونسا لگا۔ وہ کوئی عذر کیے وہاں سے اٹھے اور سب سے چھپ کر آٹھ سو بھانے لگے۔ یہ بے بسی لاچارگی اور کم مانگی اس وقت مزید مضطرب کرنے لگتی جب حیدر آباد کی میں گزرتے شب دروز با آتے تھے۔

اگلے روز اجاز نے والدہ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ کبھی بچے ایک ایک روپیہ پا کر خوشی سے چولے نہ سارے تھے۔ ان کی یہ خوشی اجاز کے قلب و روح پر مزید تازیانے برسانے لگی۔ ان بے خبریوں کو علم ہی نہیں تھا کہ اس خوشی کے بعد ٹھک دتی کا کیسا بولناک وقت کروٹ لے رہا ہے۔

کچھ روز مزید اسی کشاکش اور ملازمت کی تلاش میں بہت گئے اور پھر وہ دن بھی طلوع ہو گیا جب بینک میں ایک پائی بھی نہ رہی۔

”آج کھر میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو بچوں کو کھلایا جاسکے۔“ خورشیدہ نے آذر دگی سے بتایا۔

”یہ وقت تو اتنا ہی تھا۔“ اجاز نے سر د آہ بھری۔

”تھوڑے کریں۔ اگر وہ وقت نہیں رہا تو یہ بھی نہیں رہے گا۔ پروردگار دھاری دعا میں ضرور قبول فرمائے گا۔“

انہوں نے شوہر کو دلا سنا دیا۔

اجاز خاموشی سے کھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کا رخ آج بھی بندرہ روڈ ہی تھا۔ وہ سلیکے میں ان کی محنت مرمت اس

سڑک سے گزرتے تھے اور یہاں ڈائریکٹ تعلیمات کا دفتر بھی بارہا دیکھا تھا تاہم اس روز وہاں میں پہلی بار یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک دفعہ یہاں بھی قسمت آزمائی چاہیے۔ وہ فوری طور پر اندر گئے اور مٹان ملی انصاری کے کمرے میں چلے گئے۔ انصاری صاحب اس وقت مٹلیں دیکھنے میں مصروف تھے۔

”فرمائیے! کیسے رخصت کی آنے کی؟“ انہوں نے ایک نووارد کو اپنے سامنے پا کر سرسری سے اعجاز میں پوچھا۔
”ملازمت کی تلاش میں آیا ہوں یہاں۔“ اجاز نے بغیر کسی گہی لپٹی کے جواب دیا۔

”کچھ اردو لکھی آتی ہے کیا؟“ اگلا سوال آیا۔
اس سوال نے اجاز کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ بکھر دی۔

”ساری عمر ہی اردو کی خدمت میں گزری ہے۔ جو شہر چھوڑ کر آیا ہوں اسے اردو کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔“
”اچھا! کل صبح آ جانا۔ کہیں نہ کہیں بندہ دست کروں گے تمہارا۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر ایک بار پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

اجاز کا رواں رواں شکرانہ ادا کرنے لگا۔ وہ فوری طور پر گھر آئے اور سعیدہ خاتون کی قدم بوسی کی۔
”میری ملازمت کی ایک منٹیں کل آئی ہے۔ کل صبح بلایا ہے مجھے وہاں۔“

”الہی! حیران کن لاکھ شکر ہے۔ ایک سال کے بعد میرے بیٹے کے لیے روزگار کا درملہ کھلا گیا۔ بس اپنا کرم ہم پر ہمیشہ بٹائے رکھنا!“ انہوں نے آچل اٹھا کر دعا کی۔

اگلے روز اجاز نے حد آس و جذبے سے محکم تعلیمات سندھ کے دفتر پہنچ گئے۔ انصاری صاحب نے بلا تاخیر سندھی ادبی بورڈ کے سیکرٹری ”محمد ابراہیم جویا“ کو بلایا اور کہنے لگے۔

”تمہارے دفتر میں کوئی جگہ ہو تو انہیں دے دو۔ یہ اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔“

”ہمارا دفتر تو ابھی نیا نیا قائم ہوا ہے۔ فرنیچر بھی نہیں آیا۔ اگر یہ صاحب ہیں دن تک ممبر کر لیں تو ان کے لیے جگہ ضرور نکال سکتی ہے۔“

انصاری صاحب اس جواب پر تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ لچائی تو قہقہے کے بعد انہوں نے چڑا ہی سے کہا۔

”میں ان کی ان کے لیے جگہ نکال دیتا ہوں۔“

چڑھائی نے حکم کی قیل کردی۔ مولانا صاحب کے آتے ہی انہوں نے کہا۔
 ”یہ صاحب ہیں روزنک لائبریری میں ٹھہر رہے ہیں۔“
 ”باقی معاملات آپ خود ہی ان سے طے کر لیجئے۔“
 مولانا صاحب نے اثبات میں سر ہلادیا اور یوں اجازت لے کر تفریحاتی روپے ماہوار پر کروا گیا۔ جس روز کے بعد انہیں سندھی ادبی بورڈ کے شعبہ تاریخ میں نکل لوٹنے پر مامور کر دیا گیا۔

☆☆☆

ملازمت کا سکون میسر آتے ہی اجازت دے دی جانے سے محنت کی۔ دو ماہ بعد ہی ان کی خواہ بڑھا کر ایک سو بیس روپے کر دی گئی۔ کچھ عرصہ حریز گذرا تو انہوں نے ”انجمن ترقی اردو“ میں بھی شمولیت اختیار کر لی۔ اس انجمن کے سیکرٹری اور روح رواں مشفق خواجہ نے قاسم اکتب (شعبہ تاریخ) کی ایڈیٹری اجازت کے سپرد کر دی۔ اجازت دینے پر اس شعبہ میں بھی عمل جانفشانی سے کام کیا۔ فارم بنائے اور تاریخ کی دو ہزار کتابوں کا ذخیرہ کس بھی مرتب کر دیا تاہم یہاں معیشت خاصی ناگانی تھی اس لیے زیادہ تر ترقی کے مواقع بھی نہ تھے۔ اجازت کو بھجورنا ترقی اردو بورڈ کا رخ کرنا پڑا۔

اس ادارے میں معیشت کی آسودگی تو میسر تھی لیکن کبھی طمانیت کا شہ نہ تھا۔ اجازت کو ترقی اردو بورڈ میں معاون مدیر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے کارڈ نوٹس سے لے کر الفاظ کی تحریر نگاری تک سب کام انجام دیے۔ معقول تنخواہ کے باوجود اس بورڈ کی خرابیاں روحانی آسودگی محسوس نہ ہونے دیتی تھیں۔ بورڈ میں ایسے عناصر جمع تھے جو ایک دوسرے کو رسوا کر کے مقام و مرتبہ سے گرانے کی فکر میں ہی جھلا رہے۔ بورڈ کی اکثریت کا نظریہ یہی تھا کہ یہ ادارہ دودھ دیتی ہوئی گائے ہے۔ اس سے حتی المقدور فائدہ اٹھالینا ہی بہتر ہے۔ اجازت کو بورڈ کے ملازمین کے معمولات بھی نا پس و طیش میں جھکا کرنے لگے۔ ان ملازمین کی نظریں چار بجنے سے پہلے ہی گھڑیوں پر پڑنے لگیں۔ چار بجتے ہی ہر شخص ایسے باہر نکلتا جیسے کوئی تیری کی جیل خانے سے فرار ہوتا ہے۔ اجازت کو وہاں کوئی بھی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا جو اپنے فرض کو مکمل جانفشانی سے انجام دیتا ہو۔

دوسری خرابی بھی کم نہ تھی۔ ادارے میں شعبہ

برصغیر کے مشہور موسیقار فیروز گھلائی نذر کے بڑے بھائی تھے اور یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہوئی کہ پاکستانی فلم ”گنگار“ کی موسیقی نذر محمد مرحوم نے ترتیب دی تھی جس کے کچھ گیتوں کی دھنیں بھی بے حد مشہور ہوئی تھیں۔ انہی مقبول گیتوں میں ایک گیت ”جانم دی راتیں سب چک سوئے ہم جاگیں۔ تاروں سے گریں باتیں.....“ بھی شامل ہے۔ گھٹنوں کے نیچے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد نذر تیار ہو کر کہیں جانے لگا تو میں نے پوچھا کہ کدھر جا رہے ہو کہنے لگا کہ مشہور گانگیک اختر کی بانی حیدر آبادی کے یہاں جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ ہم اختر کی بانی کے یہاں پہنچے۔ نذر نے میرا اس سے تعارف کرایا تو اختر کی بانی میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی وہاں میز پر ایک ریڈیو بڑا ہوا تھا جس پر قرآن پاک رکھا ہوا تھا وہ مجھے کہنے لگی کہ ادھر تم لوگ میدان میں کھیل رہے ہوتے ہو اور میں عبادت کر رہی ہوتی ہوں کہ ”اللہ پاکستان کی جیت ہو۔“

دونوں شعبے بالکل علیحدہ ہونے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ ان کے خیال میں شعبہ لغت کے اختیارات بڑے اول کے پاس جبکہ شعبہ انتظامی کے اختیارات سیکرٹری ترقی اردو بورڈ کے پاس ہونے چاہیے تھے۔ اب بد قسمتی یہ تھی کہ یہ سارے اختیارات سیکرٹری کے پاس تھے جنہوں نے اپنے وسعت اختیارات کے ذمہ میں غلط حکمت عملیوں سے معاملات کا بیڑہ غرق کر رکھا تھا۔ اجازت کے لیے ہر گزرتا دن ٹھن ہی لے کر آتا۔

اس تاؤ و زرد ماحول میں اپنے دیرینہ کرم فرما جوش ملیح آبادی سے ریڈیو پاکستان کے ایک مشاعرے میں ہونے والی ملاقات حریز افسردگی کا سبب ثابت ہوئی۔ جوش ان دنوں مستقل طور پر پاکستان منتقل ہو چکے تھے۔ اجازت کا تعارف کرواتے ہوئے تائش صاحب نے انہیں کہا۔

”تو میں دوستوں کا میں تعارف کیا کرواؤں گا؟ طوائف عمر نے چہرے بدل دیے مگر چالیس برس کے دکن کی یاد اگر آپ کو بھولی نہیں تو اس میں تائش صاحب کا نام ضرور ملے گا۔“

جوش کے چہرے پر ایک چمک درآئی۔ وہ اجازت سے بے نظیر ہوئے اور تائش سے کہنے لگے۔ ”یہ بھولنے کی چیز توڑی ہیں۔“ اس کے بعد وہ اجازت سے مخاطب ہوئے۔ ”کیا کرتے ہو میںاں یہاں؟“

”سندھی ادبی بورڈ کے شعبہ تاریخ میں ملازم ہوں۔“ اجازت نے بتایا۔

اس کے بعد ان دونوں میں حیدر آباد دکن کے شب و روز اور محافل کا ذکر ہوا۔ اجازت کا دل مزید یوں چل ہوا۔

☆☆☆

”آہ کیا دن تھے؟ کیا دور تھا؟ کیا لوگ تھے اور کیا ہی ماحول تھا؟“ اجازت اتنی جلدی کیوں گزرتا جاتا ہے؟ پوچھ کر اس قدر طویل کیوں محسوس ہوتا ہے؟ کیا احباب کے ستاروں کا وہ جہرمت دوبارہ بھی جھگڑ سکے گا؟ کیا حالات پہلے جیسی ہی اختیار کر سکیں گے؟“

اس رات اجازت کے دل دوبارہ میں بس یہی نقش کش برپا تھی۔

ملازمت کے ان ٹھن شب و روز میں خوشگواریت اور سکون کا واحد وزن قلم سے دانسی تھی۔ اجازت نے قلم سے اپنا تانہ بانگ نہیں توڑا تھا۔ ان کے ذہن میں تحقیق و تہنیف کے لیے بے شمار خیالات پھیلے رہتے۔ طبیعت کی اسی جولانی سے متغلب ہو کر انہوں نے 1964ء میں ”سراپائے رسول“ تہنیف کی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں اجازت الحق نے لکھا:

”دنیا بہت بڑی ہے۔ اس کے ہر ذرے میں خدا کی بے شمار قدرتیں چھپی ہوئی ہیں۔ تحقیقات کا پہلے پناہ سلسلہ جاری ہے اور رہے گا۔ کائنات پران گنت پردے پڑے ہوئے ہیں جو پردہ اختیار ہے ایک مستقل فن بن جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں علوم و فنون پیدا ہو گئے اور نہ معلوم ابھی کتنے ایجاد ہوں گے۔ تحقیقات کرنے والوں نے عرصہ صرف کر دیں۔ تہنیفیں کیں۔ تحقیق کو کھولا مگر چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ سب بیکار حقیقت جوں کی توں راز میں سے پردے میں ہے۔ ان بے سود کوششوں اور نا کام مساعی کو دیکھ کر میں نے یہ سبق حاصل کیا کہ میں ایسی محنت نہ کروں گا جو چند روز کے بعد بیکار ہو اور دنیا میں میرا اور میرے اسلاف کا بھلا ہوگا اور میرے

ملک و قوم کے بچے جو ان بوڑھے مرز عورت سب کا بھلا ہو گا۔ یہ کام ہے سرکار و عالم خاتم الامین حضرت محمد رحمت اللہ علیہ کی سیرت مبارک۔ سبکی میری زندگی کا مقصد ہے اور اسی پر میں خدا سے اپنی موت چاہتا ہوں۔ سوئے مبارک سے لے کر باطن مبارک تک حضور انور ﷺ کا رواں رواں ایک مستقل حقیقت ایک ظاہر و باطن اور ہمارے لیے ایک نمونہ اور سبق تھا۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے محبوب اور ان کے اوصاف و خصال کا ذکر کیا۔ دنیا نے خدا کے حکم کو مانا اور دنیا والے حضور اکر ﷺ پر ایمان لائے۔ جو کچھ خدا نے اپنے رسول ﷺ کے متعلق فرمایا تھا وہی ایسا دیکھا اور پایا لیکن دنیا والوں کی نگاہوں نے کیا دیکھا اور کیا پایا؟ اپنی ولادت با سعادت سے لے کر وفات مبارک تک زندگی کس طرح گزری۔ جوانی اور بڑھاپے کی سرگذشت ”سونا“ ”انھن“ ”کھانا“ ”چٹا“ ”دستی“ ”دھن“ ”لڑائی“ عبادت“ ”عادات و خصائل“ ”بیوی“ ”بچے“ دوست“ ”احباب“ ”پڑوسی“ اور شہر والے وغیرہ روزمرہ کی زندگی کے جملہ حالات جو دیکھنے والوں نے دیکھے اور سننے والوں نے سنے۔ ان سب کو سیرت اور حدیث کی مستند کتابوں سے لے کر اور ہر کتاب کے نام تک صفحہ و سطر کا حوالہ دے کر میں نے سب اور سبکی زبان میں جمع کر دیا اور اس کا نام رکھا ہے ”سراپائے رسول“۔

یہ میری زندگی کا حاصل ہے۔ یہ میری عقیدت کے پھول ہیں۔ یہ میرے ایمان کی روح ہے جس کو گندہ خضراء پر نچھاور کر کے آج دنیا والوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور گل قیامت کے دن خدا کے سامنے بھی لے جاؤں گا۔ یہ قیامت تک کام آنے کے لیے دنیا کے سب سے آخری رسول ﷺ کی زندگی کا مرقع ہے۔ خدا پر انسان کو اس کے دیکھنے اور اس کے مطابق عمل کی توفیق دے۔“

کتاب نے اشاعت کے فوری بعد ایک جھلک چا دیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ”اجازت الحق کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا۔

”مولوی اجازت الحق قدوسی صاحب تمام مسلمانوں کے شکر یہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس مختصر رسالہ میں یہ سراپا اس طرح پیش کر دیا ہے کہ ہر معمولی پڑھا لکھا اردو داں اس کو پڑھ سکتا ہے۔ اور ایک آن بڑھ آدمی بھی اس کو سن کر بہت شکر و تحسین کرے گا۔“

میرا مولود کی غلط اور گمراہ کن کتابوں کی بجائے ایسی کتابوں

مرتی ہوئی زبانیں

رانا محمد شاہد

انسان اپنے جذبات، ضروریات دوسروں تک پہنچانے کے لیے الفاظ کا سہارا لیتا ہے۔ یہ الفاظ مربوط ہوجاتیں تو بولی ہی کہلاتی ہے۔ اس وقت پاکستان میں ایسی کئی ماں بولی ہے جو معلوم ہونے کے قریب ہے۔

پاکستان کی وہ زبانیں جو ختم ہو رہی ہیں



علاقوں کے رہنے والوں کے درمیان عموماً مرید میل ملاپ سے زبانوں میں بتدریج بہتری آتی ہوئی۔ چندوں کو بیان کرنے کے لیے بہتر اور موثر طریقے اپنائے گئے ہوں گے۔ ابلاغ کے لیے بہتر طریقے سکھے گئے ہوں گے۔

مادری زبان کو کتنی اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ماں کے الفاظ لوری سن کر بچے کو نیند آتا ہے، گہرائیوں میں لے جاتے ہیں۔ ماں کے کہے الفاظ بچے کے ذہن میں نقش ہوجاتے ہیں۔ ذہن میں نقش ہونے والے یہ الفاظ بچے کی بولی یا زبان کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ماں سے سننے والے یہ الفاظ ہی دراصل بچے کی مادری زبان کہلاتے ہیں۔ جو

کسی بھی قوم کی پہچان اس کی ثقافت و اقتدار سے ہوتی ہے اور زبان کسی بھی قوم کی پہچان کا بنیادی جزو ہے لیکن زبانوں کی ابتدا کیسے ہوئی، اس بارے میں ماہرین یہ کہتے ہیں کہ جیسی زبان اب بولی جاتی ہے۔ اڑھائی سال پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ انسانوں نے کم از کم پانچ لاکھ سال قبل زبان کی صورت بولنا شروع کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان بولنے کی تبدیلی آہستہ آہستہ ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ بولنے والی زبان سے پہلے زبان کی پہچان کی شکل ہوئی کہ جس میں آوازوں اور مقامی

مترکی وہابی کا آغاز ہو چکا تھا۔ معاشی نظام کے لیے اجازت زندگی میں خانگی مدد جڑنے بھی دستک دینے کا آغاز کر دیا۔ بارہ جون 1972 کو بڑی بچی فرحت جہاں عارف انصاری سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی۔ اس کے بعد پھلی بیٹی قمر جہاں بھی خواجہ جاوید نسیم سے عقد نکاح میں بندھ گئی۔ ان ابتدائی خوشگوار سرگرمیوں کے بعد دس سال بعد بھائی دھمکے اجازت کی دنیا تیرہ سالہ لڑکے۔ 1974 میں ایک پناہ گزین آخر قدوسی کی دامنی مرض میں مبتلا ہو گیا اور اس مرض و بیماری میں اکتیس اپریل 1974 کو سندھ اسپتال حیدر آباد میں وفات پا گیا۔ کئی حسن قبرستان میں اپنے لرزیدہ ہاتھوں سے اس کی تدفین اجازت کی زندگی کا ہولناک ترین تجربہ بھی۔ اس صدمہ کا اثر ابھی زائل نہیں ہونے پایا تھا کہ پندرہ مئی 1978 کو چھوٹا بیٹا امتیاز الحق قدوسی بھی مرگے کا شکار ہو کر انتقال کر گیا۔ اجازت کی تو گویا کر ہی ٹوٹ گئی لیکن اللہ کی رضا میں راضی ہوئے بغیر چارہ بھی کیا تھا۔ امتیاز کو بھی اس سے وابستہ تمام خوابوں سمیت لیاقت آباد کے قبرستان میں اپنے ہاتھوں سے ایک قبر میں اتار دیا۔ زخم خوردہ وجود پر ایک اور دوامی گھاؤ نے اپنی زبانش اختیار کر لی تھی۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گذرتا رہا۔ اجازت کا حلقہ احباب کافی دست و پاز اختیار کر گیا تھا۔ پروفیسر نواب علی علامہ سید سلیمان ندوی، وقار صدیقی، محبوب گوالیاری، برق گوالیاری، غیاث آبادی، رابع مراد آبادی، ڈاکٹر جمیل جالبی، جالبش دہلوی، حفیظ ہوشیار پوری، اشفاق احمد، شاعر نعیمی، پروفیسر اقبال عظیم، فکیل احمد ضیاء ٹیڈ۔ ایچ انصاری اور احسان دانش جیسے افرادی طلیعت سے مستفید ہوتے اور اپنے نہاں دشمنوں کا کرب برداشت کرتے اجازت نے کئی بہترین تصانیف تخلیق کیں۔ بدھتی ہوئی عرواق قلب درود پر گئے گھاؤ اب بہت شگفتہ کرنے لگے تھے۔ مختلف مسائل و امراض سے لڑتے اجازت اپنی قدوسی امیں فردی 1986 کو ایکایک سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ نماز جنازہ لیاقت آباد میں ادا کر کے علم و تحقیق کا یہ آفتاب پاپوش مگر کے قبرستان میں مدفن بن کر رہ گیا۔

مشاہدات

سہارا لیا لیکن ارباب اقتدار نے ہانکل کان نہ دھرے۔ احتجاج اور اس کے جوابات چھتے رہنے کے باوجود اقتدار کی غرضتیاں ہی غالب رہیں۔ وہ سب کسی بھی پنشن اور گرجائی کے بغیر خود کو ذوق کے اعتبار سے بے آب و گیاہ صحرائیں مگرے محسوس کرنے لگے۔ اس ضمن وقت میں بہار کوئی صاحب ان سے ملاقات کے لیے چلے آئے۔

بہار صاحب سے اجازت کی شاسانی اس زمانے سے تھی جب وہ لیاقت آباد (جسے اس زمانے میں لاہوریت کہا جاتا تھا) میں دوکار ٹرڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان دنوں اجازت کو کئی کی سہائی تحسین مروتی شامیں زندگی سے مروت دوست احباب اور علمی و ادبی جماعتیں بہت یاد آیا کرتی تھیں۔ تنہائی اور اجنبیت کا شدید احساس بھی ڈسا کرتا تھا۔ انہی دنوں وہاں ان کی شاسانی بہار کوئی صاحب سے ہوئی تھی جو بڑے بڑے گہری دوستی میں تبدیل ہوئی۔ بہار نے اجازت اور ان کے رشتہ کی حمایت میں اپنا ایک بیان بھی اخبارات اخبار میں شائع کروا لیا لیکن بے سود! ہر گذشتہ دن ان کی مشکلات میں اضافہ کر رہا تھا۔ اجازت کو ایسا محسوس ہوتا گویا زمین تخت اور آسمان دور ہے۔

ایک لخت پانچ سو روپے ماہانہ ملازمت کا ورہمہ ہو جانا اچھا خاصہ معاشی دھچکا تھا۔ شب و روز بے حد تباہ اور آزردگی میں بیت رہے تھے۔ اجازت کی ان کیفیات میں اضافہ ہی ہوتا رہا تھا۔ کچھ عرصہ بعد مسودہ برکاتی کسی فرشتہ رحمت کی طرح چلے آئے۔ وہ حکیم محمد سعید کا ایک پیغام لے کر آئے تھے۔

”میاں! ایک کام بھیجنا ہے حکیم صاحب نے۔ کر لو گے؟“

”ہاں ضرور! کیوں نہیں۔“ اجازت نے بلا تامل جواب دیا۔

”تذکرہ شعرائے اہل علم کا مواد جمع کرنا ہے نہیں۔“

تدوین و ترتیب اور کتاب لکھنے کا کام حکیم صاحب خود ہی کر لیں گے۔ تیار کام صرف تذکروں سے مواد جمع کرنا ہوگا۔ باقی ہر مرحلہ وہ خود ہی دیکھ لیں گے۔“

اجازت نے ہائی بھرلی اور کام کا آغاز کر دیا۔ ہر پختہ اپنا جمع شدہ مواد لیے وہ اکٹھے کے پاس جاتے اور میٹھے میٹھے کی اجرت لیے واپس چلے آتے۔ یہ معمول اگلے اگلے بڑھ برس تک جاری رہا۔ حکیم صاحب کی جانب سے بھی کئی تسلی اور کافر کا مظاہرہ نہ کیا گیا۔ اجازت کو کسی حد تک ہی تسلی لیکن معاشی سہارا بہر حال مل گیا تھا۔

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبر زیر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

| | | | | | |
|--------------|-------------------|--------------|------------------|--------------|-----------------|
| 0524568440 | سیالکوٹ | 03016215229 | گجرات | 03002680248 | کراچی |
| 03460397119 | میرپور AK | 03456892591 | دزیر آباد | 03004009578 | لاہور |
| 057210003 | انجمنی | 03216203640 | لالہ موسیٰ | 03006301461 | لکھنؤ |
| 03004059957 | دیپالپور | 03337472654 | خان پور | 03213060477 | حیدر آباد |
| 03002373988 | لیہ | 03325465062 | کوہاٹ | 03447475344 | سرگودھا |
| 03083360600 | قصبہ نگہ | 03446804050 | ساہیوال | 03005930230 | بٹالہ |
| 03008758799 | عارف والا | 03006946782 | پاک پتن | 03337805247 | گوردہ |
| 03023844266 | لورالائی | 03469616224 | مظفر آباد | 03006698022 | فیصل آباد |
| 03016299433 | کولہا ارب علی خان | 03347193958 | بوروالہ | 03335205014 | راولپنڈی |
| 03338303131 | جٹا پور پیر والا | 03136844650 | دہاڑی | 03003223414 | نواب شاہ |
| 03321905703 | ہری پور | 03346712400 | تونسہ شریف | 03009313528 | سکس |
| 03348761952 | چکوال | 03336481953 | ڈیرہ غازی خان | 03055872626 | رحیم یار خان |
| 03346393400 | دہوا | 03336320766 | بہاولنگر | 0622730455 | بہاولپور |
| 0323-6844650 | حافظ آباد | 03329776400 | بٹول شہر | 03316667828 | گوجرانوالہ |
| 0301-5497007 | دادو کیٹ | 03004719056 | رائے دٹر | 03235777931 | جہلم |
| 0992335847 | ایبٹ آباد | 03317400678 | ہڑپہ | 03008711949 | سیالکوٹ |
| 03454678832 | چوکی | 03349738040 | ڈیرہ اسماعیل خان | 0477626420 | جھنگ |
| 0333-5021421 | مانسہرہ | 03348761952 | چشتیاں | 03337979701 | بکھر |
| 03004992290 | کوٹ رادھا کشن | 0301-7681279 | منجھن آباد | 0331-7619788 | منڈی بہاؤ الدین |
| 0300-6575020 | قصور | 0333-8604306 | سمو ویال | 0300-9463975 | ڈیرہ |
| 0315-6565459 | ٹوبہ ٹیک سنگھ | 03006969881 | حجرہ شاہ مقیم | | |

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

کچھ سے مل میں بچے کے ذہن پر ناقابل تہدیل اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ہمارے کانوں میں جو پہلے جملے پڑتے ہیں۔ وہ ایک ماں کے الفاظ ہی ہوتے ہیں اور یہی ماں بولی زندگی بھر ہماری رگوں میں رواں رہتی ہے۔

دنیا میں آبادی کے 40 فیصد حصے کو اس زبان میں تعلیم نہیں دی جاتی جسے وہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے ایک تحقیق کی ہے۔ جس کے مطابق سرکاری زبانوں کے بڑھتے استعمال اور جدت نے ماوری زبانوں کو خطرات سے دوچار کیا اور اسی وجہ سے ماوری زبانیں محدود ہو رہی ہیں۔

ماٹیکریٹ (گلوبلائزیشن) کے عمل سے زبانیں شدید خطرات سے دوچار ہیں۔ جب زبانیں ختم ہوتی ہیں تو رسم و رواج، روایات، اخراج کی جہتیں، اظہار کے مختلف انداز اور ترقی کے خواب سب ختم ہو جاتے ہیں اس لیے کہ زبان کرۂ ارض پر انسان کی شناخت، مواصلات اور تعلیم و ترقی کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں بولی جانے والی کم و بیش 6500 زبانوں میں سے 43 فیصد ختم ہونے کے قریب ہیں۔ چند سو زبانیں ہی ایسی بچی ہیں۔ جراثیم اصلی حالت میں موجود ہیں اور ان کی نظام کا حصہ ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ زبانیں پانچویں میں بولی جاتی ہیں۔ جن کی تعداد 850 ہے۔ انڈونیشیا میں 700 جبکہ بھارت میں 300 سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بھارت میں سرکاری زبانوں کی تعداد 22 ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان چینی ہے۔ ہماری قومی زبان اردو کا نمبر ترتیب کے حساب سے 19 واں ہے۔

قوموں کے اس جھوم میں ہم سے ہماری شناخت، ہماری زبان جھین لی گئی۔ تہذیب و ثقافت میں اچھوت کا زہر کچھ اس طرح سے گھولا گیا کہ قاضیوں نے ہمارے نظام تعلیم کو دفن کیا۔ وہ جانتے تھے کہ مفتوح اقوام کی باقی ساخت کو نظام تعلیم میں تبدیل کر کے ہی بڑا جاسکتا ہے۔ ہمارے نصاب تعلیم سے ہماری تہذیب و شناخت کو جھین کر اسے قاضیوں نے اپنی تاریخی تھن میں دنگ دیے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ہمیں اپنے فریم میں نصب کر دیا۔ مقامی ماوری زبانوں کی جگہ چینی زبان نے لے لی۔ یوں ہماری اقدار اور روایات کمزور پڑتی گئیں۔ تعلیم کی اہمیت اور اس کی بہتری کے لیے بچے کے جانے

ثقافت کو اپنے نظریے سے نہیں جوڑیں گے، بہتری ممکن نہیں۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق بچے کے ماحول کی زبان میں اس کے شعور کو بچنے کی صلاحیتوں میں بہتری دینا ضروری ہے کہ اسے ماوری زبان میں ہی تعلیم دی جائے۔ دنیا کے کئی ممالک میں ابتدائی تعلیم ماوری زبان میں ہی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیونکہ بچے کے ذہن میں واضح الفاظ، آسان فہم اور زود اثر تعلیم کے لیے ماوری زبان کی اہمیت مسلم ہے۔ ماوری زبان میں دی جانے والی تعلیم کو بچے جلد سیکھ لیتے ہیں اور پھر روایتی ہے ان باتوں کو دہرا سکتے ہیں۔ ماوری زبان میں دی جانے والی تعلیم سے نہ صرف بچوں کا تعلیمی معیار بہتر ہوتا ہے۔ بلکہ بچے تعلیمی اداروں میں بھی جاتے سے نہیں گھبراتے۔ استاد کے لیے بھی سہولت ہوتی ہے۔ اسے بچوں کو پڑھانے کے لیے اضافی محنت نہیں کرنا پڑتی۔

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے جبکہ سرکاری زبان اردو اور انگریزی ہیں۔ پاکستان میں 56 اور 62 کے آئین میں اردو اور بنگالی کو قومی زبان قرار دیا گیا۔ جبکہ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے کے بعد 73ء کے آئین میں صرف اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا۔ 73ء کے آئین میں ہی پہلی بار پاکستان میں بولی جانے والی ماوری زبانوں کو ایک دستاویز کی صورت میں تسلیم کیا گیا۔ اس آئین میں پنجابی، سندھی، بلوچی اور براہوی کی سرکاری معاونت دینے کا آغاز ہوا۔ ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ پاکستان میں مختلف لہجوں کے فرق سے 70 کے قریب زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بڑی علاقائی زبانوں میں پنجابی، سندھی، سرائیکی، بلوچی اور براہوی شامل ہیں۔ جبکہ چھوٹی علاقائی زبانوں میں زیادہ معروف کشمیری، ہند کوہیا اور بھٹی زبانیں شامل ہیں۔ ان زبانوں کے علاوہ پاکستان میں مختلف علاقوں میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں سے کئی زبانیں بولنے والے لوگوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ پاکستان میں چترال و کٹنی نواح کے لحاظ سے بہت زرخیز کہا گیا ہے۔ اس چھوٹے سے خطے میں دس ماوری زبانیں بولی جاتی ہیں۔ چترال کے علاوہ بھی پاکستان کے بیشتر علاقے زبانوں کے لحاظ سے مالا مال ہیں۔ یہاں چار مختلف لسانی خانہ داری زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہند یورپی (اردو، پنجابی، سرائیکی، سندھی، پشتو وغیرہ) دروازوی (براہوی) چینی (مٹی و لکڑی) اور پروکسی (سان میں بہت سے زبانیں بولی جاتی ہیں)۔

سے تعلق رکھتی ہیں۔ پاکستان میں بولی جانے والی کم و بیش 70 زبانوں میں سے 27 زبانوں کو شدید خطرات ہیں۔ جن میں بھائی، بھائی، پورک، پھلور، کلاش، خوددار، بہادر وائی، کوہستانی، باگڑی، بدینا، رانیکھا، ڈوماکی، گوار، خوار، کنڈل، شانی، مری، چلو، سولی، سیٹی، شوروالی، اوٹو، جاذہ پٹا اور زکسکاری شامل ہیں۔ باوری یا پلاٹا جاتی زبانوں کو لاحق خطرات کے حوالے سے پاکستان دنیا میں 28 ویں نمبر پر ہے۔ پاکستان میں جہاں کئی زبانیں بولنے والوں کی تعداد گزشتہ برسوں میں رہ گئی ہے۔ تو ایک زبان ”بدینا“ ایسی ہے۔ جس کے بولنے والوں کی تعداد 3 رہ گئی ہے۔ بہت سی زبانیں ایسی ہیں جو آس پاس کی زبانوں کے غلبے تلے دب کر رہ گئی ہیں۔ کراچی میں قائم ”کھوار اکیڈمی“ چھوٹی بڑی زبانوں کو محفوظ کرنے کے لیے کام کر رہی ہے۔ یہ اکیڈمی چترال اور ملک کے دیگر خطوں کی باوری یا پلاٹا جاتی زبانوں کی ترقی و ترویج کے لیے کام کر رہی ہے۔

پاکستان میں محدودیت کے خطرے سے دوچار دور درجن سے زائد زبانوں میں سے چند ایک کا ذکر پیش خدمت ہے۔

براہوی: یہ زبان پاکستان میں وسطی بلوچستان کے اضلاع کوئٹہ، قلات، خضدار، مستونگ، بولان، نصیر آباد اور سندھ کے کچھ علاقوں (لاڑکانہ اور نواب شاہ کے اضلاع) میں بولی جاتی ہے۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ اس زبان کے بولنے والے ایران، افغانستان اور ترکمانستان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ براہوی ایک قدیم ترین زبان ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نیچے کے حوالے سے مشکل ترین زبان ہے۔ انگریز عہد میں برطانوی لوگوں نے برصغیر کی تقریباً تمام زبانیں سکھ لی تھیں مگر براہوی زبان کے حوالے سے کسی انگریز سے پوچھا گیا تو اس نے اپنے ایک انتہائی مشکل زبان قرار دیا اور کہنے سے معذوری ظاہر کی۔ براہوی زبان کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً 40 ہزار ہے۔ اس زبان میں کئی رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ تاہم ”نثار“ نام کا رسالہ 2004ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

بلتھی زبان پاکستان کے شمالی علاقے قلعستان اور کشمیر کے کچھ علاقوں کا رنگ، لہ و غیرہ میں بولی جاتی ہے۔ کشمیر کے بولنے والوں پر مشتمل ہے۔ اس زبان کی ترقی و ترویج کے

لیے بھی کام کیا گیا۔ یوسف حسین آبادی نامی شخص نے 1990ء میں ”بلتھی زبان“ کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کے بعد 1995ء میں انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ بلتھی زبان میں کیا۔ بلتھی زبان بولنے والوں کی تعداد تقریباً ساڑھے تین لاکھ ہے۔ آج بلتھی زبان شدید خطرات سے دوچار ہے۔ شمالی علاقہ جات کی جن زبانوں کو بچانے کے لیے یونیسکو سے اپیل کی گئی ہے۔ ان میں بلتھی زبان بھی شامل ہے۔

کالاشی: کالاشی زبان پاکستان کے شمال میں خلیج چترال کی وادی کالاش کے مختلف علاقوں پریر، بموریت اور دہر میں بولی جاتی ہے۔ کلاش، کالاش کی زبان ہے جو کہ گورکھ پند و کش میں آباد ایک قبیلہ ہے۔ چترال میں چھوٹی زبانوں کو خطرہ ہے۔ ان میں کالاش سرگرم ہے۔ کلاش بولنے والے اب کھوار اور دوسری زبانیں بولنے لگے ہیں۔ اس زبان کی بقاء کے لیے اس زبان میں لکھی گئی تحریروں کو محفوظ بنایا جا رہا ہے۔ یونیسکو نے کالاش اور اس کی ثقافت کو عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا ہے جس کے بعد امید کی جاسکتی ہے کہ اس زبان کی بقاء کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں گے۔ اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد 5 ہزار کے لگ بھگ ہے۔

کھوار: کھوار چترال میں بولی جانے والی ایک اور زبان ہے۔ چترال کی نسبت سے اسے چترالی بھی کہا جاتا ہے۔ کھوار کے لفظی معنی ہیں ”چترالیوں کی زبان“۔ یہ چترال کے ساتھ ساتھ گلگت بلتستان کے مختلف علاقوں وادی یاسین، پھنڈرہ، کشمیر، گوہس، سوات کے علاقے چھلان اور مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھی بولی جاتی ہے۔ تاہم ان علاقوں میں کھوار بولنے والوں کا بچہ مختلف ہے۔ کھوار زبان کو آدیہ، چمترادی، چو، قشکاری اور چترالی کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد 2 لاکھ 90 ہزار کے قریب ہے۔ لیکن چترالی زبانوں کے فروغ کے لیے قائم کردہ ادنیٰ تنظیم ”کھوار اکیڈمی“ کی حالیہ تحقیق کے مطابق پاکستان میں کھوار بولنے والوں کی تعداد 110 لاکھ تک ہے۔ اس زبان میں متعدد شاعروں وادوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ کھوار زبان میں سی دو بڑے اخبار بھی شائع ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک اخبار کراچی اور چترال سے مشترک طور پر نکلتا ہے۔ چترال کا نام ”کھوار اکیڈمی“ کی حالیہ تحقیق کے مطابق پاکستان میں کھوار بولنے والوں کی تعداد 110 لاکھ تک ہے۔ اس زبان میں متعدد شاعروں وادوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ کھوار زبان میں سی دو بڑے اخبار بھی شائع ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک اخبار کراچی اور چترال سے مشترک طور پر نکلتا ہے۔ چترال کا نام

وامیلی: یہ زبان خلیج چترال کی وادی ووسل میں بولی جاتی ہے۔ وادی ووسل کی نسبت سے یہ وامیلی زبان کہلاتی ہے۔ یہ وادی وریائے چترال کی مشرقی سمت میں ووسل سے دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں کے رہنے والے پشتو کو دوسری زبان کی حیثیت سے بولتے ہیں۔ کھوار اور اردو بھی بولی جاتی ہے۔ وامیلی زبان کے بولنے والوں کی تعداد 5 ہزار کے قریب ہے۔ اس تعداد کے بعد اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وامیلی کس حد تک محدودیت کے قریب ہے۔

گواربالی: گواربالی خلیج چترال اور افغانستان کی سرحد کے قریب بولی جاتی ہے۔ گواربالی کا لفظی مطلب ”گوار لوگوں کی زبان“ ہے۔ اسے مختلف ناموں نرسائی، نرسائی، گوار، آروند اور سارتر سے بھی پکارا جاتا ہے۔ گواربالی بولنے والوں کی تعداد تقریباً 9 ہزار ہے۔ جن میں سے صرف 15 سو پاکستان میں ہیں۔ جبکہ باقی ساڑھے سات ہزار افغان باشندے ہیں۔

گوروالی: یہ زبان کوہستان اور سوات کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ یہ گوروالی ان لوگوں کی زبان ہے جو دین سے آگے وادی اپر سوات کے پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ یہ دو بھوں کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد 85 ہزار کے قریب ہے۔

زنسکاری: زنسکاری بلتھی زبانوں کی لداخی، بلتھی شاخ سے نکلی ہے جو خاص طور پر جموں و کشمیر کے علاقوں کاگل اور لداخ میں بولی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے زیادہ محدودیت کے خطرے سے دوچار ہونے والی زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں کی اکثریت دریائے زنسکار اور دریائے ڈوڈھ کے کنارے پر آباد ہے۔ جبکہ زنسکاری بولنے والوں کی تعداد محض 12 ہزار ہے۔

کوہستانی: نام سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ غیر بھختوخواہ کے ضلع کوہستان کی زبان ہے۔ اسے اباسین کوہستانی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ کوہستانی زبان کو پلاٹا جاتی زبان قرار دینے کا مطالبہ چند دھارے۔ تاہم باقی زبانوں کی طرح یہ زبان بھی سرکاری

سرپرستی سے محروم ہے۔ کوہستانی بولنے والوں کی تعداد 2 لاکھ کے قریب ہے۔

باگڑی زبان زبانوں کے ہند یورپی خاندان کی راجستھانی، ہراواڑی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے بولنے والوں کی اکثریت بھارتی صوبے پنجاب، ہریانہ اور راجستھان سے تعلق رکھتی ہے۔ جبکہ پاکستان میں یہ بہاولپور اور بہاولنگر کے مختلف اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ بچہ لوگ اسے پنجابی زبان کا بچہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بھارت میں باگڑی اقلیتوں کی تسلیم شدہ زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً 20 لاکھ ہے۔

بدینا: یہ صوبہ خیبر پختونخواہ کی وادی چیل اور شہرام میں بولی جانے والی زبان تھی۔ ”تھی“ اس لیے کہ یہ زبان تقریباً محدود ہو چکی ہے۔ ماہرین کے مطابق 2018ء میں بدینا زبان بولنے والوں کی تعداد محض 3 تھی۔

سانکی: سانکی کسی مخصوص خطے کی زبان نہیں ہے۔ اس کے بولنے والے پاکستان اور ہندوستان میں رہتے ہیں۔ یہ پنجابی، ہندی اور مارواڑی زبان کے قریب بھی جاتی ہے۔ پاکستان میں 30 ہزار کے لگ بھگ لوگ یہ زبان بولتے ہیں جن میں سے اکثریت خاتہ بدوشوں کی ہے۔

زبان کسی بھی قوم کی ثقافت، زندگی گزارنے کے ڈھنگ اور فلسفوں کی وراثت کی اہم ہوتی ہے۔ قدیم باوری زبانوں کا جدید زبانوں سے دب جانا ایک ارتقائی عمل کا حصہ ہے۔ تاہم اس کے نتیجے میں قدیم علوم و ثقافت اور باوری زبانوں کی میراث پرستی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ زبانوں کی بقاء اور حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ قدیم علوم اور باوری زبانوں کو آئندہ فلسفوں میں کچھ اس طرح منتقل کریں کہ ان کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ یہ کام مربوط اجتماعی جدوجہد سے ہی ممکن بنایا جاسکتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ریاست کے ساتھ ساتھ عوام بھی اپنا کردار ادا کرے۔ میڈیا کے مختلف شعبوں فلم، ٹی وی، ریڈیو اور سوشل میڈیا سے مدد لی جانی چاہیے۔ کیونکہ میڈیا کے ان چاروں شعبوں کا انسانی زندگی میں بہت زیادہ دخل ہے۔ ہر بھی دیکھنا ہوگا کہ زبان بولنے والے



Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

تیسرا حصہ

شہزاد اکبر 2022ء سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آپ کو بہت زیادہ پسند آئے گا



بقلم خود

منظر امام

ایک ایسا سلسلہ جو خود میں منفرد ہے۔ آپ جن قلمکاروں کی تحریریں پڑھتے ہیں ان کے قلم سے انہی کی سرگزشت۔ ایسے واقعات، سانحات جو آپ کو تحریروں میں ڈال دے۔ زندگی کے پہلوؤں کا تذکرہ، وہ باتیں جو عام طور سے بتائی نہیں جاتیں، جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔ اور ایسی تحریریں صرف "سرگزشت" میں ہی شائع ہوسکتی ہیں۔ جسے آپ مجاہد کراکر رکھنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

اس بار صرف کہانی کا کردار اور اس کا منظر نامہ کی زندگی کے فیض کو شے ملاحظہ کریں

میں اور بین خان ناظم آباد کسی کے گھر آئے تھے۔ اس گھر میں فلم دکھائی جا رہی تھی۔ اس زمانے میں وہی سی آر وغیرہ تو تھا نہیں۔ فلمیں اسکرین پر پروجیکٹر کے ذریعے دکھائی جاتیں۔ لاہالی پن کے دن تھے۔ ہم بھی فلم دیکھنے بیٹھ گئے۔ میرے پاس چمڑے کا ایک بیگ تھا جس میں کچھ سناپیں رکھی ہوئی تھیں۔ بہر حال رات دن ساڑھے دس بجے فلم ختم ہوئی اور ہم واپس جانے کے لیے لیبیل کے اسٹاپ پر آ گئے۔ یہ اسٹاپ ایسا نہیں تھا جیسا آج کل ہے بلکہ ویران تھا، دو چار دکائیں تھیں اور اس وقت وہ بھی بند ہو چکی تھیں۔

اسٹاپ پر ایک لڑکی اپنی ماں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں ایک چمڑا تھا۔ اس لڑکی کے ارد گرد منہ لارہے تھے۔ کوئی کالونی نہیں لگتی تھی۔ اس نے بتایا۔

دکھائی ہو رہی تھی۔ مکمل سٹاٹ تھا۔ لڑکی کو پریشانی میں دیکھ کر دونوں کے دلوں میں قوی خدمت کا جذبہ جاگ اٹھا۔ جو عموماً ایسے موقعوں پر جاگ جایا کرتا تھا۔ ہم دونوں نے آپس میں مشورہ کیا اور ان دونوں کے پاس پہنچ گئے۔ ایسے موقعوں پر گفت و شنید کے لیے بہن چھٹے آگے کر دیا کرتا تھا کیونکہ میں سلیپ سے بات کر لیتا تھا۔

"دیکھیں۔ آپ دونوں یہاں کھڑی نہ رہیں۔" میں نے اس عورت سے کہا۔ "یہ جگہ اچھی نہیں ہے اور آپ کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔ میں تو خود یہاں آ کر بیٹھتا رہی ہوں۔"

"فردوس کالونی میں۔" اس نے بتایا۔

چاروں طرف سے گھبرا جا رہا ہے۔ دو آدمی دائیں طرف تھے۔ دو بائیں طرف۔ دو پیچھے چل رہے تھے۔ اس وقت ہم بہت بری طرح خوفزدہ تھے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور سڑک کے درمیان آگئے۔ اس وقت ہمارے ذہن میں یہی آیا تھا کہ فٹ پاتھ کی بجائے سڑک پر چلتا شروع کر دیں۔ شاید اس طرح کچھ بچت ہو جائے۔ ہم سڑک پر آئے تو مختلف سمت سے ایک گاڑی آتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ ہم نے یاگوں کی طرح ہاتھ ہلاتا شروع کر دیا۔ وہ گاڑی ہمارے قریب آ کر روک گئی تھی اور اتفاق سے وہ ایک عیسائی تھی۔ اس بے چارے نے بھی شاید صورت حال کی نزاکت کو محسوس کر لیا تھا کسی لیے اس نے ہمارے لیے جلدی سے دروازہ کھول دیا تھا۔ ہم جیسے ہی عیسائی میں بیٹھے اس وقت ہمیں گھبرنے والے لوگ عیسائی کی طرف جھپٹ پڑے۔ ان کا ارادہ اس عیسائی کو روک لینے کا تھا لیکن ڈرائیور نے تیز رفتاری سے عیسائی آگے بڑھا دی تھی۔

ہم دونوں نے اسے اپنے اوپر گزرنے والی داستان سنائی تو اس نے ازراہ ہمدردی ہمیں نرسری کے اسٹاپ پر لا کر چھوڑ دیا۔ اس نے کہا تھا کہ یہاں سے لیمو کی طرف گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی گاڑی میں نشت مل جائے۔ ہمارے ذہنوں پر دھند سی طاری ہو گئی تھی۔ ہم نے کہاں ایسے حالات کا سامنا کیا ہوگا۔ ہر قدم اور ہر موڑ پر ایک مصیبت ہمارے سامنے آ رہی تھی۔ ایک انجمن سے نکلتے تھے کہ دوسری انجمن سامنے آ جاتی تھی۔ ہم نرسری کے اسٹاپ پر ابھی آ کر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ ایک وین ہمارے پاس آ کر روک گئی۔ کڑوکی کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے ہمیں مخاطب کیا۔ ”ہاں بھئی۔ کہاں جانا ہے تم دونوں کو؟“ اس نے دریافت کیا۔

”جی۔ ہمیں لیمو جانا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”چلو بیٹے جاؤ۔“ اس نے کہا۔ وین کا پچھلا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا گیا۔ پہلے تین انگریز لیمو میں۔ بعد اسی کا یہ عالم تھا کہ ہم نے وین کے مسافروں پر دعائیں بھی بھیج دیں۔ لیکن کچھ دیر بعد تین نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”منظر ذرا پیچھے سے دیکھو۔“

نشت پر تین آدمی بیٹھے تھے اور ان تینوں نے اپنے چہروں پر ڈھانچے باندھ لیے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں وہ کچھ بھی تھے۔ ہم نے انہیں دیکھ کر اپنے آپ پر فاتحہ پڑھ لی تھی۔ اب شاید نکلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہم فوراً ہی ان کے چنگل میں جا پھنسے تھے۔ میں نے دروازے کی پینل پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ نکلیں بھی گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دوں گا۔ چاہے جو بھی ہو۔

سفر کرتے ہوئے ہم ڈرائیور روٹ تک آگئے۔ یہاں میں نے ان سے درخواست کی کہ گاڑی روک دیں۔ ہمیں اتارنا ہے لیکن گاڑی نہیں روکی گئی۔ پھر نہ جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ لیمو ہالٹ کے پاس گاڑی روک دی اور ہماری بیبوس کی حفاظت لینے ہوئے جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ سب لے لیا۔ غنیمت یہ ہوا کہ انہوں نے ہماری جان بخش دی تھی۔

وین کے جانے کے بعد ہم ہونٹوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیے بعد دیگرے ایسے واقعات کیوں ہو رہے ہیں۔ کیا عجیب ہے۔ اس زمانے میں لیمو ہالٹ بھی ایک کم آبادی والا علاقہ ہوا کرتا تھا۔ اسٹیشن کی دوسری طرف رتاج عام سوسائٹی تھی جہاں بہت کم مکانات بنے ہوئے تھے۔ آج کل تو وہ ایک گنجان آبادی والا علاقہ ہے۔ ریلوے اسٹیشن کی دوسری طرف ایک جمو پٹری بنی ہوئی تھی۔ ہم دونوں بقیہ رات گزارنے کے لیے اسی جمو پٹری میں داخل ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ شاید بے درجے حادثات کا سلسلہ رک گیا ہے لیکن ابھی ایک اور اتفاق باقی تھی۔ ہوا یہ کہ اچانک چور چور کی آوازیں بلند ہونی شروع ہوئیں اور ایک آدمی دوڑتا ہوا اس جمو پٹری میں داخل ہو گیا جس میں ہم موجود تھے۔ شاید وہ چور تھا جس نے کسی مکان میں چوری کی تھی، لوگ اس کا تعاقب کر رہے تھے اور اس کم بخت کو بھی وہیں آتا تھا جہاں ہم جیسے ہوئے تھے۔

اس زمانے کے چوروں کے پاس اسلحہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ بہت ہوا تو ایک آدھ چاقو وغیرہ اپنے پاس رکھ لیا اس لیے لوگ بھی حملے سے کام لے کر ان کا تعاقب کیا کرتے اور انہیں پکڑ بھی لیتے تھے۔ یکے آج ہوا کرتے ہیں اور وہ بھی جدید اسلحوں سے لیس جو پورے

کے بارے میں غائب ہو گئے ہیں۔ اس زمانے میں راتیں ٹھنڈے کے لیے ہوا کرتی تھیں لیکن آج جو کچھ ہوتا ہے دن کی روشنی میں ہوتا ہے۔ خیال ہے کوئی آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ روک سکے۔

خیر، تو یہ اس رات کی آخری سوغات تھی۔ محلے والے چور چور کرتے شور مچاتے برابر سے گزرتے چلے گئے اور ہم دونوں اس جمو پٹری میں دم سادھے بیٹھے رہے۔ یہی حال اس تیسرے کا بھی تھا۔ وہ یقیناً وہی چور ہوگا۔ بہر حال کچھ دیر بعد وہ چور بھی موقع پا کر اس جمو پٹری سے بھاگ نکلا۔ اور چادری جان میں جان آئی۔ انتظار کرتے رہے، وقت گزرتا رہا اور صبح ہو گئی؟ ہم لیمو ہالٹ سے پیدل اپنے گھر چلے آئے۔

یہ رات ہمیشہ یاد ہے۔ ہاں ایک رات اور بھی یاد ہے۔ چائیں، واقعات ہمارے تعاقب میں کیوں رہتے ہیں۔ کیا جانتے ہیں ہم۔ ہمارا یاد مرحوم سراج منیر کراچی سے لاہور جا رہا تھا، وہیں آباد ہونے کے لیے۔ ہم نے اس کے ساتھ دو دیگر وہ سردرات گزار دی جو آج تک یاد ہے۔ یہ نشت اور دن رائے کے گھر بلکہ آگن میں ہوئی تھی۔ میں انور من رائے، شوکت عابد، شروت حسین، احمد جاوید ساری رات الاؤ روشن کیے بیٹھے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو لپیٹے سناتے رہے۔ شاعری ہوتی رہی۔ ایک دوسرے کو کھینچنے کی کوشش کرتے رہے۔

خدا یا وہ دن کتنے خوبصورت تھے۔ چھڑ جانے والے دن ہمیشہ خوبصورت ہی ہوا کرتے ہیں اور خاص کر وہ دن جو ایسے لوگوں کے ساتھ گزرے ہوں۔ ایسے محبت کرنے والے لوگ اب کہاں ہیں۔ اب کوئی ملتا بھی ہے تو ایک کمرشل مسکراہٹ کے ساتھ۔ اب یہی معیار ہے کہ کون کس کو کتنا ناکہ پہنچا سکتا ہے۔

حالانکہ وہ زمانہ ہمارے مالی اعتبار سے بہت خراب تھا۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود ایک سرشاری، ایک ترنگ کی کیفیت رہتی تھی۔ کسی قسم کے اندیشے ہمارے قریب نہیں آتے تھے۔ زندگی بہت آہستہ خرام اور پرسکون تھی۔

میں نے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی۔ شاعری بھی کر رہا تھا لیکن ڈرامے ابھی تک نہیں لکھے تھے۔ لیمو آنے جانے والوں میں سید ساجد بھی تھا۔ ایک بے ضرر سا انسان۔ معصوم سا۔ جسے بارہ چودہ سال قبل گولی مار کر

شہید کر دیا گیا۔ شہر صد کارنامہ ایم ایم سید سید سید کے چچا ہوا کرتے تھے۔ سید ساجد نے ہی میری ملاقات ایم سلیم صاحب سے کروائی تھی اور ان ہی کی رہنمائی میں میں نے ریلوے کے لیے سیلا ڈراما تحریر کیا تھا۔

وہ زمانہ ریلوے کے عروج کا تھا۔ کیسے کیسے لوگ ریلوے اسٹیشن میں نظر آیا کرتے۔ سلیم احمد مرحوم مقرر تھیں صاحب، رضی اختر شوق، ایوب خاور، نقاش کاکھی، یہ سب کے سب ریلوے کے روشن چراغ تھے۔

لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے بھی پہلے زندگی کو کچھ اور مسئلے بھی ملے کرتے تھے۔ ممتاز رفیق مرحوم سے اس زمانے کی دوستی ہے، اس شخص نے بھی مجھ زندگی گزار دی ہے۔ انگریزی انگریزی سی۔ میں اس کے اور اس کے گھر والوں کے بہت قریب تھا۔ اس کے والد کو والد اور والدہ کو والدہ ہی کہا کرتا تھا اور وہ بھی اتنی ہی محبت کیا کرتے۔ میں اس کے یہاں رات کو روک جایا کرتا تھا۔ بغیر کسی جھجک کے۔ بالکل اپنے گھر کی طرح اور اس کا گھر بھی بالکل خانہ بے تکلف ہی تھا۔ جہاں جی چاہے سو رہا اور جو میسر ہو وہ کھاؤ خدا کا شکر ادا کرو۔

یادوں کا ایک انجم ہے۔ نہ جانے کتنے چہرے ہیں جو یادداشت کی سطح سے جھانک جھانک کر میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ شاہ فیصل کالونی میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک مجمع لگا رہتا تھا۔ مختار رحمت، طاہر مسعود (جو آج کل جاسد کراچی میں ہیں)، شفیق الزماں (درائٹر گلڈ والے)، روشن خیال (حمایت علی شاعر کے صاحبزادے اور بخدی کے کما خیر) اور پیارے بھائی کا ہوٹل۔

پیارے بھائی کا ہوٹل ہم سب کی زندگی کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ وہ بھائی ہوا کرتے تھے۔ پیارے بھائی اور چاند بھائی۔ چھوٹا سا ہوٹل۔ جس کے اوپر دو چھتی بنی ہوئی تھی۔ میں، احمد جاوید، سراج منیر، ممتاز رفیق سب کے سب اسی ہوٹل میں جمع ہو کر ایک دوسرے کو اپنی شاعری سنایا کرتے اور پیارے بھائی ہم سب کو ادھار چائے پلاتے رہتے تھے۔ اس شخص نے بھی ہم سے بیسیوں کا تقاضہ نہیں کیا بلکہ احمد جاوید کے لیے تو ایک عرصے تک صبح کا ناشتا بھی پیارے بھائی ہی فراہم کیا کرتے تھے۔ احمد جاوید کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ لوگوں کو فوری طور پر اپنے اوپر مہربان کر لیا کرتا۔ لوگ اس کی شخصیت اور ذہانت سے مرعوب ہو کر اس کی خاطر تواضع

کیا کرتے۔ اس کا خیال رکھتے اور وہ اپنے دوستوں کے درمیان ایک نمایاں انداز سے زندگی بسر کیا کرتا۔

کپانی بیان کرنے کی تکنیک بھی ہے کہ واقعات ایک روانی ایک تسلسل کے ساتھ دہرائے جائیں لیکن جب یادداشت ہی ابھی ہوئی ہو۔ اس وقت واقعات ایک تسلسل میں نہیں رہتے۔ شری پرچوں کی طرح اچھل کود کرتے رہتے ہیں۔ کبھی آگے کبھی پیچھے۔ کبھی کوئی اور سامنے آ گیا۔ کبھی کسی دوسرے چہرے نے اٹھنا جگہ بنائی۔

طبر کا وہ دور بہت اچھا تھا۔ یا شاید ہر ایک کو وہ دور اچھا لگتا ہے جس کو وہ گزار دیا ہو۔ جہاں ڈھیر سی یادیں ہوں۔ چلتے دکتے چہرے ہوں۔ میں یہ بھگتا ہوں کہ شاید ہم ہی لوگوں نے خوبصورت بچپن گزارا ہے۔ جب چاند کو دور سے دیکھ کر اس سے باتیں کی جاتی ہیں۔ جب بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانیوں سے محسوس خوف محسوس کیا جاتا ہے اور شاید ہم ہی خوش قسمت رہے ہیں کیونکہ ہماری اولاد کو وہ لطف حاصل نہیں ہے لیکن موجودہ نسل کی ایک سمجھ دار لڑکی نے بڑی خوبصورتی سے یہ بات سمجھا دی کہ ہر عہد کے نقائص ہوا کرتے ہیں۔ آج کے بچوں کو ویڈیو۔ فلم اور موبائل میں وہی لطف اور سکون ملتا ہے جو آپ لوگوں کو اپنے دور کی تقریبات میں ملتا تھا۔

پتا نہیں ہم گمانے میں رہے یا ہماری اولاد گمانے میں ہے۔

طبر میں شاعروں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی (شاید آج بھی ہو) ہر ہفتے شاعرے ہوا کرتے۔ باقاعدہ استاد ہوا کرتے تھے۔ ایک صاحب اور بھی بہت اچھی طرح یاد ہیں اور وہ تھے ڈاکٹر تنویر برنی (مرحوم) جو شاعری کیا کرتے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ہم جیسوں کا ہر طرح خیال بھی رکھا کرتے تھے۔ ہم نے قرض لینے کے لیے ایک اصطلاح ایجاد کی تھی۔ ”شرمندہ ہونا“۔ میں اور احمد جاوید اکثر ان سے شرمندہ ہوا کرتے تھے۔ ان کا کلینک چمن کالونی میں تھا۔ جہاں حائفہ ڈاکٹر بھی ہوا کرتے تھے۔ تاجنا ہونے کے باوجود وہ اپنا رزق قلم کی مزدوری سے حاصل کیا کرتے۔ بشرق اخبار میں ان کا ایک کالم شائع ہوا کرتا تھا۔ ”یار باش“۔ ”نزدہ دل انسان تھے۔ میں اور جاوید روز شام کو ڈاکٹر تنویر برنی کے یہاں ملے جایا کرتے۔

مستقل انتظام رکھتے تھے اسی لیے ایک بار جاوید نے ان کے لیے ایک مگرگٹ لٹا قصیدہ تحریر کیا تھا۔ جس کا ایک مصرعہ آج تک یاد ہے۔ ”بریس درود یوار سے وڈ ہائٹن کے پکٹ“۔

ڈاکٹر برنی بہت لہک لہک کر اشعار سنایا کرتے اور وادطلب لگا ہوں سے ہماری طرف دیکھتے رہتے تھے۔ ان کے ایک قلع کا ایک مصرعہ آج بھی ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آتا ہے۔ کیونکہ ہم آج تک اس قلعے کے ملبوم کو کبھی نہیں دیکھے ہیں۔ وہ مصرعہ تھا۔ ”صرف حالی نے معصیت میں خدا کو سمجھا۔“ پتا نہیں اس بیان سے ڈاکٹر صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ میں اور جاوید اکثر اس کے مفہوم پر بحث کیا کرتے۔ ”یار۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صرف حالی نے خدا کو سمجھا ہو۔ آخر اور بھی تو لوگ ہوں گے۔“ ہم بحث تو کرتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کی ناراضگی کے خیال سے ہم نے کبھی اس کا مفہوم معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اس دلچسپ محبت سے بہت پہلے ایک اور شخص یا دوست مجھے ملا تھا۔ جس کے ساتھ بھی بہت دلچسپ واقعات کی ایک بھینڑ لگی ہوئی ہے اور وہ ہے آفتاب۔ وہ میری سنی بچانازاد بہن کا چنانا ہے (آج کل موصوف امریکا میں آباد ہیں) میں نے آفتاب کے ساتھ بھی بہت دلچسپ اور شرات سے بھرے ہوئے دن گزارے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس جیسا ہم پسند شخص آج تک نہیں دیکھا۔ سر پر بڑے بڑے بال۔ ٹینک لگائے ہوئے۔ خوش لباس اور جب زبان۔ دو جھ سے بہت محبت کیا کرتے اور جب وہ میرے گھر آتا۔ ایک نئی تقریح اور ایڈ وچر کے دو دائرے واہو جایا کرتے۔

میں نے اپنی زندگی کی ابتدا اس کے ذریعے کی تھی۔ یعنی معاشی جدوجہد اس کا قیام ہمارے نام آباد میں تھا اور یہ کسی عجیب بات ہے کہ آج میں اسی جگہ مقیم ہوں جہاں بھی اس کا گھر ہوا کرتا تھا۔ اس نے ہمارے عالم آباد میں میرے لیے ٹیوشن کا بندوبست کروایا تھا۔ میں طبر سے روزانہ ٹیوشن پڑھانے ہمارے نام آباد میں آتا اور اس دوران ایسے ایسے دلچسپ واقعات رونما ہوتے کہ آج بھی ان کی یادیں دل میں گدگدیاں پیدا کر دیتی ہیں۔

دوسری ٹیوشن کی۔ غزالہ ہمارے نام آباد میں اور ٹیوشن کا قیام آباد

میں۔ ٹیوشن ایک دھنگ رنگ لڑکی تھی۔ بہت خوبصورت اور بہت جلدی ناراض ہو کر نہ چلا لینے والی۔ اس کو پریشان کر کے مجھے بہت لطف آیا کرتا۔ وہ ٹی وی کے ڈرامے دیکھنے کی بہت شوقین تھی۔ میں اگر وقت سے پہلے ہی فلم آباد بھی جاتا تو ادھر ادھر محکم پھر کر ڈراما شروع ہونے کا انتظار کرتا رہتا تھا اور جیسے ہی ڈراما شروع ہوتا تو میں اسے پڑھانے لگتا تھا۔ اس کے گھر والے زبردستی اسے میرے پاس بھیج دیا کرتے اور وہ کبھی چھٹی پاؤں چٹائی میرے سامنے آکر بیٹھ جاتی۔ اس وقت غصے سے تھکایا ہوا اس کا چہرہ دیکھنے کے قابل ہوا کرتا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

غزالہ شاید اس سے زیادہ خوبصورت تھی اور وہ میرا بہت خیال رکھا کرتی۔ اسے احساس ہو جاتا تھا کہ آج میری عیب میں بیٹھے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے مجھے پیسے دے دیتا کرتی۔ (میں نے اپنے افسانے ”صلاح الدین فاروقی حاضر ہو“ میں غزالہ ہی کو سامنے رکھا ہے) ٹیوشن چھوٹ جانے کے بعد غزالہ سے میری آخری ملاقات بہت ہی عجیب انداز سے ہوئی تھی اور یہ بھی آفتاب میاں کی عنایت تھی۔ یہ واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس زمانے میں شادی پال وغیرہ نہیں ہوا کرتے

تھے۔ شادیاں گھروں یا گھنڈوں وغیرہ میں ہوا کرتیں۔ شاید ہمارے نام آباد میں کچھ زیادہ ہی شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ آفتاب کے پاس پوری لسٹ ہوا کرتی۔ آج فلاں جگہ شامیانہ ہے۔ آج فلاں جگہ دوسرے ہے اور ہم ٹیوشن سے فارغ ہو کر کسی ایک جگہ ملنے اور بڑے اعتماد اور دھڑلے کے ساتھ کسی کی بھی شادی میں شریک ہو جاتے۔ کوئی بھی دریافت کرنے والا نہیں ہوتا تھا کہ ہم کون ہیں اور کس کی طرف سے دعوت میں شریک ہو رہے ہیں۔

البتہ ایک موقع پر بہت سکی ہوئی تھی۔ کھانا کھانے والا شاید بہت ہی کٹیاں محض تھا۔ اس نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ ہم دونوں بن بلائے مہمان ہیں اکیلی لیے اس نے ہمارے قریب کھڑے ہو کر ایک دوسرے شخص سے کہا۔ ”فقور بھائی۔ ذرا پھر جا کر دیکھو شاید اور بھی دو چار مسکین کھانا کھانے آئے ہوں گے۔“ ذرا ان کو بھی بلاؤ۔ مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ بھری ہوئی پلیٹ ہاتھ میں تھا۔ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے اور کھانا بھی نہیں سکتے تھے۔ بہر حال کھاتے چلے گئے کیونکہ جو بے عزتی ہوئی تھی وہ تو ہو چکی

کھانا کے بار

ملن کی آس میں دو ٹوٹے ہوئے دلوں کی
دنگلدارستان۔ آخری سفلیت پر
یعقوب بھٹی کے قلم کا جاوہر

داستان دلستان
ہاشمی کا آئینہ، ہاتھیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز
اور عبرت آمیز واقعات **ایسے آرا جیوت** کا شاہکار

شہ زوہ
عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور
کیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

جنگ باز
معاشرتی ماسوروں اور دہندوں کی خوں ریز سازشوں
اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ ازکی دلدرد داستان
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم کی جاوہر

دسمبر 2022 کا شمار ایک نظر میں

خوبصورت کہانوں کا مجموعہ



مزرا بھٹی کی کتاب

ڈاکٹر سلطان اختر، فاطمہ حسام، عائشہ نصیر، عبید بخاری،

شاہ سنن، صائمہ دانش، امینہ بھٹی، امینہ بھٹی

دسمبر 2022

تھی۔ آفتاب میاں ان معاملات میں اپنا جواب نہیں دیتے تھے۔ اس کی ایک خوبی اور بھی تھی کہ وہ چڑی جانے پر مڑی نہ جانے والے اصول کا جذبہ تھا۔ مجال ہے جو ایک پالی بھی زیادہ خرچ کر جائے۔ ایک بار اس نے ایک ہوٹل میں دو دوستوں کی دعوت کی اور صرف ایک جانے منگوائی۔ یہ سائل نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ صرف ایک جانے جس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ وہ شخص رمضان کی انتظار میں مسجد میں کیا کرتا کیونکہ وہاں بہت سے لوگ افطار پانا بھجوا کرتے تھے۔

میں نے عرض کیا۔ ”مگر شام گریں ہو جائے۔ تب بھی یہی ہوگا۔“

”ہاں۔ ہوگا تو نہیں لیکن اس کی نوعیت کچھ اور ہوگی۔ وہ تمہارے علاوہ کسی اور کو ٹھوکر نہیں گے۔ اس طرح ٹیشن کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ یعنی ٹیوٹر برادری کا بھلا ہوتا رہے گا۔ تم کو کسی اور کی ٹیشن مل جائے گی۔ کوئی اور تمہاری ٹیشن پڑھانے لگے گا۔“

اس آفتاب نے ایک بار ایک بہت ہی عجیب شخص سے میری ملاقات کروائی۔ وہ کردار آج تک میرے ذہن پر نقش ہے اور جب یاد آتا ہے تو میں سوچتا ہی رہ جاتا ہوں کہ انسانی حراں اور کردار کے سنے پہلو ہوتے ہیں۔ آفتاب نے مجھے صدر کے ایک ہوٹل میں آنے کا وقت دیا۔ ”بھڑے ضرور آ جانا۔ تمہاری ملاقات ایک ایسے آدمی کے کراؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔“

میں نے اس سے اس آدمی کے بارے میں معلوم کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بہر حال میں مقررہ وقت پر اس ہوٹل میں پہنچ گیا۔ جہاں آفتاب کے ساتھ ایک کھل منول سا گھڑے سا نولہ رنگ کا ایک ادھر عمر شخص بھی موجود تھا جس نے بہت لہک کر مجھ سے ہاتھ ملا یا تھا۔ ”آئیں جناب۔ تشریف لائیں۔ آپ کا وقت ذکر ہوتا رہتا ہے۔ یہ آفتاب صاحب آپ کی بہت قدر کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ آپ کو ادب سے بھی شوق ہے۔“

”جی ہاں۔ بس تھوڑا بہت لکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔“ میں نے انکساری سے کہا۔

کر دیتا رہتا ہوں تاکہ کوئی کام کی کتاب مل جائے تو ہر قیمت پر حاصل کر لیتا ہوں۔ میرے پاس کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ آپ بھی غریب خانے تشریف لائیں تو میں آپ کو اپنی لائبریری دکھاؤں گا۔“

”آپ کا مشغلہ کیا ہے؟“ میں نے یوں ہی پوچھا۔

”ارے صاحب۔ آپ جیسے لوگوں کی خدمت۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں ادیبوں اور شاعروں کی فرسٹیشن قائم کرتا ہوں۔ انہیں زندگی کا احساس دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بس آپ کسی دن بغیر کھلے میرے یہاں تشریف لے آئیں۔“

میں نے دیکھا اس وقت آفتاب معنی خیز انداز سے مسکرا رہا تھا جبکہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آدمی کون ہے اور اپنی شدت سے اپنے گھر آنے کی دعوت کیوں دے رہا ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آفتاب سے اس کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے بھی یہی کہا کہ جب تم اس کے گھر جاؤ گے تو خود ہی ہاتھ پھیل جائے گا۔ اس شخص کا گھر تین مٹی اور پی آئی بی کالونی کے درمیان نئی کنارے تھا۔ ایک دن آفتاب ہی مجھے وہاں لے گیا تھا اور وہاں جا کر ہاتھ چلا کہ وہ موصوف واصل اپنی سالیوں اور بیٹی کے ذریعے ادیبوں اور شاعروں کی خدمت کیا کرتے ہیں۔ وہ ایک دلالت تھا لیکن اس جیسا مہذب اور ادب نواز دلال میں نے بھی نہ دیکھا نہ سنا۔ کمال کا کردار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس طرح خدمت خلق کر رہا ہے۔ آفتاب نہ جانے کہاں کہاں سے ایسے لوگوں کو تلاش کر لیا کرتا تھا۔

اس زمانے میں آفتاب کے ساتھ ایک اور تفریح بھی تھی۔ وہ جی امریکا یا یورپ وغیرہ جانے کی خواہش۔ آفتاب کے جانے والوں میں ایک نوجوان ہوا کرتا تھا۔ بہت اہماری سا۔ ہاتھ میں ایک عدد برف کیس لیے ہوئے۔ روانی سے انگلیں بولتا ہوا۔ بہت سے نوجوان اسے سمجھتے رہتے اور وہ نوجوانوں کو یورپ جانے کے طریقے بتاتا رہتا تھا۔ یہ ہنکھٹا ہوئی جہیں میں ہوا کرتا تھا۔ آفتاب بھی اسی زمانے میں باہر جانے کی خواہش میں جلا تھا۔ ہم شام کے وقت ہوٹل میں آ جاتے۔ جہاں بہت سے نوجوان بیٹھے ہوتے اور وہ اہماری سا بندہ انہیں سنتا کرتا تھا۔ بہت سے نوجوان باہر جانے میں کامیاب بھی

ہو گئے تھے۔ لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ خود وہ باہر جانے میں ناکام رہا تھا۔

ہم خوابوں کے درمیان غرق رہتے تھے۔ اچھے دنوں کے خواب۔ عجیب پہلو دار زندگی تھی۔ ایک طرف تو ادبی سرگرمیاں، دوست، شہناز سے عشق۔ دوسری طرف آفتاب۔ اس کے ساتھ گزرنے والے دلچسپ لحاظ اور باہر جانے کی ایک ایسی خواہش جو آدھی اور طوفان کی طرح بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ میری کہانی ہے یا ان کرداروں کی جو میرے ارد گرد موجود تھے۔ جن کے ساتھ وہ کر میں نے تجربات حاصل کیے۔ میرا خیال ہے کہ شاید میری کہانی۔ دراصل دوسرے کرداروں کی توجہ اور ان کی نسبت سے عمل ہوئی ہے۔ یہ کردار نہ ہوتے تو میری اپنی داستان بھی نہیں ہوتی۔ کسی بھی شخص کو مکمل کرنے میں یہی کردار اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اس کی کہانی کو اس کے منطقی انجام تک پہنچاتے ہیں۔

میں اس زمانے میں جس ناز میں ملازمت کر رہا تھا جب احمد جاوید سے میری ملاقات ہوئی۔ میرا ایک بیگزینٹ ہو گیا تھا۔ اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک بار میرے دوست جمیل انظر سے میرے دفتر آئے۔ اس زمانے میں ان کے پاس ایک پائیک ہوا کرتی تھی۔ میں نے دفتر سے چھٹی کی اور ہم دونوں پائیک پر دروازہ ہو گئے۔ بس وہ حادثہ وہیں پیش آیا۔ میری ایڑی پائیک کی زنجیر میں آکر کٹ گئی تھی۔ میں کئی مہینوں تک بستر پر پڑا رہا تھا۔

اسی دور ان ایک دن مرحوم ثروت حسین، احمد جاوید کو میرے پاس لے کر آئے تھے۔ کرتا جا رہے میں۔ ابھی موجود نہیں تھے لیکن جمیل۔ سانولا رنگ لیکن اس کی پوری شخصیت میں سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں۔ چھٹی ہوئی، شعلہ دہنی ہوئیں زبانت سے بھرپور آنکھیں۔ میں نے ایسی سحر کرنے والی آنکھیں کم ہی دیکھی ہوں گی اور اس کے منہ پر کچھ نہ لکھ کر گفتگو کرنے کا ایک خاص انداز، یہاں ملاقات میں جہاں اس کی ذہانت اور عیبت کا اندازہ ہو گیا وہاں یہ بھی چاہل کیا کہ بس یہی میرا دوست ہے اور شاید دوستی میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے اس کے لیے تفصیلی ملاقات یا گفتگو کا ضرورہ نہیں ہوتی۔ بس ایک لگاؤ۔ ایک چل کا

میرا اور جاوید کا تفریق ایک جیسا تھا لیکن اب وہ راہ سفر میں بہت آگے چلا گیا ہے۔ وینا اس کے پردے میں آباد ہے لیکن اس نے اس ذیل سے دوستی ترک کر دی ہے۔ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں ہے۔ جبکہ میں۔ میرا تو حال کچھ عجیب ہی ہے۔ سرے پائیک ملاقات میں تھرا ہوا ہوں۔ اپنے آپ سے شرم سار ہونے لگا ہوں۔ پتا نہیں یہ کیا حراں پایا ہے۔ زندگی مجھے اپنی طرف نص کی صورت کھینچتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بس ایک جذبے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہی حال جو پہلے قادی آج بھی ہے۔ دل سے شوق رخ زیا نکل نہ گیا۔ تاکہ اچھا لکنا بھی نہ گیا۔

اس حسن برستی نے مجھے کسی کام کا نہیں رکھا۔ راستے چلتے اچھے لوگوں کو دیکھ کر ٹھک جاتا ہوں۔ سانسوں کی رفتار تیز ہونے لگتی ہے اور ذہن پر دھند سی سوار ہو جاتی ہے اور یہ شروع سے ہے۔ یہ کتاب محنت دل کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں سکا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی میرے پاس رہا ہے جس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سہا اور میرے شانوں پر اپنی زلفیں بکھیری ہیں۔

اپنے آپ کو بیان کرتا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ میرے دوست نے جس وقت مجھ سے کہا کہ میں اپنی کہانی لکھنا شروع کر دوں۔ اس وقت مجھے یہ کام بہت آسان محسوس ہوا تھا لیکن اب اندازہ ہوا ہے کہ یہ کتنا دشوار ہے۔ کون اپنے ذہم دوسروں کے سامنے لا جاتا ہے۔ اگر ایسا کہا جائے تو دیکھنے والوں کو کھنکھانے لگتی ہے۔ خاص کر اس وقت جب اس کے کردار پر ملاحظہ کی گئیں۔

کھیاں۔ لیکن ہمارے ہی ہوں۔

مجھ بھی نہیں کہہ سکتا اور جھوٹ بھی نہیں لکھا جاتا۔ عجیب شخص ہی ہے۔ سو بہتر یہی ہے کہ اپنے آپ کو کرداروں کے دامن میں سمیٹ لوں۔ چھپا لوں۔ اور کبھی کبھی دامن ہٹا کر اس دنیا کو دیکھوں اور پھر اپنے غول میں سمٹ جاؤں۔

اس زمانے میں میری زندگی تین بلکہ چار حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک خانہ شہناز اور اس کے عشق کا تھا۔ جو ایک کد فرمت نہیں لینے دیتا تھا۔ جس میں آپس بھی تھیں۔ آنسو بھی۔ سرشاریاں بھی۔ ترنم بھی، خواب بھی۔ تھیریں بھی۔ زندگی تھی کہ ہر لگاؤ کی جاری تھی۔ مجھے یہ ہے کہ جب میری ملازمت ہوئی تو ہم نے جامعہ ملی

روٹی کی برکت کی۔ خورشید کی۔ ایک چھوٹے سے گھر کی اور اس سے بھی پہلے کہ وہ دن مجھے بہت اچھی طرح یاد ہیں جب ہم دونوں نے ایک ساتھ نویں جماعت کا امتحان دیا تھا۔ ہم دونوں کے سینئر انٹرپورٹ اسکول میں تھے۔ وہ مرگ جو اسٹارکٹ سے سیدھی پرانے انٹرپورٹ تک جایا کرتی ہے۔ آگے جا کر اور اسکول تھے (یا شاید اب بھی ہوں) ایک لڑکیوں کا اور دوسرا لڑکوں کا۔ اس کا سینئر لڑکیوں کے اسکول میں اور میرا لڑکوں کے اسکول میں تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ جایا کرتے اور جب پرچے دے کر فارغ ہوتے تو ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہتے پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اسکول سے انٹرپورٹ کے اسٹاپ تک آیا کرتے۔ یہ پردا کیے بغیر کہ بہت سے لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ منگرا رہے ہیں۔ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ بس ایک کیف کے عالم میں ہم بادلوں کے درمیان سفر کرتے رہتے تھے۔ چلتے رہتے تھے۔

بالآخر وہ بہت خوبصورت تھی (اور آج بھی ہے) خیر۔ تو میں یہ بتا رہا تھا کہ جب میری ملازمت ہوئی تو شہناز کو یہ اعتراف ہونے لگا کہ شاید میں اپنی فطری بے پروائی کی وجہ سے وقت پر دفتر نہیں پہنچ سکوں گا اس لیے اس نے مجھے جگانے اور تیار کرنے کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔ میرا کراہیسا تھا جس کا ایک دردناک باہرنگی میں کھلا کرتا۔ وہ فجر کی نماز کے وقت اعتراف میں نہ جانے کس طرح اپنے گھر سے نکلتی۔ میرے کمرے کے دروازے پر آ کر دستک دے کر مجھے بے دار کرتی۔ میرے کپڑوں پر استری کرتی۔ جنھوں پر پالش کرتی اور جب اسے یہ یقین ہو جاتا کہ اب دوبارہ سونے کے لیے نہیں لیٹ جاؤں گا تو پھر وہ اپنے گھر واپس جاتی تھی۔ یہ مشقت اس نے ہمتوں کی۔ بہت پیارا تھا اس پر اور صرف اس لیے کہ وہ میری ملازمت کے سلسلے میں اپنے مستقبل کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آنے والے دن جو شاید ہم دونوں کے ہونے والے تھے۔ وہ خواب ہم دوں نے مل کر دیکھے تھے۔

بات نہیں۔ آج ایسی محبت ہوتی ہے یا نہیں۔ اتنا غلوں اور اتنی سمجیدگی شاید کہانتوں میں دکھائی دیتی ہو کہ وقت بہت تیز رفتار اور گہرا انداز ہو گیا ہے۔ اب سارا مل سیکٹ ہے۔ پھر ایسی محبت کی داستان ہم نے

روٹی کی برکت کی۔ خورشید کی۔ ایک چھوٹے سے گھر کی اور اس سے بھی پہلے کہ وہ دن مجھے بہت اچھی طرح یاد ہیں جب ہم دونوں نے ایک ساتھ نویں جماعت کا امتحان دیا تھا۔ ہم دونوں کے سینئر انٹرپورٹ اسکول میں تھے۔ وہ مرگ جو اسٹارکٹ سے سیدھی پرانے انٹرپورٹ تک جایا کرتی ہے۔ آگے جا کر اور اسکول تھے (یا شاید اب بھی ہوں) ایک لڑکیوں کا اور دوسرا لڑکوں کا۔ اس کا سینئر لڑکیوں کے اسکول میں اور میرا لڑکوں کے اسکول میں تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ جایا کرتے اور جب پرچے دے کر فارغ ہوتے تو ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہتے پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اسکول سے انٹرپورٹ کے اسٹاپ تک آیا کرتے۔ یہ پردا کیے بغیر کہ بہت سے لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ منگرا رہے ہیں۔ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ بس ایک کیف کے عالم میں ہم بادلوں کے درمیان سفر کرتے رہتے تھے۔ چلتے رہتے تھے۔

بالآخر وہ بہت خوبصورت تھی (اور آج بھی ہے) خیر۔ تو میں یہ بتا رہا تھا کہ جب میری ملازمت ہوئی تو شہناز کو یہ اعتراف ہونے لگا کہ شاید میں اپنی فطری بے پروائی کی وجہ سے وقت پر دفتر نہیں پہنچ سکوں گا اس لیے اس نے مجھے جگانے اور تیار کرنے کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔ میرا کراہیسا تھا جس کا ایک دردناک باہرنگی میں کھلا کرتا۔ وہ فجر کی نماز کے وقت اعتراف میں نہ جانے کس طرح اپنے گھر سے نکلتی۔ میرے کمرے کے دروازے پر آ کر دستک دے کر مجھے بے دار کرتی۔ میرے کپڑوں پر استری کرتی۔ جنھوں پر پالش کرتی اور جب اسے یہ یقین ہو جاتا کہ اب دوبارہ سونے کے لیے نہیں لیٹ جاؤں گا تو پھر وہ اپنے گھر واپس جاتی تھی۔ یہ مشقت اس نے ہمتوں کی۔ بہت پیارا تھا اس پر اور صرف اس لیے کہ وہ میری ملازمت کے سلسلے میں اپنے مستقبل کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آنے والے دن جو شاید ہم دونوں کے ہونے والے تھے۔ وہ خواب ہم دوں نے مل کر دیکھے تھے۔

بات نہیں۔ آج ایسی محبت ہوتی ہے یا نہیں۔ اتنا غلوں اور اتنی سمجیدگی شاید کہانتوں میں دکھائی دیتی ہو کہ وقت بہت تیز رفتار اور گہرا انداز ہو گیا ہے۔ اب سارا مل سیکٹ ہے۔ پھر ایسی محبت کی داستان ہم نے

حوالے سے ہوئی تھی لیکن پھر وہ میری زندگی میں شامل ہوتے چلے گئے۔ ان میں احمد جاوید، سراج منیر، ممتاز رفیق، ثروت حسین، شوکت عابد، الورسن رائے وغیرہ تھے۔ ایک خاندان گھر کا بھی تھا۔ خاندانی مصروفیات۔ لیکن بھائیوں کے درمیان گزارنے والی زندگی۔ دلچسپیاں اور ہاں ایک طرف آفتاب بھی تھا۔ وہی جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ بات نہیں۔ اس دور میں اتنی محبت اتنی فرصت کہاں سے مل جاتی تھی کہ میں ہر شے کو اچھا خاصہ وقت دے دیا کرتا تھا۔ شاید اس زمانے میں زندگی اتنی تیز رفتار نہیں ہوئی تھی۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں نے لکھنے کی ابتداء محبت بھرے خطوط سے کی۔ وہ خطوط جو میں شہناز کو لکھا کرتا تھا اور جس کے لیے میں یہ مبالغہ آمیز دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر وہ خطوط سلامت رہ جاتے تو شاید ادب میں ان کی کوئی حقیقت تعین ہو جاتی۔ وہ اتنے رواں، گھٹنے اور دلچسپ خطوط ہوا کرتے تھے کہ میں خود ان کو پڑھ کر ان کے سحر میں ڈوب رہتا تھا۔ شہناز کی ایک دوست ہوا کرتی تھی عذر۔ وہ واقعی ایک حسین لڑکی تھی اور اسے اپنے حسن کا احساس بھی تھا اس لیے وہ بے انتہا مغرور تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کو دیکھنے کے لیے مجھے کے لڑکے اس کے راتے میں کھڑے رہتے تھے لیکن وہ نواف کا بورڈ اٹھائے کر جایا کرتی۔ ایک دن شہناز نے مجھ سے کہا۔ "مغتر۔ مغتر اتم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"مجھ سے۔ وہ کیوں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔ تم خود اس سے معلوم کر لیتا۔"

بہر حال مغتر اسے میری ملاقات ہوئی اور اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں اس ہاتھ کو جو سنے آئی ہوں جس سے آپ شہناز کو اتنے خوبصورت خط لکھتے ہیں۔"

اور اس نے واقعی میرا ہاتھ چوم بھی لیا۔ بہر حال ان خطوط نے مجھے لکھنے کی طرف مائل کیا، اور میں نے افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ یہ افسانے تنقیدی نشستوں میں سنایا کرتا تھا۔ میرا سب سے پہلا افسانہ "جزدان" ماہنامہ سب میں شائع ہوا تھا۔ جو ایک مستند ادبی جریدہ تھا پیارے بھائی کے ہونے میں ہماری ادبی تعلیمیں ہوا

کرمیں۔ پھر حیات نے اپنے گھر میں ادبی نشستوں کا سلسلہ شروع کر دیا جس میں ہم باقاعدگی سے شریک ہوا کرتے۔ مختار حیات ایک پڑوسی اور بڑے کٹھ انسان تھے (آج بھی وہ اسی انداز کے ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے)۔ بہت ہی ٹھہرے ہوئے مزاج کے، ملاقات ہوتی تو محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ خوش ہیں یا ریت محسوس کر رہے ہیں۔ کپڑے بہت سلیقے کے پہنتے۔ ڈاکے ان کی وجہ شناخت بنتی ہوئی تھی۔ میں اور جاوید یہ کہا کرتے تھے کہ مختار صاحب شاید نائٹ گون پر بھی نائی استعمال کرتے ہوں گے۔ آدمی بہت وضع دار تھے۔ زندگی کا ایک اصول بتا رکھا تھا۔ جس پر وہ ابھی تک قائم ہیں۔

میں اور احمد جاوید اکثر ان سے شرمندہ ہوتے رہتے تھے (یہ شرمندگی کس قسم کی تھی۔ اس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں) مختار صاحب شاعر تھے اور اچھی شاعری کرتے تھے۔ بھی میں اپنے گھر میں شاعرے بھی کر دیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے جب ایک بار مختار حیات کو اپنے یہاں بلایا تو انہوں نے بہت خوبصورت غزل سنائی تھی۔ "گھر کے باہر تو خدا جالے ہے مگر کیا۔ گھر کا یہ حال کہ دیوار کہاں اور کیا۔"

تو مختار صاحب نے اپنے یہاں تنقیدی نشستوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک بار جاوید نے مجھ سے کہا۔ "مغتر۔ کیوں نہ تم اچھی نشست میں فریج بولنا شروع کرو۔"

"لیکن فریج تو مجھے نہیں آتی۔"

"تو کیا ہوا۔ اپنی طرف سے دو چار جملہ الٹی سیدھی زبان میں لکھ کر یاد کر کے سناؤ۔ سب بھی سمجھیں گے کہ تم فریج بول رہے ہو۔ اس طرح بہت رعب پیٹنے گا۔"

میرے لیے کیا مشکل تھا میں نے بھی کیا۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کسی فرضی فراہمی مصنف کا حوالہ دیا اس کے بعد رلے ہوئے جملہ بولنے شروع کر دیے۔ سب کے سب بہت حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن اس موقع پر خود جاوید ہی نے گڑبڑ کر دی۔ اس سے کسی برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسا شروع کر دیا۔ اس طرح میری شرارت کا پتا چل گیا۔

اس نے ساختہ قسم کی ہنسی کا ایک اور بہت دلچسپ واقعہ ہے۔

پاکستان ہوا کرتی تھی (اسی لئے کہ وہ اس وقت کے دور میں سید دارنی صاحب تھے۔ وہاں ایک بار میرے اعزاز میں ایک شام افسانہ منعقد ہوئی۔ اس میں میرے دوستوں کا پورا حلقہ موجود تھا اور میں بڑی سنجیدہ صورت بنائے اسٹیج پر موجود تھا۔ یہ سنجیدگی میرے مزاج کے بالکل برعکس تھی اس لیے مجھے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ انور حسن رائے نے مجھ پر ایک مضمون پڑھنا شروع کر دیا۔ اس مضمون کے پہلے ہی جملے میں میری شان میں کوئی بہت ہی سنجیدہ بات تھی۔ بس وہ بات ہی غضب ہو گئی۔ میں نے ہنسا شروع کر دیا۔ مجھے ہنسنے دیکھ کر ثروت اور شوکت بھی شروع ہو گئے۔ خود انور نے اپنا مضمون ایک طرف رکھا اور ہنسنے ہنسنے اپنا سر میز سے نکال دیا۔ ذرا سی دیر میں وہ پوری محفل درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

وہاں اس زمانے میں ہم نے کبھی کسی بات کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا۔ ہنسنے بولنے ہوئے سزا کر رہے تھے۔

اس زمانے میں ہم اچھی فلمیں بھی بہت دیکھ چکے تھے۔ دیکھا کرتے اور ان فلموں پر باقاعدہ بحث ہوا کرتی تھی۔ کراچی کے بلیس، کبھری وغیرہ میں خوبصورت فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔ ان پورٹ پر اسٹار اور ٹیٹرکینٹ میں کیا ڈانسی۔ انگریزی کی کلاسک فلمیں ہم نے ان دور میں دیکھی ہیں۔ ان فلموں کے بعد پھر ایسی فلمیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ کبھی ثروت کے ساتھ۔ کبھی جاوید کے ساتھ۔ کبھی شوکت کے ساتھ۔

اس زمانے کے ایک اور دوست ہیں انور عالم (جو آج کل کراچی پولیس میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں) ان کے ساتھ کبھی محرار اور گلستان میں سسٹے ٹکٹ لے کر درجنوں فلمیں دیکھی ہوں گی۔ وقت کس طرح اپنے انداز میں گزرتا تھا۔ مگر وہ میں نے وہی دیکھا بہت کم ہوا کرتے تھے۔ صرف فلمیں ہی تفریح کا ذریعہ تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں ہم جی ہا قاعدہ تفریح کی حیثیت رکھتی تھی۔ کئی دنوں پہلے سے پروگرام بنایا جاتا۔ اچھے بکڑے پہنے جاتے۔ ایک دوسرے سے ملاقات بھی سینما ہالوں میں ہی جاتی تھی۔ غرض یہ کہ سینما ہال شوکل زندگی کا ایک حصہ بنے ہوئے تھے اور اب تو برسوں ہو گئے ہیں کسی سینما ہال کی صورت دیکھے۔ اب تو ہر گھر سینما ہال بن چکا

دوسرے سے ملنے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی خدمت سے آگاہی ہوتی رہتی تھی۔ خود میرے گھر مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور اسی ان کی خاطر مدرست میں مصروف رہتیں۔

کئی دلچسپ کہ دار تھے۔ ہر ایک کی اپنی الگ کہانی تھی۔ میرے دور کے عزیزوں میں ایک شمیم صاحب ہوا کرتے تھے۔ بہت ہی عجیب۔ آنکھوں پر مونے شیشوں کی عینک۔ سیاہ رنگ۔ ہر موسم میں کوٹ پتلون میں ملبوس۔ خود کو شمیم نواب کہا کرتے۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی تحلی ہوا کرتی جس میں چھوٹے چھوٹے پتھر بھرے ہوئے تھے۔ وہ پتھر جو سمندر کنارے عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ چٹنے چٹنے سے، لیکن شمیم نواب کا یہ کہنا تھا کہ وہ دراصل میرے جواہرات ہیں جو ان کا خاندانی ورثہ چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی ان ہی پتھروں کو دیکھتے اور ان کی تحریف کرتے ہوئے گزار دی۔

ان کا کہنا تھا کہ ان کی مالیت لاکھوں میں ہو گی لیکن ہم سب جانتے تھے کہ وہ بے جا وے فریب میں مبتلا ہیں۔ وہ صرف پتھر ہیں۔ بے قیمت، لیکن یہ بات انہیں بتائی نہیں جاسکتی تھی۔ درندہ وہ پتھر کر رہ جاتے۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں خود بھی ان پتھروں کی اصلیت معلوم ہو لیکن خود کو تسلیم دیتے رہتے تھے۔

ایک بار ان کے ساتھ بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ان کی عمر گرجا اچھی خاصی ہو چکی تھی لیکن شادی نہیں ہوئی تھی۔ ایک بار ہم بہن بہنوں نے ان کے لیے ایک شے کا انتظام کیا۔ لڑکی والوں کو بھی بلایا اور شمیم صاحب کو بھی۔ لڑکی والے آکر بیٹھ گئے۔ شمیم صاحب ان کے بعد تشریف لائے تھے۔ وہی سوٹ بوٹ میں ملبوس اور لڑکی والوں کے سامنے آتے ہی وہ پٹ سے زمین پر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ اس دن پتا چلا کہ انہیں سرگی تھی اور ہمارے حال تھا کہ ہم انھوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔

ان لوگوں نے تو خیر شمیم صاحب سے اپنی لڑکی کی شادی نہیں کی تھی لیکن بعد میں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ آفتاب کا کش ذکر کر چکا ہوں۔ میں اور آفتاب اس زمانے میں اردو کا طالب علم تھے۔ مشرقی اور مغربی ادب میں ہم نام پر سے زیادہ برائیوں کے ساتھ بیٹ

مشتل کھیلا کرتے تھے۔ فائق صاحب اس کاغذ میں پڑھایا کرتے تھے۔ آفتاب نے ایک بار ایک لڑکی سے دوستی کر لی جو بیٹل مشتل کی بہن تھیں کھلاڑی تھیں۔ اس کی ایک بہن بھی تھی وہ بھی اسی کاغذ میں تھیں۔ دونوں بہنیں بہت خوبصورت، شوخ اور اسارت خیز تھیں لیکن انہیں یہ بھی کہ وہ دوسرے فرقتے سے تعلق رکھتی تھیں۔ آفتاب نے ایک بہن سے میری دوستی کرادی تھی اور ظاہر یہی کیا تھا کہ میرا تعلق اسی فرقتے سے ہے۔

بہر حال ان دونوں نے ایک بار اپنے گھر پر دعوت دی۔ یہ باقاعدہ لڑکوں کو دیکھنے والی رسم تھی کوئی چیز تھی۔ میں اور آفتاب خوب بن بھن کر وہاں پہنچے۔ ان لڑکیوں کے والد کٹر مذہبی قسم کے انسان تھے۔ ہماری گفتگو شروع ہوئی تو باتوں کی حد تک تو میں نے انہیں اپنی جانب سے یقین دلادیا تھا کہ میرا تعلق بھی ان ہی کے فرقتے سے ہے۔

اس وقت جب نماز کا وقت ہوا تو ہماری پول کل سچی۔ ہم نماز کے لیے کھڑے تو ہوئے تھے لیکن اس فرقتے کی نماز کے طریقے کہاں سے لاتے۔ نتیجتاً یہ ہوا کہ "بہت ہی بے آبرو ہو کر میرے کوچے سے ہم نکلے۔" اردو کاغذ ہی کا ایک اور دلچسپ واقعہ بھی یاد ہے۔ میرے پاس نفسیات بھی تھی اور فلسفہ بھی۔ اردو کاغذ میں فلسفہ پڑھانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا اس لیے میں خیا الدین کاغذ جایا کرتا تھا جہاں خواجہ آفتاب حسین صاحب پڑھاتے تھے، فلسفے کے بہت بڑے استاد۔ وہ فلسفہ پڑھا دیا کرتے تھے۔

ایک بار امتحانات ہوئے۔ نفسیات میں امتحان کے وقت دو دو کا روپ بنا دیتے ہیں۔ اسباب واضح دے دی جاتی ہے۔ میری کلاس میں ایک لڑکی ہوا کرتی تھی۔ حمیدہ نام تھا اس کا۔ گہرا رنگ، لیکن بہت پرکشش۔ اس کے چہرے پر بلا کی جاہلیت تھی۔ اس نے خدک کے اپنا پارٹنر مجھے بتایا۔ اس وقت تک میں کچھ نہیں سمجھا کہ آخر وہ کیا جانتی ہے پھر جب ہم دونوں کو ایک طرف بیٹھا دیا گیا تو اس وقت وہ خاموش سی لڑکی کل کر سامنے آگئی۔ اس نے مجھ سے کہا "منظر۔" جانتے ہو۔ میں نے تمہیں اپنا پارٹنر کیوں بتایا ہے۔

"تم ہی بتا دو۔"

اس وقت وہ کمرہ تھوڑے عرصے میں گزرتی ہوں۔ کلاس میں تو کم سے کم بات کرتے تھے۔

ہے ہوسنے دل کا حال بیان کر رہی ہوں۔ پھر کہاں کا امتحان۔ کیا امتحان۔ ہم دونوں باتیں ہی کرتے رہے۔ پتا نہیں۔ وہ آج کل کہاں ہوگی۔ طالب حسین سے بھی اس زمانے کی ملاقات جگہ دوستی ہے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن میرے پاس آ جاتے۔ بلکہ وہ گھر کے ایک فرد ہی بن گئے تھے۔ اس زمانے میں پی آئی اے میں نوکری کیا کرتے۔ اب نہ جانے کہاں ہیں۔ برسوں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ خوبصورت شعر کہا کرتے۔ ان کا ایک شعر مجھے آج بھی یاد ہے۔ "یہ کون ہے کہاں ہے کس نے مجھے پکارا۔ آواز بھی تمہاری انداز بھی تمہارا۔"

خوش لباس سے نوجوان۔ جن کی مالی حالت ہم لوگوں سے بہت بہتر تھی اسی لیے ہم ان سے بھی شرمندہ ہوتے رہتے تھے۔ خدا کیا عہد تھا۔ کیا زندگی تھی! اس قسم کی شرمندگی کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا تھا۔ اگر دوست کے پاس پیسہ ہے تو وہ سب کے لیے ہے۔ یہ حساب کتاب کاروان تو بہت بعد میں ہوا۔

میرے دوستوں میں اکٹری ہوئی زندگی احمد جاوید کی تھی۔ والد صاحب کہیں اور رہا کرتے اور وہ خود کہیں اور۔ اس شخص کو شاید شروع ہی سے آزمائشوں سے گزرا کر سمجھا تھا کہ وہ آگے چل کر لندن بن سکے۔ جان بوجھ کر اس کی راہ میں درپردہ میں اس کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ ایک گہرا، اور میں درپردہ میں اس کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ ایک دور وہ تھا جب وہ مجلس سانی کارکنان کے ہال میں رات گزارا کرتا۔ میں بھی اکثر اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ ہم سردیوں کی راتوں میں دروازوں اور کڑکیوں کے پردے اٹار کر اوڑھ لیا کرتے تھے۔ حالانکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میرا باقاعدہ ایک گھر تھا۔ جہاں... سارے رشتے موجود تھے۔ اس کے باوجود جاوید کی محبت مجھے اس کے ساتھ ساتھ لیے پھرتی تھی۔

دوسری مثال ممتاز رفیق کی تھی۔ کہنے کو گھر بھی تھا۔ ماں باپ بھائی بہن سب ہی تھے۔ اس کے باوجود زندگی اکٹری ہوئی تھی۔ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس گھر میں رہتا ہے۔ صرف سونے کے لیے گھر جاتا اور جب رات بے چین کرنے لگتی تو نیند کی گولیاں استعمال کرتا۔ میں نے اس کے ساتھ بہت دن بتائے ہیں۔ شاعری کرتے تھے۔

کر کام نہیں کر سکا۔ جس کی شکایت اس کے پورے گھر کو ہے۔ اللہ متاثر ہو کر جنت نعیم کرنے لگے اس کی شادی کے لیے میں ہی وسیلہ بنا تھا۔ یہ رشتہ میں نے لگایا تھا۔ جس کی کہانی آگے بیان کروں گا۔

طبر کے دوستوں میں نفیس فریدی بھی تھے، شاعر۔ جن کا ایک گیت جنگ کے زمانے میں بہت مشہور ہوا تھا۔ پاکستانی بولے لڑیا جن کی کسم پٹہ نہ جائے مار۔ وہ طبر میں جناح اسکوائر کے نفیس سینما کے پاس رہتے تھے۔ سینما کے پاس ایک ہوٹل بھی تھا جہاں شام کے وقت باہر کرسیاں بچھا دی جاتیں۔ وہاں کے شاہی کھڑے بہت اچھے ہوتے تھے۔ میں ہر شام کو نفیس فریدی سے ملنے اور شاہی کھڑے کھانے کے لیے وہاں جایا کرتا تھا۔

پھر افسر صدیقی تھے۔ رضی تھے۔ شہرت بکرا می تھے۔ سب کے سب ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ تھے جو طبر کی فضاؤں میں شاعرے پڑھا کرتے۔ مرحوم فرید کو کراچی آبادی ہم سب کے استاد ہوا کرتے تھے۔ ہم جب ان کی معیت میں شاعرے کھانے کے لیے جایا کرتے تو لکھنؤ اور دہلی وغیرہ کے ادبی معرکوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

مشتاق راہی تھے۔ ڈاکٹر امفر تھے۔ مشتاق راہی ایک دھماکا پان سے آدی تھے جو ترم میں غزلیں پڑھا کرتے۔ ان کا ایک شعر یاد ہے۔ اب کیا بھال ہوگی طبیعت بھی ہوئی۔ رسا کھا تھا آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔

میں وہاں کے مشاعروں میں ایک احساس فاخر کے ساتھ شریک ہوا کرتا تھا۔ پتا نہیں انکی کیفیت کیوں ہوتی تھی۔ شہناز کی یاد میرے ساتھ ہوتی اور نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے مشاعرہ پڑھتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ خوش ہو رہی ہو۔ میرا سینہ ہر وقت اس کے خوشگوار لمس اور رفاقت کی یادوں سے بھرا رہتا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی پاک نہیں ہے کہ اس نے مجھے بھرپور محبت دی۔ ہر قسم کی۔ دلی، جذباتی، رومانی۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا۔ ”کیا لطف مل سکے گا جو دوری بدل کی ہو۔ اتنا تو پاس آکر شکایت کھنکھائی ہو۔“

محبوب کیفیت تھی۔ اتنے دنوں کے بعد جب احاطہ کرنے بیٹھا ہوں تو گزرے ہوئے دن شریک بچوں کی طرح میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے دلا رہے

کی روشنی کے بعد میان ہوں۔ شاعر فیصل کالونی میں حاجی صاحب بھی تھے۔ پانڈو کے کارنر پر ان کا ایک آئین ڈھپ ہوا کرتا تھا۔ حاجی صاحب کی دنیا ہی مختلف تھی۔ یہ تعارف اور شریعت کی دنیا تھی۔ یہاں بزرگوں کے قصبے تھے۔ چھتیس کئی چالیس اور ایک دوسرے کو سناٹی جاتی تھیں۔ جاوید ان کا بے حد عقیدت مند تھا اور جاوید ہی کے حوالے سے میں نے بھی حاجی صاحب کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ ایک دوسرے کو اپنے تعارف پر بے اشعار سناٹے جاتے۔ جاوید سنے اس زمانے میں بہت خوبصورت نعفس اور چھتیس کئی تھیں۔ یہاں سے جاوید کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ انتہائی محنت اور جدوجہد کا دور تھا۔ وہ سائیکل رکشا پر ٹیس کے سلسلہ ریسائی کیا کرتا۔ لوگوں کے گھروں تک روزنی۔ سلیپز راکھا اٹھا کر لے جاتا اور دن بھر کی محنت کے بعد جو پیسے ملتے ہم دوستوں پر خرچ کر دیتا۔

جاوید کے لیے میں نے اپنے کوارٹر کے سامنے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ وہیں رہا کرتا۔ میری والدہ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ حاجی صاحب کے یہاں آنے والوں میں طبر کے افسر صدیقی اور رضی مین بھی تھے۔ چائے کے دور کے ساتھ ساتھ تعارف کا دور بھی چلتا رہتا تھا۔ یہ ایک بالکل مختلف کیفیت تھی۔

میں نے شہناز کے لیے اپنا رشتہ بیجا تھا جو مسترد کر دیا گیا اور شاید وہ لوگ اس بارے میں حق بجانب بھی تھے۔ زندگی صرف محبت بھری باتوں اور شاعری کے سہارے نہیں گزاری جاسکتی۔ اس کے لیے خوس مادی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جو میرے پاس نہیں تھے۔

اس کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے سانس نہیں لی گئی ہو۔ میرے لیے یہ اٹکا رہا ہوتا تھا۔ حادثے تو اس انداز کے ہوا کرتے ہیں لیکن شہناز کے ساتھ معاملہ تو کچھ اور تھا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے سورج غروب ہو جانے کے بعد اندھیرا ہو جانے کا کامل یقین ہو لیکن سورج غروب ہو جانے کے بعد بھی اگر اندھیرا نہ ہو تو پھر کتنی حیرت ہو سکتی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو ایک خام انداز سے مرعہ کر لیا تھا۔ وہ انداز جو شہناز کے آنے کے بعد ہونے والا تھا۔ یہاں ہمز ہوگا۔ اس وقت وہاں نہ کروں گا۔

کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ پورا ناظم ٹیبل میں چکا تھا۔ پھر اچانک ایک دیوار حائل ہوئی۔ ایک آن ہوئی ہوئی۔ اسے مجھ سے الگ کر دیا گیا۔ اس وقت اس نے اپنے گھر والوں سے بہت عجیب بات کی۔ اس نے کہا۔ ”میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔ آپ نے منظر سے شادی کرنے کے لیے منع کر دیا ہے تو میں بھی اس کی طرف دیکھوں گی بھی نہیں۔ یہ آپ سے میری انا کا تقاضہ ہے اور منظر سے میری انا کا تقاضہ ہے کہ میں پھر بھی شادی نہیں کروں۔“

اس نے پھر اسی انداز سے اپنی زندگی گزار دی۔ ایک عرصہ ہو گیا ہے لیکن ابھی بھی جب چاند پوری طرح روشن ہوتا ہے جب ہوائیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں جب میری قمیص کے بٹن ٹوٹ جاتے ہیں۔ جب میرے بال الجھ جاتے ہیں جب کہیں سے کسی گانے کی آواز آتی ہے۔ جب رونے کو دلی چاہتا ہے۔ جب زندگی مجھ میں نہیں آتی۔ جب الجھنیں شہناز ہو جاتی ہیں۔ جب میں بازار جاتا ہوں۔ جب رمضان کے دن آتے ہیں تو اس وقت وہ یاد آتی ہے کیونکہ اس نے ہر مرحلے اور ہر قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔

رمضان کے حوالے سے ایک اور دلچسپ بات یاد آ رہی ہے۔ محلے میں سحری کے لیے چکائے والے آیا کرتے۔ ایک گروپ بارمیوم اور ڈھوگی لے کر آیا کرتا تھا۔ ہم نے کسی طرح اس گروپ کو اپنا راز دار بنالیا۔ یعنی میں نے اور تبیین خان نے جب وہ سحری میں آتے تو میں اور تبیین ان کے ساتھ ہولیتے اور ان کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے شہناز کے گھر پہنچ جاتے۔ اسے میں نے یہ پتا رکھا تھا کہ اس طرح سحری کے وقت میں اس کے پاس آیا کروں گا۔ اس طرح وہ سحری کے وقت کسی بھانے اپنے ذرا دانے پر آکر کھیرا انتظار کیا کرتی تھی۔ ہم دونوں کو اور چاہے بھی کیا تھا۔

جگ دیکھ لیا دل شاد کیا۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ اور ہے کون۔ کون ہے جس سے زندگی جانیے۔ قربانیش کی جائیں۔ سنایا جائے۔ جس کے سامنے گڑ گڑا جائے۔ میں ان معنوں میں بھی مذہبی آدمی نہیں رہا جس کو مذہبی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نمازی اور پرہیزگار وغیرہ لیکن خدا کا کامل یقین اور بھروسے نے ہمیشہ میری راہ راہی ہے۔

ہیں۔ جب نانا جان کے زیر اثر تھا اور وہ مجھ سے خاتہ کی مسجد میں اذانیں دلاتا کرتے تھے۔ وہ کیف آج تک میرے اعصاب پر عادی ہے۔

مجھ میں نہیں آتا کہ زندگی نے میرے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا ہے یا میں نے زندگی کے ساتھ۔ میرا ایک دوست کہا کرتا تھا۔ ”دیکھ بیارے۔ تو جس کی ناقدی کر رہا ہے نا وہ دراصل اس چیز کی ناقدی نہیں ہے بلکہ وہ چیز تیری ناقدی کر رہی ہے۔ تو اگر وقت کو بر باد کر رہا ہے تو یہ دراصل وقت ہے جو تجھے بر باد کر رہا ہے۔ آج زندگی کے اس موڑ اور اس مقام پر کھڑا ہوا یہ سوچ رہا ہوں کہ میرا وہ دوست ٹھیک ہی کہتا تھا۔ وقت نے مجھے بر باد کر کے رکھ دیا ہے۔ کیا ہے میرے پاس۔ نہ تو دنیا ہے اور نہ ہی عاقبت ہے (یہ اور بات ہے کہ اسے گناہوں کے باوجود میں اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں)۔

ایک شعر میں سب کو سنا رہا ہوں۔ ”مگر دش وقت بھی آگے مجھے لے جائے گی۔ تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک۔“

میں نے ایک خوف ایک اندیشے کے عالم میں زندگی بسر کی ہے۔ اس کے باوجود اپنے آپ کو بھلانے کے لیے بے حس کی جا داؤڑ چھڑک رہی ہے اور اب یہ بے حس بے مہری میرے حواجز اور میری فطرت کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ بس وہی لوگ مجھے عزیز ہیں جو میرے ارد گرد ہیں۔ بیوی بچے۔ باہر کی دنیا سے مجھے ڈر محسوس ہوتا ہے۔ شام ہوتے ہی پردے کی طرح اپنے گھر لوٹ آتا ہوں اور کہاں وہ دن تھے کہ شامیں بچوں کی طرح ہوا کرتیں۔ مگر سے نکلتا ہی شام کو تھا۔

چاند رات کو ہم ایک دوسرے سے ضرور ملتے تھے۔ چاہے کہیں بھی ہوں۔ کسی بھی حال میں ہوں۔ وہ کیف آج تک مجھے لٹے کی طرح میرے وجود پر عادی ہے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ میرا چاند تو اس وقت ظہور ہوتا ہے جب تم سامنے آ جاتے ہو۔

جاوید اور دوسرے دوستوں کے ساتھ چاند رات کی کیفیت بہت مختلف ہوتی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو اشعار سنایا کرتے۔ ان کی باتیں کرتے جو ہمیں بہت عزیز ہوتے تھے۔ اس کے بعد یہ حال ہو گیا کہ میں ہر بھرے میں اس کا چہرہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ ”محبوب کا ملنا تو قیامت ہے۔“ ہم سب سرت محبوب کا ملنا بھی قیامت۔ تو میں

اب تک اس کی قیامت کی تلاش میں رہا ہوں اور جہاں کہیں اس جیسی صورت، اس جیسی ادا نہیں، اس جیسی آواز، اس جیسے انداز دکھائی دے جائیں بس وہیں اپنی سر ڈال دیتا ہوں۔ آگے پاؤں بڑھائے نہیں جاتے۔

بیواؤں کے ساتھ شہر کی ادبی محفلوں میں بھی جانے کے مواقع ملتے رہے۔ سلیم احمد مرحوم اور قمر جمیل صاحب سے اس زمانے میں واقفیت ہوئی۔ سلیم احمد مرحوم انجمنی میں رہا کرتے اور قمر جمیل صاحب عزیز آباد میں۔ ہم انہیں قصب شاہی اور قصب جنونی کہا کرتے تھے۔ شہر کا کون سا ادیب شاعر یا دانشور ان کے پاس نہیں آتا تھا۔ کیسے کیسے قند اور لوگ اور کیا کیا باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ ادب، فلسفہ، تصوف، سیاست اور نہ جانے کیا کیا۔ سلیم بھائی کے سرگرم پینے کا مخصوص انداز۔ ایک خاص انداز سے دونوں کہنیاں نیچے پر نکائے بیٹھے رہنا اور ان کی وہ گرجا دار آواز۔

میر افتخار ہے کہ اس زمانے میں اس شہر کے ادیب اور شاعر واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ دراصل یہ دو کیمبر تھے۔ ہم دونوں ہی دونوں بنگلہ راجہ فری دیار کرتے۔ سلیم بھائی کے یہاں آنے والوں میں عزیز حامد مدنی، سجاد میر، جمیل الدین عالی، جمال پانی پتی وغیرہ تھے اور قمر بھائی کے یہاں طلعت حسین، انور حسن رائے، عذرا عباس، شاہد حسن، طاہر حسن وغیرہ۔

یہ دونوں ہی علم کا خزانہ تھے۔ جب گفتگو ہوتی تو باغیچہ گرکھ دیتے۔ ہم جیسے بے علم لوگ ان کی باتوں کے بحر میں گم رہ کر رہ جاتے تھے۔

ایک بار میں اور جاوید قمر بھائی کے گھر ہی پر رک گئے۔ قمر بھائی رات گئے کیسے کیسے یوٹیوٹیو پر باتیں کرتے رہے تھے۔ اس طرف خیر تھی کہ ہماری آنکھوں میں اتاری چلی آ رہی تھی۔ جب ہم باقاعدہ جھومنے لگے تو قمر بھائی نے منگھو قسم کر دی اور وہیں سو گئے اور کمال یہ ہے کہ صبح چائے کے بعد قمر بھائی نے بالکل اسی جملے سے گفتگو شروع کی جس جملے پر منگھو قسم کی تھی۔ یہ ان کی یادداشت کا کمال تھا۔

احمد جاوید میں اس زمانے میں ایک بری عادت تھی اور وہ تھی کہ نہیں لے کر واپس نہ کرنے کی۔ یہ اس کے ممی اور ادبی ذوق کی نشانی تھی کہ اگر وہ کوئی چیز لے کر واپس نہیں لے کر دیتے تھے۔

۶۲

کی زندگی تھی اس لیے اس کی کتابیں بھی در بدر کی کاغذات تھیں۔ کبھی کسی کے یہاں۔ کبھی کسی کے یہاں۔ جاوید نے اپنا بہت سادہ وقت جناب سرشار محمد لہری کے یہاں بھی گزارا ہے۔ رفعت القاسمی صاحب، شاہ فیصل کالونی کے کمرانی صاحب۔ جن کی اردو بازار میں کتابوں کی دکان تھی۔ جہاں میری ملاقات اپنے دور کے ایک مشہور کردار استاد محبوب نرالی عالم سے ہوئی تھی (ان کی دلچسپ داستان آگے بیان کروں گا)

میں کو شیش کر رہا ہوں کہ اپنی کہانی کو ترتیب سے بیان کرتا چلا جاؤں کیونکہ یہ میرے لیے بہت دشوار ہو گیا ہے۔ واقعات اور کردار ایک دوسرے سے اتنی بری طرح الجھے ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے کو الگ الگ کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ دن تاریخ اور سن وغیرہ کی تقریبی قسم ہو گئی ہے۔ بس جو کچھ یاد آ رہا ہے اس کو لکھتا چلا جا رہا ہوں۔

ممتاز رفیق ہی کے دور لیے بابا رضوی سے ملاقات ہوئی۔ جو شاہ فیصل کالونی میں رہا کرتے تھے۔ بابا رضوی ایک باکمال آدمی تھے۔ ان کے گھر پر عقیدت مندوں کی بھجور لگی رہتی تھی۔ وہ ایک عامل تھے۔ کسی زمانے میں انچ پر حیرت زدہ کرنے والے شو بھی دکھایا کرتے لیکن بعد میں مختلف دھڑاؤں میں مبتلا لوگوں کی داد رہی کیا کرتے تھے۔

میں جب پہلی بار ان کے پاس گیا تو وہاں کا ماحول کچھ عجیب سا محسوس تھا۔ ایک نیم تاریک سا کمرہ جس کی دیواروں پر بہت گہرا رنگ کیا گیا تھا۔ ایک دیوار کے پاس ایک گھبراہٹا ہوا۔ اس کے قریب ایک گلو کی ویسکی صندوقی جو پرانی قلموں میں نشیوں وغیرہ کے پاس ہوتی ہے۔ جن پر وہ بھی کھاتے رکھ کر رکھا کرتے ہیں۔ اس صندوقی کے پاس چٹل کا ایک ٹل کھاتا ہوا سانپ اور دیواروں کے قریب عقیدت سے بیٹھے ہوئے لوگ۔ بابا رضوی ایک مفتی سے انسان لیکن آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک۔ حیدر آباد دکن سے تعلق اس لیے باتوں میں اسی زمین کا قبور آنے جانے والوں کی داستان سن کر کافذ پر آڑے تھے نشانبات اور انچ نماچہ نکالتے ہوئے۔ پھر یہ کہنا کہ تم نہ جانتے ہو۔ اس کے ٹل کر دیا ہے۔ وغیرہ۔

۶۱

بابر گل کرمان سے کہا۔ ”یار۔ یہ تم مجھے کہاں لے کر آ گئے تھے۔“

”تم نہیں جانتے۔ بابا رضوی بہت باکمال آدمی ہیں۔“

”اور تمہارے سلسلے میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ میں ان سے شرمندہ ہوتا رہتا ہوں۔“

”پھر تو واقعی باکمال آدمی ہوئے۔“

مجھے یہ اعزاز نہیں تھا کہ بابا رضوی سے دوستی اتنی بڑھ جائے گی کہ خود میں بھی ان سے شرمندہ ہونے لگوں گا لیکن اس عمل تک پہنچنے میں بہت دن لگ گئے تھے۔ بابا رضوی نے بہت کامیاب مظاہرے کیے ہیں۔ کراچی میں ڈھاکے میں اور دوسرے شہروں میں۔ ایک بار انہوں نے ایک ڈھانچے سے موٹر سائیکل چلا دی تھی۔ اس زمانے کے تمام اخبارات نے اس کی رپورٹ شائع کی۔ مرحوم صدر ایوب خان کے سامنے ایک شاندار مظاہرہ کیا لیکن ان کی یہ خوبیاں اور یہ باتیں مجھ پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکیں کیونکہ مجھے تو ان کی دوستی نے متاثر کر دیا تھا۔

انتہائی بے تکلف اور وقت پر کام آنے والا شخص۔ لاہور میں سراج منیر مرحوم کے ساتھ بھی بابا رضوی کی بہت ملاقاتیں رہیں (یہ ایک الگ داستان ہے) بابا رضوی کے یہاں آنے والے انہیں بابا کہتے اور وہ مجھے بابا کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے یہاں بھی تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن کی بیٹنگ ہو گئی تھی۔

ان کے یہاں ایک عرقان صاحب آیا کرتے تھے جو بہت چمکے ہوئے انسان تھے۔ عرقان صاحب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کوئی بھی کام علم نجوم اور ستاروں کی چال وغیرہ سے الگ ہو کر نہیں کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بہت دلچسپ واقعہ ہے۔ انہوں نے ایک بار ایک فلم بنانے کا ارادہ کیا اور فلم کی کہانی مجھ سے لکھوائی تھی۔ اس فلم کے اسکرپٹ کی روفا یا سمورت، بابا رضوی کے گھر ہی میں ہوئی تھی اور اہتمام یہ کیا گیا کہ ہر بات ستاروں کی چال یا علم الاعداد کے مطابق ہو۔

مثال کے طور پر میرے کارنگ سبز کر دیا گیا۔ اسکرپٹ سبز روشنائی سے لکھا گیا تھا۔ جو منشا آئی وہ سبز ہو گیا۔

۶۰

میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ فلم نہیں بنی۔ صرف سمورت ہی سمورت ہو گئی۔

عرقان صاحب بھی ایسے ہی لوگوں میں تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں میں کچھ خواب سجا رکھے تھے۔ بڑے لکھے، حساس شخص کے ساتھ ایک الیہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی کی سامنے والی تخیلوں کو نظر انداز کر کے دوسرے کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اپنے حالات سے مطمئن اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ تو اس شخص ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی ایک خواب کی پیمائش کے لیے ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ سب کچھ منادیتے ہیں اور اس کے باوجود جب تعبیر ان کے تصور کے برعکس ہوتی ہے تو پھر ان کا حال دیکھنے والا ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست طاہر اس کی بہت اچھی مثال ہیں۔ انہوں نے نہ جانے کتنے برسوں پہلے ”پتھر کے منم“ نامی ایک فلم بنائی اور آج تک وہ فلم ریلیز نہیں ہو سکی ہے۔ اس شخص نے اپنے سارے خواب سارے دوسروں اس قسم کے سمور میں جھونک دیے تھے اور اب وہ خالی ہاتھ کھڑے سوچ رہا ہے کہ زندگی نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟

لیکن یہ بات سنیں کیوں کہہ رہا ہوں۔ میں تو طاہر سے زیادہ نقصان میں ہوں۔ اس کے پاس تو شاید ایک ٹھہری ہوئی زندگی بھی ہوگی لیکن میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے پھر میں کسی کو مثال کیوں بنا رہا ہوں۔ میں تو اپنی ناکامیوں کی خود مثال ہوں۔

خیر، تو میں عرقان صاحب کا تذکرہ کر رہا تھا۔ وہ ایک دلچسپ آدمی تھے۔ پتا نہیں اب کہاں ہوں گے۔ میں نہیں جانتا کہ انسانی ذہن کی کتنی گہرائی ہے۔ کتنی باتیں ہوتی ہیں اور وہ کن کن مراحل سے گزرتا ہے۔ کیسے کیسے نفسانی عوامل اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی ذہنی کیفیت کس کس انداز سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مجھے موت سے محبت ہو گئی تھی۔ یہ میرے ابتدائی عہد کی بات ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ میں نے بھی خود کشی وغیرہ کی کوشش کی ہو۔ بس دل و دماغ پر ہر وقت ایک پرمیٹل پن سا سوار رہتا تھا۔ اکثر قبرستان کی طرف چلا جاتا اور آواز دیتا کہ اے سنو سنو مٹی کے نیچے سوئے والو۔ بہت جلد میں بھی تمہارے پاس آ رہا ہوں۔

خواب اس وقت بھی دیکھا کرتا اور آج بھی دیکھ رہا ہوں۔

۵ ستمبر ۲۰۲۲

ہوں۔ اچھے اور برے سکون دونوں کے خواب۔ وہ دن جو میری زندگی میں نہیں آئے۔

میر ہی میں ایک اور واقعہ ہوا جس نے بہت دنوں تک مجھے اپنی گرفت میں رکھا۔ بین خان نے مجھے ایک ٹیوشن دلا دی تھی۔ یہ ایک خوبصورت لڑکی کی ٹیوشن تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے بہت بولڈ اور بہادر۔ کچھ دنوں کے بعد میں اور وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اب تو خیر ہوتوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی ہے لیکن اس زمانے میں بہت اچھی گفتگو کر لیا کرتا تھا۔ فلسفے، محبت کی چاشنی اور خوبصورت اشعار سے گندمی ہوئی گفتگو۔ شاید یہ اس گفتگو کا اثر تھا کہ وہ لڑکی بہت قریب آ گئی تھی پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے وہ ٹیوشن چھوڑ دی۔ ایک شام اس کا بھائی مجھے بلانے آ گیا۔

”جلدی چلیں۔ باقی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ بہر حال میں اس کے ساتھ ہولیا۔ بین خان بھی میرے ساتھ تھے۔ پتا چلا کہ وہ بری طرح جل گئی ہے اور سو بھر بازار کے اسپتال میں ہے۔ پتا نہیں اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی یا کوئی اور بات تھی۔ بہر حال ہم دونوں اسپتال پہنچ گئے اور وہاں جو کچھ میں نے دیکھا۔ وہ انتہائی اذیت ناک تھا۔ میں نے بھی کوئی جلا ہوا جسم نہیں دیکھا تھا۔ اس لڑکی کی جزأت پر آج تک حیرت ہوئی ہے۔ وہ بستر پر ایک سفید چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کمال کی بات تھی کہ وہ اس وقت بھی مسکرا رہی تھی۔ اس نے دھڑکے سے کہا کہ اس کی چادر اس کے جسم سے ہٹا دی جائے۔ ہم نے وہ چادر ہٹا دی۔ اس چادر کے نیچے اس کا جلا ہوا جسم تھا۔ کوئلہ بن چکی تھی۔

ہم دونوں ہچکا کر رہ گئے۔ بین خان تو شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ کسی طرح ہم باہر برآمدے میں آ کر لیٹ گئے۔ ہم نے جو کچھ بھی دیکھا۔ اس نے ہمارے ہوش اڑا دیئے تھے پھر ہم اس کے کمرے میں نہیں گئے۔ شاید ایک گھنٹے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

اس قسم کی ایک اور لاش میں نے دیکھی تھی۔ وہ ہمارے علاقے میں ادھر ادھر گھومنے والا ایک دیوانہ تھا جو ایک رات آٹھ بجیں بج کر کمرے میں نہ جانے کس طرف چلا گیا۔

آس دوست عنوان کا ایک افسانہ بھی اس کے پاس میں لکھا تھا)

ان سب حادثات نے زندگی سے میری محبت کم کر دی تھی بلکہ موت کا خیال آتے ہی ایک سکون کی سی کیفیت حاوی ہو جاتی تھی۔ پھر جب یہ خیال آیا کہ میری زندگی چکن نہ پالیا تو کدھر جائیں گے۔ تو اس دن سے سب قرار میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

میں شاید ہمیشہ سے ایک ایسا انسان رہا ہوں جسے آپ خود غرض بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ چاہا جانے کی خواہش کی ہے۔ خود محبوب بننا چاہتا ہوں۔ میری سبکی دھیان رہا کہ لوگ میری طرف متوجہ ہوں۔ مجھے اہمیت دیں۔ میرا نام رکھیں۔ میرے بالوں کو سنواریں۔ مجھے پیار کریں۔ لیکن کیوں؟ مجھے میں تو ایسی کوئی خوبی بھی نہیں ہے کہ اس قسم کی خواہش کا گزر ہو سکے۔ کسی کے پاس اتنی فرصت ہے۔ کون اپنا وقت ضائع کرنا چاہتا ہو کہ خیر خواہیوں کا کیا بھروسہ؟ وہ تو کچھ بھی ہو سکتی ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب میری تحریر بھی کمرش نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے تئیں ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے لیے لکھا کرتا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے اپنی زندگی کے خوبصورت افسانے (اپنے تئیں) اس دور میں لکھے۔ جن کی پذیرائی بھی ہوتی رہی۔ سب کے بعد ادب لطیف، نئی قدریں، جائزہ، ہندوستان میں شب خون، آہنگ اور اس قسم کے ادبی جراند میں نے اس دور میں، کہانی نامکمل ہے، ماں جو میرے ساتھ ہے، قسم کے اچھے افسانے لکھے۔ اب میں شہر کے ادبی حلقوں میں بھی تھوڑا بہت جانا جاتا تھا۔ خاص طور پر ریڈیو کے حوالے سے کیونکہ میں نے ریڈیو پر ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ میرے ڈرامے ایس ایم سلیم مرحوم، رمی اختر شوق اور یاد مریدی جیسے لوگوں نے پروڈیوس کیے۔

ریڈیو کی کمیٹئیں اس زمانے میں ادیبوں اور شاعروں کے لیے لاہور کے پاک فی ہاؤس کی حقیقت رکھتی تھیں۔ یہیں ہماری ملاقات ایک انتہائی نفیس شخص سے ہوئی اور ہم ان ہی کے ہو کر رہ گئے۔ وہ رئیس فروغ مرحوم تھے۔ انتہائی خوبصورت شاعر اور اسے ہی خوبصورت انسان۔ سر پر سفید بال۔ جیسے ہیٹ پہن رکھا ہو۔ بے اختیار ہمارے ذہن پر ڈھکی چڑھکی آ کر کہہ رہا تھا کہ میں نے ان سے کچھ سیکھا۔ انہوں نے بھی ہماری بہت مدد کی ہے۔

معاف کریں، زندگی جنیں

اللہ کا کوئی بھی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اسلامی احکام، فرائض، سنیں ان سب میں کوئی ناکوئی حکمت ہوتی ہے اور سائنس ان احکامات اور سنتوں میں پوشیدہ قوانین و قواعد ہمارے سامنے لاتی رہتی ہے۔ انٹرنیشنل فارگینیس انسٹیٹیوٹ (International Forgiveness Institute) کے بانی اور وی فارگینگ لائف (The Forgiving Life) کے معنی ڈاکٹر۔ رابرٹ انرائٹ (Dr Robert Enright) کا کہنا ہے کہ ”جب انسان معاف کرتا ہے تو یہ عمل اس کے جسمانی عوامل (فزیالوجی) میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔“ ان کا کہنا ہے معاف کر دینے سے انتہائی غصے سے نجات ملتی ہے جو صحت کے لیے بہت نقصان دہ اور سم قاتل ہوتا ہے۔ 2009ء میں سائیکولوجی اینڈ ہیلتھ ٹھائی جرنل میں ایک مطالعہ شائع ہوا۔ اس مطالعے میں ڈاکٹر رابرٹ انرائٹ اور ان کی ٹیم نے دل کے مریضوں پر معاف کر دینے کے اثرات کا جائزہ لیا۔ اس مطالعے سے پتا چلا کہ جن مریضوں نے معاف کر دینے کی عادت کو اپنایا ان کے جسم میں خون کی گردش میں بہت بہتری آئی اور اس کے اثرات چار مہینوں سے بھی زیادہ عرصہ تک رہے۔

میں نے کمرشل افسانے اور فچرز وغیرہ لکھنے شروع کر دیئے جن کے معاوضے بھی ملتے تھے۔ اخبار جہاں کے لیے اس زمانے میں تین عورتیں اور تین کہانیاں لکھیں۔ سعید افضل اس صفحے کی انچارج ہوا کرتی تھیں۔ آج میں جب ٹی وی اور ریڈیو کے ان رپورٹرز کو دیکھتا ہوں جو دھڑا دھڑا کر کے غیرہ گھ کر کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں تو مجھے ان پر حیرت ہوا کرتی ہے کہ آخر یہ سب کسے ہو رہا ہے۔ تحریر تو ایک ایسا شعبہ ہے جو بیک گراؤ کا شکار ہے۔ برسوں کی جدوجہد کو دیکھتا ہے۔ اس کے لیے واقعی خون جگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ خبر۔ یہ اپنے اپنے عہد اور اپنی اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے۔

شہناز سے گھڑنے کے بعد بھی میرے رومالی سر کا خاتمہ نہ ہو سکا۔

بہت ساتھ دیا ہے۔ بے انتہا معصوم انسان۔ جن کی شاعری یقیناً اردو ادب میں زندہ رہے گی۔ خاص طور پر ان کی وہ غزل ”آئیں جن کو کچھ نہ پائیں پتوں میں گھرا دینا۔“ جتنے بھی ہیں روپ تمہارے جیسے جی دکھلا دینا۔“ ہمیشہ یاد رہنے والی غزل ہے۔

ہم آکر دس گیارہ بجے ان کے پاس پہنچ جاتے۔ رئیس فروغ صاحب فوراً کمیٹئیں والے سے چائے منگواتے اور چائے پینے کے دوران ادب اور شاعری پر باتیں ہوتی رہتی تھیں۔

ایک بار میں نے اسٹیج کے لیے ایک پلے لکھا اور شرارتا رئیس فروغ صاحب سے درخواست کی۔ ”رئیس بھائی۔ کیوں نہ آپ بھی اس ڈرامے میں کام کریں۔“ میں نے ”رئیس بھائی پریشان ہو گئے تھے۔“ میں کام کروں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس میں جو وقت کا کردار ہے۔ وہ بالکل آپ کے لیے ہے۔“

اور رئیس فروغ بھائی کی سادگی دیکھیں کہ وہ یہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار بھی ہو گئے تھے۔ اب ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ ریڈیو ہی میں سید ساجد بھی ہوا کرتے تھے (افسوس وہ بھی مرحوم ہو چکے ہیں۔ دہشت گردوں نے انہیں گولی مار کر شہید کر دیا تھا) ایک انتہائی سید حامد انو جان۔ نثری نگار بھی تھے والا۔ حسن پرست۔ پھولوں اور پرنسوں سے محبت کرنے والا۔ اس نے بھی ہمارا بہت ساتھ دیا کیونکہ دور ریڈیو کا قاعدہ ملازم تھا۔ ریڈیو ہی میں طلعت اقبال اور شہناز رضا سے دوستی ہوئی (یہ دونوں بہت اچھے فنکار ہیں) شہناز خان نے ایک ایکسٹرا آکٹو بی ٹی ٹیو کی تھی۔ جس کا پہلا ڈراما میں نے ہی لکھا تھا۔ گویا لکھنے کا سلسلہ بہت دنوں پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

منیر جعفری بھی ریڈیو ہی میں ہوا کرتے تھے۔ ایک پروڈیوسر اور پروڈیوسر سے زیادہ ایک فلاسفر اور دانشور۔ یوم طلبا کے پروگرام کیا کرتے۔ میں نے اس کے لیے بھی بے شمار پروگرام لکھے اور وہاں سے جو چیک ملتے تھے۔ انہیں کیش کر کر کمرش کرتے تھے۔

شاید میری کمرشل رائٹنگ کا سلسلہ اخبار خواتین اور اخبار جہاں سے شروع ہوا۔ اخبار خواتین میں میرے ایک

بڑھا دیتا جو ذرا بھی دسترس میں ہو یا جو فاسد
ہوئی۔ اس نفسانی لذت کا سب سے پہلا تجربہ میں نے
آفتاب کے ساتھ ہی کیا تھا۔

ایک بار ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات کسی
شادی میں ہوئی تھی۔ خاندان ہی کے کسی فرد کی شادی تھی۔
وقت گزاری کے لیے اس نے مجھے لوڈ ویکھنے کی دعوت دی۔
وہ اتنی اچھی تھی کہ اس کو کچھ کر میرا دل چل اٹھا۔ میں نے
اس سے ایک بات کہی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”دیکھو
نہت۔ لوڈ میں صرف ایک شرط پر کھیلوں گا۔“

”وہ کیا؟“ اس نے پوچھا۔
”وہ شرط یہ ہے کہ اگر تم جیت جاؤ تو تم مجھے جیت
لیا۔ اگر میں جیت جاؤں تو میں تمہیں جیت لوں گا۔“
وہ کچھ سوچنے کے بعد مسکادی۔ اس نے میری بات
سمجھ لی تھی۔ اس لیے ہر کر بولی۔ ”اوہ۔ تو یہ کہو نا کہ ہر حال
میں جیتنا چاہتے ہو۔“

اس سے دو چار ملاقاتیں اور ہوئیں پھر وہ سلسلہ
موقوف ہو گیا۔ زندگی کا سفر تو اس قسم کا ہوتا ہے۔ بقول عبید
اللہ عظیم۔ ”نہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے۔“
میر میں ایک اور شاعر ہوا کرتے تھے۔ خاور مخدوم۔
میں نے جوش صاحب کو ان کے یہاں دیکھا اور سنا۔ وہ
ایک درشت مزاج اور بے انتہا انا پرست قسم کے انسان
تھے۔ ان کے دو شعر آج تک یاد ہیں اور اکثر انہیں دہرا کر
لف لیا کرتا ہوں۔ ”میں نے کہا کہ چاند کو ہے دھوئی
بھال۔ اس نے کہا کہ لاؤ میرے روبرو کرو۔“ کیا
خوبصورت شعر تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس دور میں میر اور شاہ فیصل کا کوئی
وغیرہ کے علاقے اس سلسلے میں خاصے مردم خیز ہوا کرتے
تھے۔ اپنے ایک اور مہجر نے والے دوست کی یاد آتی ہے تو
دل میں ہلک سی آہ کر رہ جاتی ہے۔ وہ قصباتی احسان کو دگی
میں رہا کرتے تھے۔ ہم اس سے ملنے کو رگی جایا کرتے تھے۔
وہاں بھی مشاعرے ہوا کرتے۔ فکیل احمد نیا، ڈاکٹر شاہد اور
انوری وچیں کو دگی میں ہوا کرتے تھے۔

ہمارے سامنے والی گلی میں ایک بہت ہی دلچسپ
کردار رہا کرتے تھے۔ ان کا نام یاد نہیں ہے۔ بیوی بچوں
والے آدمی تھے لیکن انہیں نہ جانے کیوں جین سے خدا
والے کا پر تھا۔ کہیں بھی کوئی گڑبڑ ہو وہ فوراً جین کو درمیان

ایک بار میر میں ایک ایکسپرنٹ ہوا جس میں
آدمیوں کی موت واقع ہوئی تھی۔ ہم مکے واسطے ایک ایک
کھڑے اس حادثے پر تبصرہ کر رہے تھے کہ وہ صاحب
تشریف لے آئے اور انہوں نے آتے ہی یہ حیرت انگیز
انکشاف کیا۔ ”یہ سب کچھ جین کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہاں
قصور ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے ان کی طرف
دیکھا۔ ”اس ایکسپرنٹ میں جین کا قصور کہاں سے ہو گیا۔“
”بس ہو گیا۔“ وہ ایک شان بے نیازی سے بولے۔
”یہ سب کیا دھماکا ہے۔“

اور میں نے جان لیا کہ وہ کس قسم کے انسان تھے۔
میرے ہاتھ ایک کردار آگیا تھا۔ ایک تقریب تھی۔ ہم دوست
اس قسم کے کرداروں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ مجھے
بھی فرصت ملتی تو میں ان کے پاس پہنچ جاتا اور دھڑک
باتوں کے بعد کسی نہ کسی حادثے کا ذکر چھیڑ دیتا۔ بس وہ
جین کے خلاف شروع ہو جاتے اور کمال یہ تھا کہ ان کے
پاس کوئی جواز بھی نہیں ہوتا تھا۔ بس انہیں جین کو برا بھلا
کہنے کا موقع چاہیے تھا۔ نہ جانے جین نے ان کا کیا بکا
تھا۔ یہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آ سکا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسے دلچسپ کردار اس زمانے
میں کچھ زیادہ ہی ہوتے تھے یا ہمارے حصے میں آتے رہے
تھے۔ پتا نہیں کہ آج کے دور میں ایسے لوگ ہیں بھی یا نہیں۔
ایک اور ظاہر نام کا نوجوان ہوا کرتا تھا۔ اس کے
مزاج کی ایک گرہ ابھی تک میرے ذہن میں ابھی ہوئی
ہے۔ ان کی بہن کا بچ جایا کرتی تھیں۔ وہ موصوف انہیں
اسٹاپ تک پہنچانے کے لیے جایا کرتے لیکن تنہا نہیں۔ مجھے
بھی آواز دے کر بلا لیتے اور میں بھی ان کے ساتھ ان کی
بمشیر و استا پ تک لے جایا کرتا۔ ان کے ہاتھ میں گلاب کا
ایک پھول ہوتا تھا اور جیسے ہی ان کی بمشیرہ بس کے پاندان
پر قدم رکھیں وہ انتہائی اسٹائل کے ساتھ وہ پھول انہیں پیش
کر دیتے۔ بس اسٹاپ پر موجود لوگ اور بس کے مسافر سب
ہی اس آواز سے غور سے مسمکراتے ہوئے دیکھتے تھے اور جب بس روانہ ہو جاتی
تو بڑے فخر سے مسکراتے ہوئے واپس آ جاتے۔ خدا جانے
یہ کیا تک بھی۔ وہ کیا چاہتے تھے اور ان کی بمشیرہ کسی بھی کہ
انہوں نے کسی بھی بھائی کو اس حرکت کے لیے منع نہیں کیا۔ یہ
سب انسانی ذہن کے کرشمے ہوتے ہیں۔ جو چاہے آپ کا

جاوید کے بارے میں یہ بتا چکا ہوں کہ پرورد میں اس
کو اپنے لوگ ملنے رہے جنہوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔
انتہا چشنا، رہنا سہنا سب کچھ ان کے ساتھ ہی ہوا کرتا تھا۔
لوگ اس کی عظمت اور ذہانت سے مرعوب ہو جایا کرتے
تھے اور یہ مرغوبیت دوستی میں تبدیل ہو جاتی۔ ایسا شاید اس
لیے ہوا کہ خدا اسے جتنے سے بچانا چاہتا تھا اس لیے ہر جگہ
اور ہر ماحول میں اس نے جاوید کے لیے ہمدرد پیدا
کر دیے۔ ان ہی دنوں جاوید نے میری ملاقات ایک ڈاکٹر
صاحب سے کروائی تھی۔ جن کے یہاں شام کی چٹنگ ہوا
کرتی۔ ان ڈاکٹر صاحب کا مزاج بھی بہت عجیب تھا۔ ان
کی گفتگو بھی آج تک مجھ میں نہیں آ سکی ہے۔

وہ ڈاکٹر صاحب ایک خاص صوبے کے آدمیوں سے
بغض رکھا کرتے تھے اور بغض بھی ایسا کہ جس کی مثال نہیں
مل سکتی۔ وہ بنیادی طور پر جانوروں کے ڈاکٹر تھے اور ان کی
انتہا پسندی کا عالم یہ تھا کہ اگر اس صوبے کا کوئی آدمی اپنے
کسی بیمار جانور کو ان کے پاس لاتا تو وہ اس کا علاج کرنے
سے انکار کر دیتے تھے۔

ایک بار میں، جاوید اور ڈاکٹر صاحب کہیں جا رہے
تھے۔ راستے میں ایک بونل دکھائی دیا۔ دروڑوں کی بھوک
لگ رہی تھی۔ ہم تینوں بونل میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر
صاحب نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم
دونوں سیکس جنمو۔ میں ابھی دیکھ کر رہا ہوں۔“
نہ جانے وہ کیا دیکھنے چلے گئے تھے۔ بہر حال کچھ دیر
بعد آئے تو فیصے میں بھرے ہوئے تھے۔ ”بس بھائی۔ اٹھ لو
یہاں ہے۔ کسی اور بونل میں چلے ہیں۔“
”کیوں ڈاکٹر صاحب، خیریت تو ہے۔“ ہم نے

پوچھا۔
”خیریت کیا ہوئی ہے۔ اس بونل کے دو ملازم اسی
صوبے سے تعلق رکھتے ہیں۔“ انہوں نے بتایا۔ ”میں معطوم
کر کے گیا ہوں اسی لیے یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔“

تو ایسا تھا ان صاحب کا مزاج۔ لاپنے چڑھے
دیکھ کر تم کے انسان تھے۔ کھل کر تہمت لگاتے تو کوئی فر لایک
تک آواز جاتی تھی۔

نیاز صاحب سے بھی اس زمانے کی دوستی بلکہ نیاز
مندی ہے۔ بی او اے سی میں ملازمت کرتے تھے اور بہت
عظمت والا ملازم قسم کے خوش شکل انسان۔ ان کا قیام بھی
میر میں تھا۔ پانچویں باب کے اختتام پر

بہت دلچسپی تھی۔ بے پناہ مطالعہ تھا اور آج بھی ان کا مطالعہ
ہمیں حیران کرتا رہتا ہے۔ ان کے بات کرنے کا انداز بھی
بہت دلکش ہے۔ گردن جنگ کر اپنے مخصوص انداز میں گفتگو
کرتے ہوئے وہ ہنسنے والوں کو بہت کر دیتے ہیں۔ نیاز
صاحب آج کل روزنامہ جنگ سے وابستہ ہیں۔

میں اس بات پر آج بھی فخر کرتا ہوں کہ میرا
کہ اس زمانے ہی میں گئے ہا کمال لوگوں کے درمیان رہا
ہوں۔ یا ان سے دوستی رہی ہے۔ سب کے سب ادب اور
شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنے اپنے وقت پر ایک
نے اس میدان میں اپنے اپنے حصے کا فرض بھی ادا کر دیا
ہے۔

ایوب خاور، نقاش کالمی، احمد جاوید، ممتاز رفیق،
سراج منیر، شوکت عابد، ثروت حسین، طاہر مسعود، روشن
خیال، شفیق الزماں، طلعت اقبال، جمیل المنظر، سید
ساجد، نیاز صاحب، انور من رائے، غزرا عباس اور بھی
بہت سے لوگ۔ بہت سے چہرے۔ ان میں سے کچھ
کامیاب۔ کچھ ناکام۔ لیکن ہر ایک میں آگے بڑھنے کی
تھن۔ ہر ایک کے سینے میں شاعری ادب اور فنکاری کے
چراغ جلتے ہوئے۔ جمالی احسان، ریحانہ شاہین۔

ریحانہ شاہین ایک بہت خوبصورت اور مہر مدار لڑکی
تھی۔ اب سے برسوں پہلے کی بات کر رہا ہوں اور آج بھی
اس سے میری دوستی ہے۔ آتا جاتا ہے۔

میں اس زمانے میں ایک فرم میں کام کر رہا تھا۔ اس
فرم کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس میں کام کرنے
والے میرے ساتھ آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔
بہر حال تو میرے ساتھ میرے نام کی ایک لڑکی کام کرتی تھی جو
مجھ سے بہت بے تکلف تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔
”منظر صاحب۔ میری ایک دوست فی وی میں کام کرنا
چاہتی ہے۔ کیا آپ اسے کام دلوا سکتے ہیں۔“

”کیوں نہیں۔ بشرطیکہ وہ صورت شکل کی اچھی
ہوئی۔“

”بہت اچھی ہے۔ ایک انٹرن میں ملازمت کرتی
ہے۔“ مصنف نے بتایا۔
”تھیک ہے تو اسے کئی دن میرے پاس بھیج دیتا۔“
اس طرح ریحانہ شاہین میرے گھر آ گئی اور میں
اسے دیکھا ہی رہ گیا۔ وہ واقعی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔
جس طرح انٹرن میں کام کرنے والی لڑکیاں ہوا کرتی

ہیں۔ طرحدار، دلربا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بہت ذہین بھی تھی۔ شاعری اور خوبصورت گفتگو کیا کرتی تھی پھر میری اس سے دوستی ہو گئی۔ وہ ہر دوسرے دوسرے دن میرے گھر آ جاتی اور میں اس سے ملنے کو رگ جاتا رہتا۔ ایک بار اس نے اپنے گھر پر میری دعوت کی۔ اس نے بہت حیدار کھانا بنا رکھا تھا۔ میں نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔ اس دوران وہ مثنوی خزانہ میں مسکراتی رہی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد میں پھر اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے کہا: ”آپ جب تک بیٹھ کر کتابیں دیکھیں میں جب تک چلنے سے کھانا بناتی ہوں۔“

وہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد میں نہ جانے کیوں اس کو اور سے باہر آ گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ موصوفہ سامنے سے لدی پھندی چلی آ رہی ہیں۔ چا چلا کہ کھانا لانے ہوئی چلی گئی تھیں اور اس دن بھی انہوں نے مجھے ہوئی ہی کا کھانا کھلایا تھا (خیر یہ تو پرانی بات ہے۔ آج کل تو بہت اچھے کھانے بنانے لگی ہیں)

میری گلی میں دو بہت دلچسپ کردار رہا کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے رشتے دار بھی تھے اور ایک دوسرے سے جھگڑے بھی ہوا کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جسمانی طاقت ہی کے زور پر غنڈہ گردی کی جاتی تھی۔ دونوں جسمانی طور پر طاقتور تھے اور پورے محلے پر ان کی دھماک باندھی ہوئی تھی۔

اور میں ان دونوں کے درمیان گھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے جھگڑا کرنے کے بعد ایک دوسرے کے خلاف پولیس میں درخواست بھیجتے تھے اور دونوں ہی درخواست مجھ سے لکھوایا کرتے۔ کچھ عجیب دلچسپی صورت حال پیدا ہو جاتی تھی۔ جیسے آج دونوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ رات کے وقت ان دونوں میں سے کوئی میرے پاس آ جاتا تھا۔ ”محل منظر باؤ۔ اس سالے کے خلاف ایک درخواست لکھ دے۔ تیری بڑی مہربانی ہوگی۔“

اور میں اس کے لیے درخواست لکھ دیتا۔ پولیس کچھ کارروائی کرتی تو دوسرے دن وہ آ جاتے جن کے خلاف درخواست لکھی تھی۔ ”یار منظر صاحب۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ آپ میرے خلاف درخواست لکھتے ہیں۔“

”ارے بھائی۔ میں نہیں لکھتا۔ مجھ سے لکھوائی جاتی ہے۔“

”جیسے تو پھر ایک درخواست اس حوالہ سے“

خلاف لکھ دیں۔“

اب میں دوسرے فریق کی طرف سے پہلے کے درخواست لکھ دیتا۔ میرا خیال ہے کہ پولیس واسطے کی دونوں درخواستوں کی ایک جیسی تحریر پڑھ کر چپٹے ہی ہو گئے کہ ان لوگوں نے بھی کسی شخی کو پکڑ رکھا ہے۔ ایک بار ہم لوگوں نے ایک جنازی زبان بھی سنا کی تھی۔ آپس میں باقاعدہ گفتگو کیا کرتے۔ لڑکیوں کو درباں کہا کرتے اور بھی کئی باتیں تھیں۔ دراصل ان کے ذہنوں پر حسن اور ادب سوار ہو کر رہ گیا تھا اور ہم سب ایک حمام میں تھے۔ وہ عہد ہمارے جھگڑا سے کا تھا۔ منزل نہیں تھی۔ اوروں کے پاس تو شاید اب ہو گئی ہے میں اس طرح جھگڑ رہا ہوں کہ کوئی کردار مل جاتا اور میں اس کردار کے پیچھے پڑ جاتا۔

ایک بار شفاف تحریک کے بانی علامہ انور سے بھی ملاقات ہوئی اور میں ان کے پاس آنے جانے لگا۔ وہ بھی ایک دلچسپ انسان تھے۔ گراچی کے لوگوں کو یاد ہوگا کہ اسی زمانے میں ہر جگہ شفاف تحریک لکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ بسوں میں، دیکھوں میں، دیواروں پر ہر جگہ شفاف تحریک۔ موصوفہ علامہ مشرقی جیسے بڑے آدمی کے صاحبزادے تھے۔ ایک بار میں بھی ان سے ملنے چلا گیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ الفاظ کے خریدار ہیں اور فی لفظ چار آنے دیا کرتے ہیں۔ اس زمانے میں چار آنے بہت بڑی چیز ہوا کرتے تھے۔

ان کا طرز فکر کچھ یوں تھا کہ آپ کسی کا نذر پر کوئی لفظ لکھ کر دے دیں۔ کوئی بھی اناسیدہ حائل۔ جس کا کوئی تعجب نہ ہو۔ مثال کے طور پر ذرجم۔ اب وہ اس لفظ کو دیکھیں گے۔ اگر انہیں پسند آیا تو چار آنے میں وہ لفظ خرید لیتے تھے۔ اب وہ لفظ ان کا ہو گیا۔ اب چاہے اس کے ساتھ جو بھی سلوک کریں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں ڈرے کا نام ذرجم رکھ دیں۔ یا سگریٹ کو ذرجم کہہ کر پکارنے لگیں۔ یہ ان کی مرضی تھی۔

میں نے ان کے ہاتھ بہت سے لفظ فروخت کیے۔ جب بیویوں کی ضرورت ہوتی۔ میں انہیں الفاظ گڑھ کر ان کے پاس پہنچا جاتا اور چار چار آنے کے حساب سے الفاظ کا سودا کر کے دیتا۔ آ جاتا اس چکر میں انہوں نے کچھ ایسے ہی ایسے یوں جو ان کا بڑا غور ہیں۔ مثال کے طور پر

ملی دین کر وہ نہیں کہا کرتے تھے۔ مگر بڑی میں کہا جائے تو سی بی بی بی مجھے دیکھو، اس لحاظ سے ملی دین کا ترجمہ نہیں بہت مناسب ہے۔

اس طرح ایک بار انہوں نے ایک بہت منطقی بات کی۔ ”یار۔ یہ فوجی حضرات پرلے کے وقت جو ہالت کہتے ہیں یہ کوئی مناسب نہیں ہے کیونکہ زور سے ہالت کہتے ہوئے ہونٹوں کے درمیان سے ہوا نکل جاتی ہے۔ ہالت کی جگہ بس جم کہنا چاہیے۔ بس جم یعنی جم گئے۔“

مجھ سے اگر دریافت کیا جائے کہ تم کس زمانے میں جانا پسند کرو گے۔ فرض کرو کہ وقت تمہارے اختیار میں ہو تو خرابی زندگی کے کس عہد میں جاؤ گے تو میری سمجھ میں نہیں آئے گا کہ میں کیا کہوں۔ میں اکثر یہ فضول بات سوچتا ہوں۔ کہا جاؤں۔ کس عہد کو آواز دوں۔

کیا ساہتہ مشرقی پاکستان کے ساہتہ دونوں میں پہنچ جاؤں، جہاں چاروں طرف ہریالی تھی، جہاں کی فضا میں شہلے اور انناس کی خوشبوؤں سے گھردھی ہوئی، جہاں ہم بھائی بہن تھے۔ ماں باپ تھے، جہاں تیز بارش ہوتی اور سانپوں کی جھڑپاؤں زمین کے سینے پر نمودار ہو جاتیں، جہاں ہالت لگا کرتے تھے اور بچکانی عورتوں کا جادو حایا ہندوستان کے شہرینے کے محلے میں پہنچ جاؤں، جہاں ناٹا جان کے بزرگوں کی قاسم کی بولی خاتوا تھیں اور میں تاریکی ٹاول سنایا کرتا تھا، جہاں سردیوں میں نرم نرم مہربان دھوپ سینکھنے کا لطف آتا تھا اور سامنے سبزی کاٹنے اور چھیننے والی ٹائی جان ہوا کرتی، جہاں توایاں ہوا کرتی اور من محبت مولا میں کر لوگ بے ساختہ ترے بگتے، جہاں کی محبت پر میں چٹکس اڑایا کرتا اور گھڑا بارغ میں رچے ہوئے جب کسی کی دکان میں گانے بجا کرتے تو پورے وجود میں ایک معصومی رنگ رچ جاتا کرتی۔

یادہ دن جب شہناز میرے ساتھ تھی۔ جب ہم چاندنی راتوں میں انہوں میں ہاتھ ڈالے گھوما کرتے۔ جب اس کے خوشبوؤں سے میرے ہونے خلوط آیا کرتے۔ جب میرے ارد گرد میرے مہربان اور محبت کرنے والے دوست رہا کرتے۔ یا آج ہی میں زندہ رہوں۔ میرا چٹا حسن میرے پاس ہے اور میری بٹیاں میرے قریب ہیں۔ جب شہناز پیار سے آواز دیتی ہے۔ جب بی بی (حسن) کسی

کاش ایسا ہوتا کہ یہ ساری باتیں ایک ہی وقت میں ہو جاتیں لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے بسا آؤ کہ خاک شدہ۔ ایک گزرا ہوا سہانا وقت دوسرے وقت کی قربانی کے بعد ہی آتا ہے۔ زندگی کا سفر اس طرح جاری رہتا ہے۔ ہاں یہ بھی غنیمت ہے کہ یہ یادیں میرے ساتھ ہیں اور میں ان کے درمیان زندہ ہوں۔

آپ نے شاید وہ پاگل ضرور دیکھے ہوں گے جو اپنے جمولی میں پتھر بھرے رہتے ہیں اور کسی ایک جگہ بیٹھ کر ان پتھروں کو احتیاط سے دیکھتے ہیں اور ایک طرف رکھتے چلتے جاتے ہیں۔ میں بھی ایسا ہی پاگل ہوں۔ میری جمولی میں بھی یادوں کے پتھر بھرے ہوئے ہیں۔ جب فرصت ملتی ہے ان پتھروں کو ان یادوں کو دیکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ کبھی مسکراتا ہوں اور کبھی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں بلکہ مسکراتا تو بہت ہی کم ہوں۔ زیادہ تر تو آنسو ہی ہوتے ہیں۔

میں ایک بار پھر یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ میرے دوست نے بہت ہی مشکل کام میرے سپرد کر دیا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو دہرانے کا۔ میں مکمل طور پر اپنی کوتاہیوں، خباثتوں، گناہوں اور بد اعمالیوں کا اعتراف ہی نہیں کر سکتا اور اپنے آپ کو فرشتہ بھی ظاہر نہیں کر سکتا اسی لیے میں نے کرداروں کے دامن میں اپنے چہرے کو چھپالیا ہے اور وہیں سے ڈر ڈرا ساداسن بنا کر اس دنیا کو اپنے بارے میں بتا رہا ہوں۔

وہیے ایک بات تو طے ہے کہ میری اس داستان حیات کی کوئی درجہ نہیں ہوگی اور ہونی بھی نہیں چاہیے۔ معاشرے میں میرا مقام ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک ناکام انسان کی زندگی سے کسی کو کیا رہے گی۔ لوگ تو ناموروں کے حالات جاننا چاہتے ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں۔

بہر حال لکھتے چلا آ رہا ہوں کیونکہ میرے لیے یہ بھی ایک کام ہے۔ ایک فرض ہے۔ میں نے فقیروں کا ہمیں بتا کر قاشائے اہل کرم نہیں دیکھا۔ کیونکہ ہمیں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میری جیسے آدمی ہی خالی رہتی ہیں۔ مجھے پیار کرنے والے مجھ سے ہمدردی رکھنے والے بہت سے لوگ تھے۔ اس کے باوجود بیٹھ ایک بے چینی سی رہی۔ شاید میں اپنے مزاج میں بے وفائی اور خود غرضی کی مشیت رکھتا ہوں۔ میں کبھی مکمل طور پر کسی کا نہیں ہو سکا۔ لوگوں کی باتیں اور خطا گاہی میں ایک

”پہلی تو ہر ایک درخواست اس حراسہ کے خلاف لگودیں۔“

اب میں دوسرے فریق کی طرف سے پہلے کے لیے درخواست لکھ دیتا۔ میرا خیال ہے کہ پولیس والے بھی دونوں درخواستوں کی ایک جیسی تحریر پڑھ کر ہنسنے ہی اہل کے کہ ان لوگوں نے بھی کئی کئی کچکر رکھا ہے۔

ایک بار ہم لوگوں نے ایک جتنی زبان بھی انحراف کی تھی۔ آپس میں باقاعدہ گفتگو کیا کرتے۔ لڑکیوں کو زرباف کہا کرتے اور بھی کئی باتیں تھیں۔ دراصل ہمارے دونوں پر حسن اور ادب سوار ہو کر رہ گیا تھا اور ہم سب ہی ایک جام میں تھے۔ وہ عہد ہمارے بھنگاؤے کا تھا۔ کوئی منزل نہیں تھی۔ اور ہوں کہ پاس تو شاید اب ہوگئی ہے لیکن میں اس طرح بھنگ رہا ہوں کہ کوئی کردار مل جاتا اور میں اس کردار کے پیچھے پڑ جاتا۔

ایک بار شفاف تحریک کے بانی علامہ انور سے بھی ملاقات ہوئی اور میں ان کے پاس آنے جانے لگا۔ وہ بھی ایک دلچپ انسان تھے۔ کراچی کے لوگوں کو یاد ہوگا کہ اسی زمانے میں ہر جگہ شفاف تحریک لکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سولیں، دیکھوں میں، دیواروں پر ہر جگہ شفاف تحریک۔ موصوف علامہ مشرقی جیسے بڑے آدمی کے صاحبزادے تھے۔ ایک بار میں بھی ان سے ملنے چلا گیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ الفاظ کے خریدار ہیں اور فی لفظ چار آنے دیا کرتے ہیں۔ اس زمانے میں چار آنے بہت بڑی چیز ہوا کرتے تھے۔

ان کا طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ آپ کسی کا نذر پر کوئی لفظ لکھ کر دے دیں۔ کوئی بھی التماسی حالت لفظ۔ جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ مثال کے طور پر زورج۔ اب وہ اس لفظ کو کہیں گے۔ اگر انہیں پسند آیا تو چار آنے میں وہ لفظ خرید لیتے تھے۔ اب وہ لفظ ان کا ہو گیا۔ اب چاہے اس کے ساتھ جو بھی سلوک کریں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں شے کے نام زورج رکھ دیں۔ یا سگریٹ کو زورج کہہ کر پکارنے لگیں۔ یہ ان کی مرضی تھی۔

میں نے ان کے ساتھ بہت سے لفظ فروخت کیے۔ جب بیویوں کی ضرورت ہوتی۔ میں ہمیشہ الفاظ کو دے کر ان کے پاس پہنچ جاتا اور چار چار آنے کے حساب سے الفاظ کا دار کر کے واپس آ جاتا۔ اس پنک میں علامہ نے کچھ لفظ

اور میں نے خود بھی کہا کرتے تھے۔ اگر بڑی میں کہا جائے
 تو کسی بھی لمحے رنج و ملہ، اس لحاظ سے ٹکی ویشن کا ترجمہ
 نہیں بہت مناسب ہے۔
 اس طرح ایک بار انہوں نے ایک بہت منقطع کی
 کیا۔ یہ فوری حضرات پر لے کے وقت جو والٹ
 ہے جہاں کوئی مناسب نہیں ہے کیونکہ زور سے ہالٹ کہتے
 ہوتے ہوں گے اور سامان سے ہوا نکل جاتی ہے۔ ہالٹ کی
 پس منہ پر ہوتا ہے جس میں جہاں جہاں جمے۔
 مجھ سے مراد یہ ہے کہ کیا جائے کہ تم کس زمانے میں
 ہوا پانچ کرو گے۔ فرض کرو کہ وقت تمہارے اختیار میں ہو تو
 فوری زندگی کے کس عہد میں جاؤ گے تو میری کچھ میں نہیں
 آئے گا کہ میں کیا کہوں۔ میں اکثر یہ فضول بات سوچتا
 ہوں۔ کہا ہوتا ہے۔ کس عہد کو آواز دوں۔
 کیا ساتھ مشرقی پاکستان کے ساتھ دنوں میں پہنچ
 جاؤں۔ جہاں چاروں طرف بڑی ہی کمی، جہاں کی فضا میں
 بڑی کمی ہوگی۔ جہاں خوشبوؤں سے گندمی ہوتی، جہاں ہم
 مائل ہیں۔ ماں باپ تھے، جہاں تیز بارش ہوتی اور
 مائل کی چھتریاں زمین کے سینے پر نمودار ہو جاتیں،
 چھتریاں لگ کر تھکتے تھے اور رنگی عورتوں کا جادو حیا
 بدستور کے شہر پہنچنے کے لمحے میں پہنچ جاتا، جہاں نا جان
 کے بڑوں کی کھانسی کی آواز سننے سے بڑی اور میں تاریخی ٹاول
 بٹا کر تھکا، جہاں مردوں میں نرم مزاج مہربان و محبت سیکنے
 کا لطف آتا، جہاں تو الیاں ہوا کر تھیں اور من کست مولا
 کے ہاتھوں میں رہتے تھے، جہاں کی محبت پر میں
 جھپٹتا تھا اور گھر بار میں رہتے ہوئے جب کسی کی
 زبان میں کانٹے جاکر تھکے تو پورے وجود میں ایک معصوم سی
 رنگ دکھائی دیتی۔
 یاد دانا جب شہناز میر سے ساتھ تھی۔ جب ہم
 پائلی راتوں میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھوما کرتے۔
 ہاں اس کی خوشبوؤں سے بھرے ہوئے خلوص آیا کرتے۔
 جب میرے ارد گرد میرے مہربان اور محبت کرنے والے
 دست رہا کرتے۔ آج ہی میں زندہ رہوں۔ میرا بیٹا
 کس میرے ہاں سے اور میری بیٹیاں میرے قریب ہیں۔
 شہناز میر سے آواز دیتی ہے۔ جب بھی (حسن) کسی
 کی آواز نہ آئے۔ میرے چہرے پر ایک لمحہ محبت میرے انداز
 میں آتی ہے۔

کاش ایسا ہوتا کہ یہ ساری باتیں ایک ہی وقت میں ہو جاتیں لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے بڑا آرزو و خاک شدہ۔ ایک گرا ہوا سہانا وقت دوسرے وقت کی قربانی کے بدلے ہی آتا ہے۔ زندگی کا سفر اس طرح جاری رہتا ہے۔ ہاں یہ بھی نصیحت ہے کہ یہ یادیں میرے ساتھ ہیں اور میں ان کے درمیان زندہ ہوں۔

آپ نے شاید وہ پاگل ضرور دیکھے ہوں گے جو اپنے بھولی میں چتر بھرے رہتے ہیں اور کسی ایک جگہ بٹھ کر ان چتروں کو احتیاط سے دیکھتے ہیں اور ایک طرف رکھتے چلے جاتے ہیں۔ میں بھی ایسا ہی پاگل ہوں۔ میری بھولی میں بھی یادوں کے چتر بھرے ہوئے ہیں۔ جب فرصت ملتی ہے ان چتروں کو ان یادوں کو دیکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ کبھی مسکراتا ہوں اور کبھی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں بلکہ مسکراتا تو بہت ہی کم ہوں۔ زیادہ تر تو آنسو ہی ہوتے ہیں۔

میں ایک بار پھر یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ میرے دوست نے بہت ہی مشکل کام میرے پر در کر دیا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو دھرانے کا۔ میں مکمل طور پر اپنی کوتاہیوں، خباثتوں، گناہوں اور بد اعمالیوں کا اعتراف بھی نہیں کر سکتا اور اپنے آپ کو فرشتہ بھی ظاہر نہیں کر سکتا اسی لیے میں نے گردنوں کے دامن میں اپنے چہرے کو چھپایا ہے اور وہیں سے ذرا ذرا سا دامن ہٹا کر اس دنیا کو اپنے بارے میں بتا رہا ہوں۔

ویسے ایک بات تو طے ہے کہ میری اس داستان حیات کی کوئی رتھ نہیں ہوگی اور ہوتی بھی نہیں چاہیے۔ معاشرے میں میرا مقام ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک ناکام انسان کی زندگی سے کسی کو کیا دلچسپی۔ لوگ تو ناموروں کے حالات جانا چاہتے ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں۔

بہر حال کھینچ چلا آ رہا ہوں کیونکہ میرے لیے یہ بھی ایک کام ہے۔ ایک فرض ہے۔ میں نے تعمیروں کا بھی بنا کر تماشے اہل کرم نہیں دیکھا۔ کیونکہ مجس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میری جھینٹ تو ویسے ہی خالی رہتی ہیں۔

مجھے پیار کرنے والے مجھ سے ابھردی رکھنے والے بہت سے لوگ تھے۔ اس کا باوجود ہمیشہ ایک بے چینی ہی رہی۔ شاید میں اپنے حراج میں بے وفائی اور خود غرضی کی شہرت رکھتا ہوں۔ میں ابھی مکمل طور پر کسی کا نہیں ہو سکا۔

عالم ہے۔ ایک بار ہماری گلی میں ایک صاحب آکر آباد ہوئے۔ گلی بچ تھے۔ خود بہت خوبصورت آدمی تھے۔ بالکل استادانہ علم کی طرح، فنکار، موسیقی سے میرا رابطہ ان ہی کے ذریعے ہوا۔ عبداللہ ماجد نام تھا ان کا۔ بہت ہی خوبصورت آدمی۔ خاص طور پر ہم کلاس کا گیت گانے میں ان کا کوئی جانی نہیں تھا۔ آج بھی ماجد کی آواز میرے کانوں میں رسی گھونکنی رہتی ہے۔ ماجد ہر بچہ سرشاری کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ مجھے آواز دے کر بجاتے۔ رات کا وقت۔ ٹھنڈی ہوا تھی۔ ہم سامنے میدان کی طرف نکل جاتے اور ماجد ہیں کہ انھیں ہند کے گیت سنائے جا رہے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ اس طرح راتوں کو مجھے بے وقار کر کے گیت نہیں سناتے تو شاید مجھ پر بہت بڑا حکم کرتے۔ ان کی خوبصورت آواز ہر گھنٹہ کو ختم کر دیتی تھی۔

اسے خوبصورت فنکار کی زندگی کا ایک پہلو بہت عجیب تھا۔ وہ بیوی اور بچوں کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ شاید اسی لیے ان کی بیوی بچوں کو لے کر جب ہندوستان گئی تو پھر واپس نہیں آئی۔

ماجد کے چھوٹے بھائی عبدالغنی بھی بہت اچھے گلوکار تھے۔ میری ان سے بھی گہری دوستی تھی۔ دونوں بھائیوں میں بے انتہا محبت اور بے انتہا بے تکلفی تھی۔ یہ کانپور کے رہنے والے تھے اور کانپور کے حوالے سے جو کچھ انہوں نے بتایا وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ وہاں کے شب و روز۔ وہاں کے استاد۔ لائبریریاں گھمانے والے۔ چٹیل اڑانے والے۔ داستانیں سنانے والے۔ یہ سب کے سب مجلس ہوا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ جاؤں تو وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہو۔

ماجد نے اپنے لیے نجات کی ایک راہ تلاش کر لی تھی اور وہی نعت خوانی۔ آواز لاؤ خدا نے خوبصورت ہی دہی گئی۔ کراچی کی آرام باغ کی مسجد میں جتنے کی نماز کے بعد نعت خوانی ہوا کرتی ہے۔ ماجد باندی سے اس محفل میں شریک ہونے لگے۔ مجھ سے کہا کرتے تھے۔ ”بھائی۔ میں نے زندگی میں کوئی ایک کام تو نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نعت خوانی کے طبل میری بخشش ہو جائے۔“

انہوں نے کہا کہ مجھ کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ جو ہمارے گھر

پھر ایک دھبہ سی آنکھوں کے سامنے لہرائے گا ہے۔ وہ میرے ایک رشتے دار کی بیٹی ہے۔ سونے کی طرح
روکتا ہوا رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ لالہ بال۔ مناسبت
قد۔ اس کے بارے میں یہ بات عام ہے کہ نہ جانے کتنے
لڑکے اس کے دیوانے ہو رہے ہیں۔ اسے حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ وہ کس تقریب میں میرے یہاں آئے
 تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ میری آنکھیں
 اس کے سراپے میں قید ہو کر رہ جاتی ہیں۔ کسی اور کو دیکھنا
 نہیں چاہیں۔ اس نے بھی میری بے خودی محسوس کر لی ہے
 اس کے ہونٹوں پر ایک دنگی مسکراہٹ ہے۔

کچھ دیر بعد جب اسے موقع ملتا ہے تو دو میرے پاس آ جاتی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیتی ہے۔ "نور! کب تک تو میرے ہاتھ کیے لگ رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھوں میں ہندی لگا رکھی ہے۔ جو ظاہر ہے کہ ان خواہصورت ہاتھوں میں اور بھی خواہصورت ہوگی ہوگی۔

شہناز کے گھر والوں کی طرف سے جواب مل چکا تھا اور میں کسی بھی چیز کی طرح ڈون پھر رہا تھا۔ کوئی بھی ہو جو آئے بڑھ کر میرا اچھا تمام لے اور میری آنکھوں میں جھپٹ کر صرف اتنا کہہ دے۔ پریشان کیوں ہوتے ہو۔ میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔

لیکن وہاں سے بھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی۔
پس ہم دونوں مسکراہٹوں اور اُمیدوں کے چراغ جلاتے رہے۔
خیر، یہ سب سے زیادہ تیز اور بے حذر ٹک ثابت ہوئی۔

وہ بھی خاندان ہی کی ایک لڑکی تھی۔ انہوں اور خوشبوؤں سے
گندمی ہوئی۔ اس سے کسی ملاقات ہوئی رہتی تھی لیکن یہ نہیں
معلوم تھا کہ اس نے اپنے سینے میں ایک طوفان چھپا رکھا
ہے۔ اس کی شادی ٹے ہوئی۔ شادی سے دو دن پہلے اس
کے گھر والے اسے میرے یہاں لے آئے کیونکہ میرے گھر
کے قریب ایک خاتون رہتی تھی جس جو مہندی لگانے میں اپنا
تجربہ نہیں رکھتی تھیں۔ قریم کے گھر والے اسے مہندی
لگوانے آئے تھے اور قریم کی بہانے گھر والوں کو میرے

arkly Full version

کہا۔ "دیکھیں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں پرسوں کسی اور کی ہوتے جاری ہوں لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ میں صرف ایک رات وہاں ہوں۔ آپ واقعی طور پر خود کو میرے لیے تیار رکھیں۔ میں آپ کے پاس آ رہی ہوں۔"

اس کا یہ بات سن کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ "تحریم کیا آج عمل ہو؟" اسے اس طرف ان کو پہلے کہیں چھپا رکھا تھا۔

"ہاں۔ آپ کے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔"

"تو آپ کو بتا رہی ہوں۔"

اب سربراہی ہے وہ اپنے آپ کو اس کا جھنڈا پاتی یا بجکانہ بیان ہے۔
 میں یہ سمجھا کہ یہ اس کا جذبہ ہے کہ وہ جانتا ہے لیکن وہ تو
 ایک بار شادی ہو جائے تو پھر سب ختم ہو جاتا ہے لیکن وہ تو
 نکال کی حاجت ہوئی تھی۔ شادی کے دوسرے ہی دن وہ
 نے گھر آکر بیٹھی تھی۔ اس نے یہ الزام لگادیا تھا کہ اس کا

شہزادہ کا دل ہے۔
 تم غریبی ہوئی کہ خود مجھ ہی کو ایک لہجہ چڑا بیٹھ
 بیٹا چڑا تھا جب جا کر میں نے اپنے شوہر کو کھرا دیا اور اب
 شاہ اللہ سنی بچوں کی ماں ہے۔ ہنسی خوشی دعوئی گزار رہی
 ہے۔ لڑکیاں واقعی بہت عجیب ہوتی ہیں۔ نرم و نازک
 سی۔ کوئی کوئی سی۔ لیکن اپنے سینوں میں طوفان سیٹھے
 ہوئے۔ پردہ شاکر کا بہت سچا شعر ہے۔ ”جن کے کھنکھنے کو
 مرنے والے ماناں۔ دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں

مجھے شاید موسیقی، شاعری، زندگی کی جمالیاتی قدریں
غیر واپسی اور راست میں ملی ہیں۔ ابابو شاعری اور موسیقی سے
لچکی ہے۔ راگ رانگیوں کی پہچان رکھتے تھے۔ خط لکھتے تو
موسیقی کی مناسبت سے اشعار بھی لکھا کرتے تھے۔

ایک شرعی عورت ہونے کا حق ادا کر دیا۔ میرے ابا امی

سے بہت بڑے تھے۔ میری مانی ماں (بابا کی بیوی) نے بڑی اولاد میرے بھائی خواجہ جمال احمد میری امی کی عمر کے تھے۔ اس کے باوجود جب ابا سے شادی ہوئی تو انہوں نے اس ہونے کا حق ادا کر دیا۔ میرے دونوں بھائیوں کو اپنی اولاد سے زیادہ محبت دی۔ اس دور میں ایسی محبت بہت کم تھی ہے اور دونوں بھائیوں نے بھی اولاد ہونے کا حق ادا کر دیا۔ خاص طور پر چچو نے بھائی خواجہ اسرار احمد۔ جنہوں نے والد کا محنت کے بعد ہم سب کی پرورش کی۔

ای کا گھرانہ اہل تصوف کا گھرانہ ہے۔ جبکہ اہل انوار

Version of Water

کرتیں اور آپ کے یہاں نوآبادی کی کی گئی گرجن تھی اور ان دونوں طرز حیات نے مجھ پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ ماحول کی کی بھی واقعی نشوونما کے لیے شاید سب سے طاقتور ایلیمینٹ ہوا کرتا ہے۔ جیسا ماحول مل جائے۔ شخصیت اس انداز کی ہو جاتی ہے۔ میرا ماحول میرے دوست تھے۔ ادب نواز۔ بے فکر۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینے والے اور میں ان ہی جیسا ہو گیا۔

سران میر کو ہم بلائے، ہر فن مولا کہہ سکتے ہیں۔ ادب، فلسفہ، تصوف، تاریخ، ہر علم پر اتنی دھرس فی کس کہ ہاتھ باندھے اسے سننے رہتے تھے، نیک کے عقب سے چلتی ہوئی ذہین آنکھیں، بلائی یادداشت اور ایک خاص اعزاز سے میرے عزیز کہہ کر بلائے کا مثل۔ یہ سب کچھ یاد آتا ہے تو دل کی دھڑکنیں بند ہونے لگتی ہیں۔ مرحوم نے میرا بہت ساتھ دیا۔

میں اس دن کراچی ٹی وی پر اپنے ایک ڈرامے کی ریکارڈنگ میں تھا کہ قاسم جلالی صاحب میرے پاس آکر کہنے لگے۔ ”منظر۔ میرے کمرے میں آؤ۔ تم سے ایک بات چینی ہے۔“

میں ان کے ساتھ بولیا۔ کمرے میں لا کر انہوں نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور کہا: "تجھے ایک بری خبر سنانی ہے۔" "جی!" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ "کیسی خبر؟"

”تمہارے دوست سراج خیر کا انتقال ہو گیا۔“
 بس اتنا سننا تھا کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ خود پر قابو
 نہیں رہا۔ میں بچوں کی طرح جگ جگ کر رونے لگا تھا۔ آج
 بھی جب اس کی یاد آتی ہے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے
 ہیں۔ سراج کے ساتھ کتنے اچھے دن گزرے تھے۔ کراچیا
 میں۔ لاہور میں۔ کراچی کے چارے بھائی کے ہوش میں
 اور لاہور کے پاک ٹی ہاؤس میں لیکن اب کچھ بھی نہیں رہا۔
 اب سوائے دھندلکوں کے اور ہے کیا۔ ”یاد نہیں ہم کو بھی
 رنگارنگ بزم آرائیاں لیکن سب نقش و نگار خالق نسیاں
 ہو گئیں۔“

میں یہ بتا چکا ہوں کہ میرے حواج اور میری فطرت میں شاید قدامت داخل ہے۔ مجھے دو کمرے بہت اچھے لگتے ہیں۔ جہاں سفید فرش ہو۔ گاؤں کیے ہوں۔ دروازوں پر چھتھیں پڑی ہوں اور دروازوں کی جھریوں سے ہواؤں کی

ected with free v

ایمانی کی ہے۔ وہ جاتے ہوئے حکومت ان کے حوالے کر جاتے کیونکہ ان کا حق ہے۔ استاد شاعری بھی فرماتے ہیں اور شاعری ایسی جانی زبان میں ہوتی ہے جس کو شاید وہ خود بھی نہ سمجھ سکتے ہوں۔ مثال کے طور پر ”ہرزہ عشق پانچہ اشبار مفراتی ترنا۔“ کچھ سمجھ میں آیا! جیتا نہیں آیا ہوگا۔ یہاں استاد کا کمال ہے۔ ابن صفی مرحوم نے بھی اپنی ایک دو کتابوں میں ان کا ذکر کیا ہے۔

بہر حال استاد سے جب میری بے تکلفی ہوئی تو میں نے یوں ہی شرارت میں ایک دن استاد سے کہا۔ ”استاد ایک دو شیر کی بلند رخسار و فریب آثار آبادہ اثرام محبت ہے۔“ مطلب یہ کہ استاد ایک لڑکی آپ سے محبت کرنے لگی ہے۔

استاد یہ سن کر بھڑک اٹھے۔ ”کہاں ہے وہ ہر حرفی بد لفظ اقدار۔“ مطلب یہ کہ وہ کہاں سے اور کیا کرتی ہے۔

میں نے کئی خیالی بری بیکر کا تصور ان کے سامنے باندھ دیا اور یہ بتایا کہ وہ لڑکی آپ پر فدا ہو گئی ہے۔ آپ کی محبت میں ستارے گنا کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ استاد کی معصومیت ملاحظہ فرمائے کہ انہیں میری بات پر یقین آ گیا۔ اب میں ہر دوسرے دن استاد کو ایک فرضی پیغام دے دیا کرتا کہ اس لڑکی نے آج یہ کہلویا ہے۔ آج اس نے یہ کہا ہے وغیرہ۔

بالآخر دوسری طرف ممتاز رفیق کی شادی آگئی اور میں نے اس ڈرامے کا واسطہ آپ کچھ یوں کیا کہ پریشان حال صورت بنائے استاد کے پاس پہنچ گیا۔ ”استاد آپ کی محبت پر تشفیوہ آوارگان ممتاز ہے۔“

”کیا مطلب؟“ استاد چونک اٹھے۔

”مطلب یہ کہ اس لڑکی کے گھر والے ممتاز رفیق نامی ایک آدمی سے زبردستی اس کی شادی کر رہے ہیں اور کل اس کی شادی ہے۔“

استاد یہ خبر سن کر بھڑک اٹھے تھے۔ انہوں نے درخواست کی کہ انہیں شادی کے وقت پڑا ل میں پہنچا دیا جائے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ استاد باقاعدہ ایک عدد لاٹھی لے کر پڑا ل میں پہنچ گئے۔ جہاں ممتاز رفیق دولہا بنے بیٹھے تھے۔

مستتر امام کی خود نوشت ابھی جاری ہے

ایک سکون آ میر سسل مندی سی شامل ہونے لگتی ہے۔ یا وہ مکان جس کے برآمدے ستونوں کے درمیان ہوں۔ سیر میوں کے نیچے پورچ میں کوئی موٹر یا ٹم کھڑی ہو۔ وہی حال تک پراسرار گھٹوں کا ہے۔ آج بھی ایسی گلیاں نظر آتی ہیں تو ان میں ہتھکڑ پتا ہوں۔ حالانکہ ماضی میں انہیں گلیوں سے میرا کوئی رشتہ کوئی حلقہ نہیں رہا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم ان ہی گلیوں میں کوئی ہم سفر اپنا۔

جلاوید نے پاپوشن پلاننگ میں ملازمت کر لی تھی۔ جس کا دفتر سولجر بازار میں تھا۔ اس کی اس مصروفیت کے باوجود ہم ایک دوسرے سے روزانہ ملا کرتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ طبر میں ایک لڑکی دکھائی دی (بات دی ہے کہ میں اپنی کہانی کو تزیین سے بیان نہیں کر رہا ہوں۔ واقعات سامنے چلے آ رہے ہیں اور میں انہیں قید کرتا جا رہا ہوں)

مہ جیسے نام تھا اس کا۔ چھوٹا سا قد۔ لیکن خوبصورت آنکھوں اور خوبصورت باتوں والی ایک سمجھدار لڑکی۔ ہم دونوں کے درمیان دوستی اور غلط فہمی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ میں اکثر شام کے وقت مہ جیس کے یہاں چلا جاتا تھا۔ اس کے گھر والے میرا بہت خیال کیا کرتے تھے۔ ایک دن مہ جیس کی والدہ نے مہ جیس کے رشتے کے لیے بات کی کہ اگر کوئی لڑکا میری نگاہ میں ہو تو بتا دوں۔ اپنا یاد ممتاز رفیق میرے ذہن میں آ گیا۔ جو ایک بڑا شاعر، اچھا لکھار ہو کر بھی ایک اکڑی ہوئی زندگی گزار رہا تھا۔ میں نے ممتاز رفیق کے گھر والوں سے بات کی۔ لڑکی انہیں پسند آگئی۔ اسی طرح یہ رشتہ طے پا گیا اور اب دونوں ایک بھرپور زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ ممتاز کے حراج میں ابھی تک وہی بے پردائی اور اکڑاؤ ہے جبکہ مہ جیس اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو خاتون ممتاز رفیق جیسے شخص کو باندھ کر ایک گھر کا پابند بنا دے اس کی خوبیوں میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

ممتاز رفیق کی شادی کے حوالے سے ایک بہت دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔ بھتر ہے کہ سنا چلوں ورنہ واقعات کی بھیر میں یہ مگر ورورہ جائے گا۔

استاد محبوب نرلے عالم سے اسی زمانے میں ملاقات ہوئی تھی۔ جو لوگ ان سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے لیے عرض ہے کہ استاد خود کو کھانا اب مطلب کا آخری جان لیوا کتے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

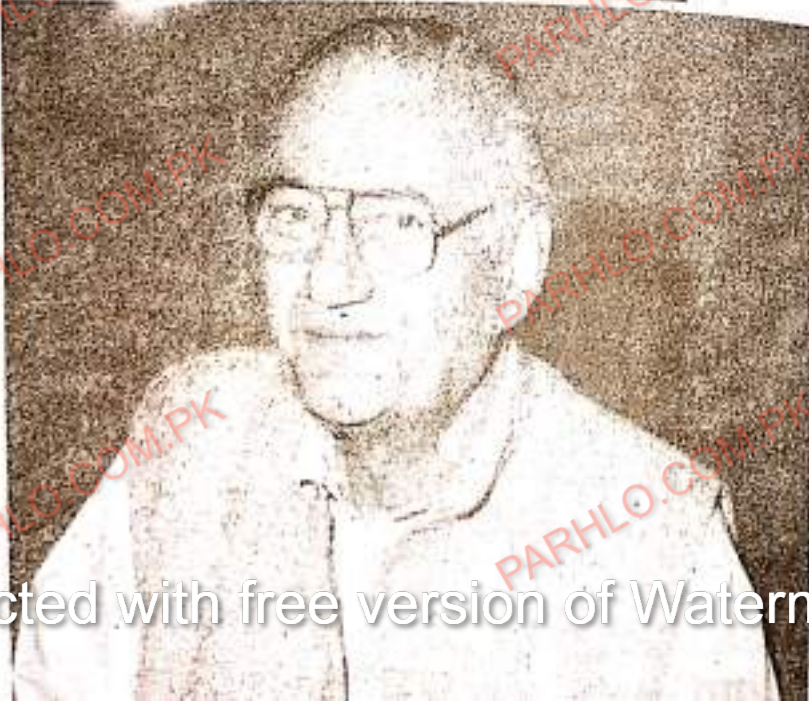
اور کیا ہے، ایسے لوگوں کے بارے میں معلومات جمع کرنا جن کو دنیا سے کئے گئے کسی بڑی بیت چکے ہیں اور جن کے بارے میں کہیں سے کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ طاہر مسعود کو اکثر دوسرے ہونے کہا کہ میں ان لوگوں پر کام کرتا ہوں جن پر اب تک کسی نے کام نہیں کیا اور دوسروں نے اب تک ان پر اس لیے کام نہیں کیا کہ وہ ان کے بارے میں کچھ جانتے بھی نہیں تھے اور جب ان کے بارے میں کام کرنے کو کہا تو عام باخداات کی وجہ سے اسے ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ جب آسانی سے کسی سامنے کی چیز پر تحقیق ہو جاتی ہو تو پھر کس پسند تحقیق کیوں کی انتہائی وقت طلب کام پر تحقیق کرے گا۔ ایسے کام محدودے چند لوگ ہی کرتے ہیں

تحقیق و درال

معراج جامی

فکر کے دل چاہے کھولنے، احساس کو اظہار کے سانچے میں ڈھالنے، جذبوں کو آنچ دینے والا الفاظ کا وہ ساحر جب تنقید کا نشتر اٹھا کر ایک قابل حراج کی طرح تحریروں کا پوسٹ مارٹم کرتا تو لکھاری سوالیہ تملانے کے کچھ نہ کر سکتا۔ اردو ادب میں اس جیسا کوئی اور نقاد نظر ہی نہیں آتا۔

ہر ادب پسند کا پسندیدہ نثر نویسے الفاظ سے کھیلے آتا تھا



جن کا شوق، مگن اور جذبہ ان سے یہ کام کرتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایسا کام تو کتنے خداوندی کے بغیر ممکن بھی تو نہیں، جسے اللہ تعالیٰ تو کھینچ دیتا ہے وہی چوٹی سر کرتا ہے۔ شہیدوں میں نام گھسانے والے تو بہت سے ہوتے ہیں مگر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے شہید بننے والے تو محدود ہیں چند ہی ہوتے ہیں۔ خولید صاحب نے تحقیق کے باب میں خود کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا کہ کسی کو کہیں سے بھی اردو ادب کے کسی بھی قدیم مآخذ کی تلاش ہوتی تو وہ خط، فون یا معاملات کے ذریعے مشتق خولید سے رہنمائی حاصل کرتا اور کامراں ہوتا۔ عصر حاضر کے محققین نے اپنی کسی نہ کسی تحقیق کے لیے خولید صاحب سے رجوع کیا اور ہر امر اون سے۔

دراصل وہ انسان اس دنیا میں کامیاب و کامران ہے جو اپنے شعور اور ایک سے اپنے میلان طبع کا اندازہ لگائے اور پھر اپنی زندگی کو اس کام کے لیے وقف کر دے۔ یوں تو کئی ایک بڑے نامور ایسے ہیں جن کے بارے میں بیشتر لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے وقت و شاعری سے کیا مگر بڑی جلدی کچھ گھٹے کے شاعری سے کہیں بڑھ کر ان کے میلان طبع کے لیے ادب کا کون سا میدان مناسب ہے؟ کاجس میں وہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا سکیں گے اور پھر یہ فیصلہ کرنے کے بعد جب وہ اپنے اصل میدان کی طرف رجوع ہوتے تو ایک عالم نے انہیں عالم تسلیم کیا۔ مثال کے طور پر یہ چند نامور دیکھتے ہیں انہوں نے شاعری سے ابتدا کی مگر پھر سب اپنے اپنے اصل جوہر کی جانب لوٹ گئے، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر سلیم انصاری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان علی، ڈاکٹر رفیعہ رحمان۔

مشتق خولید نے شاعری بھی کی، ایک مجموعہ "کیا بات" کے نام سے شائع بھی کیا مگر بڑی جلدی انہیں اپنے جوہر کا نام ہو گیا اور وہ تحقیق کی جانب متوجہ ہو گئے پھر انہیں مخطوطات جمع کرنے کا شوق ہوا۔ مخطوطات کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایک بہترین طرزِ تحریر اور منظرِ اسلوب بھی رکھتے تھے لہذا ان کے کاموں نے خصوصاً انہیں شہرت کے مقام پر پہنچا دیا۔ وہ جین تھے اور حافظہ کا قہار، ایک مرتبہ پڑھ لیتے برسوں یاد رہتا جس کو ایک مرتبہ دیکھ لیتے بھی نہ بھولتے مخطوطے، کتاب اور رسائل کے مندرجات انہیں آذر سنتے، ہر اچھی اور بری کتاب کا مطالعہ ضرور کرتے، اپنے کاموں میں کئی بار یہ بات عرصاً انہیں گھٹی کہ مجھے ایک بری کتاب پڑھی بڑی بلکہ واقف وہ ہر کتاب پڑھتے تھے کہ اس کا اثر ہو، اس کا اثر ان کے دماغ پر، اس کا اثر ان کے

تحریر اور صاحب کتاب کے طرزِ تحریر کو نہیں بلکہ کتاب کے جتنے اسطور اور صاحب کتاب کے باطن کو جان لیتے تھے پھر جو اس کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں لکھتے تھے تو ان کے ساتھ ساتھ خود صاحب کتاب بھی لطف لیتا اور ان کی شرف بخشی کی یاد دلاتا۔ جو اعلاظرف ہوتے وہ اپنی ظلیفوں، غامضیوں اور کونہوں کو کھلے دل سے تسلیم کر لیتے اور چونکہ دل دھنگ نخر ہوتے وہ خولید صاحب کے دشمن ہو جاتے۔

خولید صاحب نے اپنے تجربے کی بہت جلد دنیا سے ادب میں ایک بلند اور مستتر مقام بنایا تھا۔ ان کی تحقیقی، تنقیدی اس قدر صحیح ہوتی کہ ان کی بیانی ہوتی معلومات سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ بہت سوں کو تو جلی بارانِ مآخذات کا علم ہوتا اور وہ خولید صاحب کی دکھائی ہوئی روشنی میں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتا۔ خولید صاحب کے پاس علم ادب کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے جسے بجا طور پر خزانِ علوم کہا جاسکتا ہے، وہ اگر نیاری اور تعلقات سے فرمت پاتے تو اب تک ان کی کئی معرکہ آرا کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہوتیں مگر ایک تو نیاری نے اور دوسرے ان کے تعلقات نے انہیں بہت کم وقت دیا۔ نیاری تو ایسی گھٹی کہ ان کا علاج دور، اقدامِ تعلقات ایسے تھے کہ ان کا علاج ممکن نہیں تھا۔ اگرچہ انہوں نے عام لوگوں کے لیے اپنے گھر کے دروازے صرف انوار کے دن گیارہ بجے سے دو یا تین بجے تک کے لیے کھولے ہوئے تھے، ان عام لوگوں میں ادب کے وہ لوگ بھی شامل تھے جو طالبِ علم تھے یا معمولی دکاندار، مگر اپنے خاص خاص احباب سے ملنے کے لیے ان کے پاس کوئی خاص وقت نہیں تھا، وہ جب بھی چاہتے خولید صاحب سے مل لیتے، نہ خولید صاحب اپنے اصول پر اس معاملے میں پابندی کر سکتے تھے اور نہ دوسرے اس لیے ملنے جلنے کا سلسلہ پورے سات دن جاری رہتا، یوں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس لکھنے لکھانے کے لیے بہت کم وقت بچتا تھا پھر بھی انہوں نے اس نگی وقت کے باوجود کئی کام ایسے کیے ہیں جو سامنے آئے تو محسوس ہوا کہ یہ کام صرف خولید صاحب ہی کر سکتے تھے۔ ان کا آخری بڑا کام کلیاتِ یگانہ ہے، کلیاتِ یگانہ جو 960 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے، اس میں دیباچہ مرتب کے عنوان سے مشتق خولید صاحب نے اس کتاب کو مرتب کرنے کے سلسلہ میں جن مشکلات و دشواریوں اور پریشانیوں کا ذکر کیا ہے اسے پڑھتے تو راتوں رات پینا آجاتا ہے کہ ایک واقعہ حقیقی کام کس قدر دشوار گزار ہے، کیا بے کام و بیکار کرنے کے لیے کہاں کہاں رہا ہے

نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ اس کام کے لیے خولید صاحب دلی بھی دینے اور یگانہ کے علاوہ ان کے احباب کی اولادوں سے بھی ملے غرض کہ صرف کلیاتِ یگانہ کی تیاری میں جو جان جو سہم کام کرنے پڑے وہ واقعی خولید صاحب ہی کا کام تھا پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ جائزہ مخطوطات اردو کی تیاری میں خولید صاحب کا کتنا خونِ جگر صرف ہوا ہوگا۔ جائزہ مخطوطات پر ہی اگر خولید صاحب مکمل توجہ اور یکسوئی سے کام کرتے تو یہ جائزہ تقریباً دس سالوں میں تیار ہوتا اور اس کی ہر جلد ہزار صفحے سے کیا کم ہوتی۔ جلدوں میں تیار ہوتا اور اس کی ہر جلد ہزار صفحے سے کیا کم ہوتی۔ جائزہ مخطوطات اردو کی صرف ایک جلد 1248 صفحات پر مشتمل ہوتی ہے، دوسری جلد بھی تیاری کے آخری سرے میں تھی اس پر غالباً نظر ثانی کی جارہی تھی مگر خولید صاحب دوسرے کاموں میں بھی وقت دیتے رہے نتیجتاً دوسری جلد یوں ہی پڑی رہ گئی۔ کلیاتِ یگانہ کی تیاری کے ساتھ ساتھ یگانہ پر مزید آٹھ کتابوں پر خولید صاحب کام کر رہے تھے۔

- 1- یگانہ..... ایک ادبی مورخ
- 2- مکتوباتِ یگانہ
- 3- غالبیاتِ یگانہ
- 4- مضامینِ یگانہ
- 5- خودنوشتِ یاس
- 6- درودِ خود
- 7- یگانہ..... شخصیت اور فن

اگر یہ کتابیں بھی جن میں سے دو تین تو تیار تھیں اشاعت کے لیے کسی کو دے دیتے تو آج دامنِ اردو ان کے وسیع عطیات سے مالا مال ہوتی اور ایک ایسے شاعر کے بارے میں لوگوں کو شک ہی ہوتی جس کی شخصیت ایک معنائی ہوئی تھی اور جس کے بارے میں مکمل معلومات دینے کے لیے کسی محقق کے پاس کچھ نہیں تھا۔

خولید صاحب کے کالم جہاں خولید صاحب کی مزید شہرت و مقبولیت کا باعث بنے وہیں خولید صاحب کے دشمنوں میں بھی اضافے کا سبب ہوئے۔ خولید صاحب کے خط میں ایک ایسی کاٹ ہوتی تھی جو انسان کو تھکاتا کر رکھ دیتی تھی، ان کا طرزِ تحریر طویل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں ان کا اندازِ مستحسن لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا تھا، تنقیر اور تکذیب تو اس لیے لوگ برداشت کر لیتے ہیں کہ اس طرح کے الزامات کے لیے کہنے یا لکھنے والے کے پاس خوش شہرت ہوتے ہیں مگر تنقیر کے صاحب ہی کیا ہر صاحبِ حقیقت پسندی یہ نہیں ہے کہ وہ

لوگوں کے بڑے بول پھند نہیں کرتا، اپنے منہ میں مٹو بیخے والوں سے انہیں الجھن ہوتی ہے، خود مائی اور خود مائی تحلیف دیتی ہے مگر یہ اس وقت ایسے لوگوں کے لیے تحلیف کا باعث بنتی ہے جب وہ اپنا ان ادبی محرتوں سے محام اور ادب کو گمراہ کرتے ہیں۔ ہر انسان میں ایسی عادات بد ہوتی ہے مگر ان عادات بد سے اگر عوام اور ادب کو گمراہ کیا جائے تو پھر صاحبِ حق پسند حق کو اس کے مآذراک کے لیے قلم سنبھال لیتے ہیں۔ خولید صاحب کے کاموں میں ان لوگوں کے خلاف ایسی تحریرات انداز ہے جو بدمذہب خود سلطان بن جاتے ہیں اور اپنی کتابوں میں اپنے بارے میں غلط اور نام نہاد بلند دعوے کرتے نظر آتے ہیں اور آج کل چونکہ شہرت کے گرنے کے پاس بھی ایک کام رو گیا ہے جس کے نتیجے میں اردو ادب کا دامن ایسی خود پسندانہ تحریروں سے بھرتا جا رہا ہے تو اہلِ علم و فضل کی یہ قدرتی فطرتی ہے کہ وہ ان گمراہ کی تحریروں سے کوام کو آگاہ کریں اور اردو ادب کے دامن کو ان کی تحریروں سے پاک کریں۔ خولید صاحب میں اگر کوئی خرابی، برائی یا چاندیہ عادت تھی تو یہی کہ وہ صاف گو، حق پسند اور منہ پرست انسان تھے۔ مجھے طے ہے کہ ان کی وفات سے جہاں ایک دنیا سوگوار ہوئی ہے وہیں بہت سے لوگ خوش بھی بہت ہوئے ہیں کہ اب ان کی باتوں اور تحریروں کو گرفت میں لانے والا کوئی نہیں ہے۔ خولید صاحب نے کالم لکھتے بند کر دیے تھے، پوچھتے نہ پتا کہ کس میں چاہتا ہوں کہ میری شناخت میرے کالم میں جبکہ بات یہ نہیں ہے آخر خولید صاحب کہاں تک لوگوں کی مخالفت برداشت کریں اور کہاں تک ایسی تحریروں کا پوسٹ مارٹم کریں کیونکہ انہیں دوسرے بہت سے اہم کام بھی تو کرنے پڑتے تھے جو ان کے لیے نیک نامی کے باعث تو بننے ہی میں اور ادب کو جو گراں مالہ فائدہ پہنچ رہا تھا اس کا اندازہ تو صاحبِ علم ہی لگا سکتا ہے۔ بس یہی بیچھی کس میں انہیں بھولیں پاتا۔

اب سبھی دیکھیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے چند سال گزر گئے۔ 22 فروری 2005ء کو اہلِ گراہی نے بڑے دکھ اور غم کے ساتھ مشتق خولید کو دل میں اتارا تھا۔ اسے سال گزرنے کے باوجود خولید صاحب کی رحلت ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ مگر طبعی یہ کیا وقت واقعی تیزی سے گزر رہا ہے یا ہم سر ہٹ دوڑے جا رہے ہیں؟ خولید صاحب سے میرے بھی مراسم تھے، بہت زیادہ گہرے، قریبی، برعکس نہیں کرتے اور جس قدر بھی تھے وہ ایک نامور شاعر اور محقق تھے۔

صاحب کے صاف انکار سے میری طبیعت بہت کد رہی۔ مگر یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ میرے جیسے ایک غیر معروف شخص کے لیے وہ اپنا اصول کیوں توڑیں گے۔ ان بزرگ نے مجھ سے خوبصورت صاحب کا فون نمبر لیا اور چلے گئے۔ دوسرے دن رات کو ان کا فون آیا کہ ابھی ابھی خوبصورت صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔

میرے اوپر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ خوبصورت صاحب اور ان کے اصول کے بارے میں، میں نے صرف سنا ہی تھا، ابھی ان سے واسطہ تو پڑا ہی نہیں تھا اس لیے حیرت کا پہاڑ ٹوٹنا برحق تھا۔ میں نے ان سے تفصیل پوچھی تو بولے کہ میں نے کل شام ان کو فون کیا تو ان پر انہوں نے مجھ سے بہت سے سوالات کیے گویا ایک طرح سے میرا انٹرویو لیا، پھر آج شام پانچ بجے آنے کی اجازت دی۔ میں ٹھیک پانچ بجے ان کے ہاں پہنچ گیا اور ابھی اٹھ بجے ان کے ہاں سے آ کر آپ کو فون کر رہا ہوں۔

خوبصورت صاحب کے روئے سے مجھے ایک بار پھر انہوں نے پھر اپنے انہوں کو یہ سوچ کر جھٹک دینے کی کوشش کی کہ میں کوئی بہت بڑا شخص تو ہوں نہیں۔ علم و ادب میں میرا کوئی مقام بھی نہیں ہے پھر خوبصورت صاحب میرے ساتھ اختیار کیوں رہیں گے؟

چند ہی منوں بعد اسی طرح ایک اور صاحب لندن سے آئے ہوئے تھے اور خوبصورت صاحب سے ملنے کے شہرہ تھی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ اتوار کے علاوہ عام دنوں میں کسی سے مل نہیں لے سکتے ہیں تو وہ اتوار کے دن ملنے پر تیار ہو گئے مگر ان کے ساتھ بھیدی یہ کہ وہ جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے ان کو خوبصورت صاحب کے گھر لے جانے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے مجھے ہی انہیں خوبصورت صاحب کے ہاں لے کر جانا پڑا۔ خوبصورت صاحب کے ہاں میری یہ پہلی حاضری تھی جہاں ان کے اصول کے مطابق اتوار کے دن ہوتی۔

دوسری حاضری بھی خوبصورت صاحب کے ہاں اتوار کے دن ہوئی جب فراست رضوی کی کئی کئی بار دہرایا کر مشکل پسند کھرا اور مجھے لے کر خوبصورت صاحب کے پاس گئے مگر یہ ابھی حال ہی کی بات ہے۔ وہاں فراست نے خوبصورت صاحب کی اپنے ساتھ میرے ساتھ اور ایک طالب علم کے ساتھ جو اپنے مقالے کے سلسلے میں خوبصورت صاحب سے مواد لینے کے لیے آیا ہوا تھا تصاویر اتاریں۔ اس طرح میں خوبصورت صاحب کے اتوار کے دن پہنچا جانے والی وہاں عام میں دو یا تین مرتبہ گیا ہوں مگر عام دنوں میں ان سے نہ مل سکتا تھا۔

ایک اور گرام آیا، لکھا تھا کہ دوسرے علاقے میں منتقل ہو گیا ہوں، پرانے علاقے کسی کام سے گیا تو ڈاک کیا اور اس نے بتایا کہ آپ کے نام ایک پارسل آیا تھا، مگر چونکہ آپ یہاں سے جا چکے ہیں، اس لیے وہ پارسل واپس بھیج دیا لہذا مجھے انہوں سے کہہ دے کہ آپ پارسل واپس ہو گیا، یہ پارسل یا تو آپ نے بھیجا ہو گا یا پھر مشتاق خوبصورت صاحب نے۔ اب بارہ روز صحت کریں اور وہ پارسل میرے ہاتھ پر پہنچ جائے گا۔

میں بھی یوں اس کا سکر صاحب کو کتابیں بھیجتا رہتا تھا مگر جس پارسل کا وہ ذکر کر رہے تھے وہ میں نے نہیں بھیجا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مشتاق خوبصورت صاحب، ڈاکٹر یونس اگاسکر صاحب کو کتابیں بھیجتے رہتے تھے۔ اتفاق سے میں ان دنوں بہت جلدی کرنے لگا تھا۔ میں نے مشتاق خوبصورت صاحب کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا ایسا ہے کہ آپ کا رسالہ کردہ کتابوں کا کوئی پارسل واپس آیا ہے۔ بولے: ”آپ کو کیسے معلوم، مگر فوراً ہی کہنے لگے کہ آپ کو اطلاع آئی ہوگی۔ میں نے ڈاکٹر یونس اگاسکر کو کتابیں بھیجی تھیں۔ غالباً ان کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے۔ میں نے اس پر انہیں بتایا کہ میرے پاس ڈاکٹر صاحب کا خط آیا ہے جس میں انہوں نے اس پارسل کے واپس جانے پر انہوں کا اکتہار کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ پارسل یا تو میں نے نہیں بھیجا ہے یا پھر خوبصورت صاحب نے۔

کہنے لگے کہ مجھے ان کا پتہ لکھوادیں اور ٹیلی فون نمبر بھی۔ میں نے پتہ اور ٹیلی فون نمبر لکھوا دیے پھر میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ پارسل ابھی اضافی خرچے کے سمجھا جائیں گے، حیران ہو کر بولے: ”وہ کیسے؟“

میں نے کہا کہ اگر آپ حکم کریں تو یہ پارسل دتی بھی ان کو پہنچ سکتا ہے۔ فون پر ان کی حیران زدہ آواز آئی، کیا یہ ممکن ہے؟ مگر چونکہ خوبصورت صاحب بلا کے ذہین تھے، اس لیے پھر فوراً بولے: ”کیوں آپ تو انہیں جانے جارہے ہیں؟“

اس پر میں نے جیسے بولے: ”کہا جی ہاں میں بھی جارہا ہوں اس لیے آپ کا پارسل میں لے جانے کے لیے تیار ہوں۔“ وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگے تو میں نے مزید کہا کہ اگر وہ مزید کتابی دینا چاہیں تو وہ بھی دے سکتے ہیں۔ پوچھنے لگے کہ آپ کی ذمہ داری سے جارہے ہیں؟

میں نے بتایا کہ ہوائی جہاز سے۔

بولے: ”وہ دن کا مسئلہ نہیں ہوگا؟“

میں نے کہا کہ ہوائی جہاز سے پارسل لے کر آ رہا ہوں، مگر میں

کے لیے آپ کو صحت کرنا ہوگی۔

میں نے کہا مگر میں اتوار کے دن آنے سے معذرت چاہوں گا کیونکہ اتوار کو میں خود بہت مصروف ہوتا ہوں۔

بولے: ”میں آپ کسی بھی دن کسی بھی وقت آ سکتے ہیں۔“

میں دن کے گیارہ بجے کے بعد آئے گا۔

میں دوسرے دن بارہ بجے ان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بہت دیر تک بائیں کرتے رہے اور پھر بولے کہ میری پہلے ہی ڈاک پر مٹی کا قوطی خراب ہو گیا ہے اب میں بھارت جانے والے کسی شخص کے ہاتھ سے بھیجا ہوا کہ یہ کتابیں اب دکن اور

بجھاتے ان تک پہنچ جائیں گی۔

ہمارے ایک بزرگ کرم فرما عبدالہاب خان سلیم صاحب تھے جو نیو یارک میں رہتے تھے۔ پاک و ہند کی تمام بڑی ادبی شخصیات سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ وہاب صاحب نیو یارک میں ایک بڑی ذاتی لائبریری کے مالک بھی تھے جس میں بالخصوص چار موضوعات یعنی خودنوشت، سوانح عمری، خاکے اور سترے پر دو کتب خانہ بڑی لائبریریوں سے کہیں زیادہ ذخیرہ ہے۔ خصوصاً سترے و عمرے کے سترے سب سے زیادہ ان کی لائبریری میں ہیں۔ کتب کے علاوہ مخطوطے اور قدیم کتابوں کی فوٹو کاپیاں کتابی شکل میں ان کے پاس ہیں۔ بڑا بڑا کتابت خانہ ہے جو بلاشبہ لاکھوں امریکی ڈالر کی مالیت رکھتا ہے۔ کتابوں کے حصول کے لیے روپیہ پیسہ کی کوئی اہمیت ان کی نظر میں نہیں ہے۔ صاحب مطالعہ، صاحب علم اور مختصر تھے۔ نادر و نایاب یا کسی اہم کتاب کی اشاعت میں دل کھول کر حصہ لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی موضوع کی قدیم کتب سے کتب مفید عام ہوں۔ وہاب صاحب سے جب تعلق قائم ہوا تو ان کی کتب سے ایک دن خوبصورت صاحب کو فون کیا۔

”فرمانیے“ کے مخصوص الفاظ سے خوبصورت صاحب نے فون نہا، میں نے اپنا نام بتایا تو فون میں اپنا نیت کا احساس ہوا۔ میں نے وہاب کا پیغام دیا، واصل خوبصورت صاحب ہی کا کام تھا جسے میں نے وہاب صاحب کے کہنے پر انجام دینا تھا۔ بولے آپ تعریف لے آئیے۔ میں نے اتوار کے دن آنے پر مجبوری کا اظہار کیا تو بولے آپ کسی بھی وقت آ سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں کل کیا رہا ہوں، دن میں حاضر ہوں گا۔ بولے بہتر ہے۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر پہنچا، تیل دی، چند ساعت کے بعد اوپر سے ٹام پوچھا گیا، نام بتایا پھر تقریباً پانچ سے سات منٹ ہو کر انتظار کرتے رہے۔ پھر اوپر کا دروازہ کھلا۔ آواز آئی: ”آئیے۔ میں میری عیال پر چڑھ کر اوپر پہنچا۔ دروازے کے بعد

کھڑے تھے۔ مصافحہ کر کے مجھے جھٹک کی طرف اشارہ کیا۔ میں اندر کمرے میں جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ پہلی دفعہ عام دن میں پہنچا تھا اس لیے دروازہ دوسرے کمرے پر بند کر کے لگے کہ میں ابھی ابھی انیسویں کا ایکشن لگا کر بیٹھا تھا۔ میں نے خیریت دریافت کی۔ وہاب صاحب کی امانت پہنچائی اور یہ کہتے ہوئے اجازت چاہی کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے اور ویسے ہی میں اتوار کے علاوہ آتا ہوں۔

کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں۔ جلدی کیا ہے بیٹھے۔ پھر انہوں نے اپنے ملازم لڑکے کو آواز دی اور مجھ سے جانے، ٹھنڈے کا پوچھنے لگے، میں نے ٹکلف سے کام لیا تو بولے کہ موسم گرم ہے اس لیے آپ کو بوتل پلاتے ہیں۔ لڑکے، بوتل لے آئے۔ پھر خوبصورت صاحب نے مجھے کریدنا شروع کیا۔ میں بڑی سعادت مندی سے ان کے سوالات کے جوابات دیتا رہا۔ وہاب صاحب سے واقفیت کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ میں نے بتایا غرض کہ اس دن میں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ان کے پاس بیٹھا پھر اجازت چاہی اور چلا آیا۔ خوبصورت صاحب کی میرے بارے میں تعقیب کافی حد تک عمل ہو چکی تھی اور انہیں اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہو گیا کہ مستقبل میں ان کے کام میں آ سکتا ہوں اس لیے دوبارہ آنے کی دعوت بھی دی۔

وہاب صاحب کا خوبصورت صاحب کے ساتھ معاملہ بہت وسیع تھا اس لیے جب میرے ذہن سے یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر توڑ سے خوبصورت صاحب کے پاس جانے لگا۔ کیونکہ وہاب صاحب کے بہت سے کام خوبصورت صاحب سے ہوتے اور کچھ کام خوبصورت صاحب کے وہاب صاحب سے ہوتے۔ میں ان دنوں کے درمیان نامہ بردار کیا اور یوں ان کے وہ تین نکات جس پر انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے اصول کو قائم رکھا تھا، اس طرح قائم نہ رہ سکے کہ اب میں ان کے لیے کسی حد تک کارآمد ہو چکا تھا۔ واصل اس عہد میں سنجیدہ اور مشین العملی بہت کم کر رہے تھے۔

پھر مجھے یاد نہیں کہ ان کے انتقال کے وقت تک میں کتنی بار ان کے ہاں گیا۔ پہلے ان کے پاس ہمارا تھا اور وہ ICMP میں پڑھ رہا تھا، اس لیے وہ اپنی پڑھائی کی وجہ سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ خوبصورت صاحب نے اس کو یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کے لیے دوسرا کواکھ لگا دیا۔ عام دنوں میں عموماً جب گیا مجھے خوبصورت صاحب کے ہاں اور کوئی نظر نہیں آیا، مگر کسی بھی کوئی صاحب نظر آ جاتے تھے۔

خوبصورت صاحب کے بارے میں درج ذیل تین باتیں

سہرے دن

علی سفیان آفاق

پاکستانی فلمی صنعت پر جتنا کھل کر، جتنی تفصیل سے علی سفیان آفاق نے لکھا ہے کسی اور نے نہیں لکھا۔ ان جیسا زور کی بھی کوئی اور نہ ملا، ہر ماہ سو ڈیڑھ سو صفحے لکھ بھیجتے تھے۔ پرانی فائلیں دیکھ رہا تھا کہ یہ تحریر نظر آگئی اور اسے بطور ٹریک کارٹون کی خدمت میں حاضر کر دیا ہوں۔ غور کریں کتنی روانی تھی ان کی تحریر میں۔

لالی دود کے سہرے دنوں کی یادیں



حرف راغب ہوئے اور سحرے موزوں کرنے لگے۔

پاکستان میں بہت سے نامور فن کاروں، گلوکاروں، اداکاروں اور شاعروں کا داخلہ یو پی پاکستان کے رہتے ہوا تھا۔ ان کی شاعری اور گانے سن کر دل بہا کر دیتے تھے۔

یہ شاعری ایک خدا داد عطیہ ہے جسے بھی ل جائے۔ یہ وہ فن ہے جو شوق، عشق، تعلیم و تربیت سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی فطرت میں رچا بسا ہوا ایک وصف ہے جسے انہماکی سے لکھنا پڑتا ہے۔ یہ شاعری کے دوران میں ہی سحر و شاعری کی

سے لوگوں کو حیران کر دیتے۔

خواجہ صاحب کا عیدان چونکہ حقیقت تھا، اس لیے ان کے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ وہ دنیا بھر کے قلم کاروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ یہاں بھی خواجہ صاحب کے ایمر ان کو قلم کاروں کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتے۔ خود مجھ سے خواجہ صاحب نے جب میں لندن گیا تو وہاں کی تقریبات کا مفصل حال پوچھا، مندرجہ بالا کے بارے میں معلوم کرتے رہے۔ جن کا صرف نام سنا تھا، ان کے علمی مرتبے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بھی کئی سعادت مند کی طرح جو کچھ دیکھا، سمجھا اور مشاہدہ میں آیا، ان سے بیان کر دیا۔

خواجہ صاحب کے جتنے دوست اور چاہنے والے تھے اتنے ہی ان کے دوست اور حامد تھے۔ وجہ صاف ہے کہ اس دور میں جہاں ہر طرف جہل سازی کا دور دورہ ہے، ہر شخص شہرت کے قصبہ میں رہ کر چلنے کے لیے بے تاب ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب اس پر اس کی تخلیقات پر یا پھر ان کے مجموعے پر لکھیں۔ خواجہ صاحب کے کالموں کو بغور پڑھیں تو خواجہ صاحب کی شخصیت کا ہر پہلو صاف صاف نظر آتا ہے۔ انہوں نے جتنے کالم لکھے وہ صرف ٹکڑوں و سرائے کے حوالے سے محدود نہیں ہیں بلکہ ان کالموں میں شخصیات کا پس منظر، عادات، افق اور خواہش کے ساتھ ساتھ اس دور کے منظر نامے کی بھی تصویر کشی ہوتی ہے۔

بہر حال مشتاق خواجہ میرے نزدیک اس لیے محترم تھے کہ دور رخ گوئی، سستی شہرت، جہل سازی اور دوغیر کی اس دنیا میں وہ واحد تھے جو جگہ لکھتے تھے۔ کھر لکھتے تھے اور گھبراہٹوں سے پردہ چاک کرتے تھے۔ ایسا تو کوئی بھی کر سکتا ہے مگر ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ایسی جرأت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہمت، حوصلہ اور جراتوری ہی درکار نہیں ہے بلکہ ایک اپنی پشت پناہی بھی درکار ہوتی ہے ورنہ یہاں جگہ بولنے والے کا انجام بھی سب نے دیکھا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی حیثیت کا کوئی ناجائز ٹاکہ نہیں اٹھایا بلکہ ادب کی فضا کی آلودگی مزید پھیلنے سے روکے رکھی کیونکہ ان کی موجودگی میں بہت سے لوگ اس وجہ سے اپنا کام، اپنی کتاب یا اپنا جشن منانے سے احتراز کرتے کہ پھر خواجہ صاحب کے قلم کی کاٹ سے بچنا ان کے لیے محال ہو جاتا۔ ان کے جانے کے بعد اب ادبی فضا نہ صرف پیلے سے زیادہ کثیف، آلودہ اور کھردھری ہو گئی ہے بلکہ یہ

ہاں خواجہ صاحب اپنے دوستوں جن میں زیادہ تعداد بہر قلم کی تھی، کی خوشی اور غمی میں شریک ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب کو شہر، ملک یا بیرون ملک ہونے والی ہر تقریب یا منفل کا آنکھوں دیکھا حال معلوم ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب تقریباً ہر قابل ذکر ادیب اور شاعر کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے تھے۔

خواجہ صاحب خوشی و غمی میں شریک ہوتے تھے۔ میں ایک تقریب کا بھی گواہ ہوں اور وہ تقریب خوشی کی تھی، یعنی ہمارے کرم فرما اور مہربان سید مصطفیٰ علی بریلوی صاحب کے ایک صاحبزادے کی شادی تھی۔ مصطفیٰ صاحب گیت پر مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ مجھ سے بولے کہ ایک میز پر کئی احباب بیٹھے ہوئے ہیں ان کے پاس چلے جائیں مگر جب میں گھڑوں میں پہنچا تو مجھے ایک شناسا ایک میز پر بیٹھے ہوئے نظر آئے، میں سید حلال کے پاس پہنچ گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ خوشی پر بعد کیا دیکھا ہوں کہ مشتاق خواجہ صاحب آ رہے ہیں۔ ان کی نظریں مجھ پر پڑیں، وہ سید حامیری جانب آئے، ہم دونوں اٹھ کر ان سے ملے، وہ ہماری میز پر ہی بیٹھے گئے تو میں نے ان سے کہا کہ خواجہ صاحب وہ آگے کی میز پر چھائی قلم بیٹھے ہوئے ہیں، آپ ان کے ساتھ بیٹھیں۔ پوچھا کون کون ہیں۔ میں نے نام بتائے، نام سن کر بولے، یہیں ٹھیک ہوں۔ پھر ہم تقریباً تین گھنٹے تک ساتھ رہے۔ اس دوران وہ مجھ سے میری ادبی مصروفیت کا پوچھتے رہے، میری لائبریری کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے۔ مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس ٹھکانے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہاں ایک دو ہیں مگر وہ بہت قدیم ہیں۔ تین گھنٹے بعد کھانا کھلا تو ہم بیٹھوں نے کھانا کھایا پھر وہاں سے رخصت ہوئے۔

خواجہ صاحب کو اندرون اور بیرون ملک ہونے والی تقریبات کا ایک ایک حال معلوم ہوتا تھا۔ اس پر مجھے بھی پہلے بہت حیرت ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ جب کسی تقریب پر کالم لکھتے تھے جو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس تقریب میں سب سے آگے والی نشست میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر بعد میں ان کا مطالعہ کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ ان کی مصداق کسی شخصیت کے بہت سے لوگ تو اس طرح ایمر ہیں کہ وہ ان کے قلم پر سب کچھ کرنے کو تیار رہتے ہیں اور خواجہ صاحب مردم شناسی میں تو کوئی کلام نہیں، اس لیے وہ اندرون یا بیرون ملک ہونے والی تقریب میں تقریباً ایک ایک جڑی بات کے آگے گرا کر، پھر وہ اپنے کالم

میں خون لیلیہ کے دوسرے شعبوں کے لیے تیار کرتا تھا۔ سرور انور بھی اسی دروازے سے قلم کی دنیا میں داخل ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کے بعد قلمی صنعت ہی کو شو بزنس کی سرعہ تصور کیا جاتا تھا۔ احمد رشدی، مسعود رانا جیسے گلوکار، مجملی، مصطفیٰ قریشی، قوی، طالش جیسے اداکار اسی راستے سے قلمی دنیا کے دروازے پر دستک دینے آئے اور پھر سینکڑوں بھرا کر لیا بلکہ اس پر حکومت کرنے لگے۔

سرور انور نے بھی کراچی میں گریجویشن کے بعد ریڈیو پاکستان کے دروازوں پر دستک دی اور انہیں شرف پارٹیاں حاصل ہوئی۔ بہت آسانی سے تو نہیں لیکن اپنی صلاحیتوں، ذہانت اور تخلیقی قوتوں کے ثل بوتے پر وہ گیت نگار بن گئے۔ انہوں نے کمرشل اشتہاروں کے جنگل بھی کھسے جو بہت مقبول ہوئے۔ ٹی وی تو اس زمانے میں تھا نہیں۔ ریڈیو ہی کے ذریعے شہر میں اپنی مصنوعات کی تصویر کشی تھی۔ ملک کے گوشے گوشے تک جن کی رسائی ہو جاتی تھی۔ ان اشتہاروں کے جنگل بھی اس قدر بڑا تر ہوئے تھے کہ وہ ذمہ کی زندگی میں ان کا ذکر نہ ہوتا تھا مثلاً.....

چائے پیچھے۔

کون سی جناب؟

پلین پیچھے۔

پلین ہی تو ہے۔

ہوتا یہ تھا کہ آپ کسی کے گھر گئے تو میزبان نے پوچھا۔ ”چائے تو پیچھے ہے؟“

”کون سی جناب؟“

”پلین پیچھے۔“

یہ بھی اشتہاروں کے جنگل کا تہ بھرتے تھے۔ یہ ریڈیو پاکستان کے عروج اور ترقی کا دور تھا جس سے بڑے بڑے نامور لوگ وابستہ رہے۔ شروع میں اکثر گیت نام ہوتے تھے ریڈیو انہیں شہرت دوام کا مالک بنا دیتا تھا۔

سرور انور کو پہلے گیت کا معاوضہ دینے روکے ملا تھا جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ ریڈیو میں مستقبل کے عزم رکھنے والے دوسرے نوجوان بھی تھے جو ایک دوسرے سے حد کرنے کی بجائے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہر طرح، انہیں کامیاب و کامران دیکھا جاتے تھے۔ آج کے آپادھانی، خود غرضی کے دور میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانے میں یہ

ریڈیو میں کام کرنے والوں کی منزل قلمی دنیا تھی۔ سرور انور بھی اس حسین زمین دنیا میں داخلے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ایسٹرن اسٹوڈیو کے ایجنڈہ لیٹ نوجوان ساؤنڈ انجینئر اقبال شہزاد نے قلم سازی شروع کی تو پہلی قلم ”رات کے راہی“ بنائی۔ اقبال یوسف اس کے ہدایت کار تھے۔ یہ زمانہ اور شمس آرا کے ساتھ وہین جلوہ فرماتے۔ یہ قلم زیادہ کامیاب نہ ہوئی مگر اقبال شہزاد کے منہ کو قلم کا مزہ لگ گیا۔ انہوں نے دوسری قلم ”بھاران“ کی منصوبہ بندی کی۔ آغاز میں اس کی ہدایت کاری کے لیے ریڈیو کے ہنرمند اور فن کار ابراہیم رئیس کا انتخاب کیا گیا تھا۔ کہانی ڈاکٹر حسین لکھ رہے تھے۔ موسیقی وجو بھٹا چارہ تھی بنیاد پر تھی۔ اس قلم کے گیتوں کے لیے ابراہیم رئیس، سرور انور کو شہزاد صاحب کے پاس لے گئے۔ اقبال شہزاد نے ایک نو عمر دلہے کی طرح مختصر مدد لی۔ رات سے چلتی ہوئی آنکھوں والے اس لڑکے کو دیکھا تو قلم کے کانوں کی چوٹیں بتا دی۔ سرور انور دوسرے ہی دن چوٹیں کے مطابق دو تین گیت لکھ لائے۔ سب گیت اچھے تھے۔ انتخاب مشکل تھا۔ اس طرح سرور انور کو قلمی صنعت میں گیت نویس کی حیثیت سے داخلہ مل گیا۔

ڈاکٹر حسین ہمارے بے حد محض اور پیارے دوست تھے۔ اقبال شہزاد صاحب سے ہماری دوستی بھی اس کے باوجود کہ وہ کراچی میں رہتے تھے اور ہم لاہور میں۔ وہ اسکرپٹ میں تبدیلیاں چاہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں بہت حساس بلکہ بے لگ تھے۔ معذرت گردی تو شہزاد صاحب نے لاہور آکر ہم سے اسکرپٹ لکھنے کے لیے کہا۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بخوش اجازت دے دی۔ ان دنوں ”نیز“ جیسی پہلی خوب صورت قلم بنانے کے بعد حسن طارق کے پاس کوئی قلم نہ تھی۔ ہم نے شہزاد صاحب اور حسن طارق کو لاہور کے ایک ریسٹوران میں ایک جا کر دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو جانچا اور پسند کر لیا۔ شہزاد صاحب کا خیال تھا کہ ابراہیم رئیس بالکل سہ دہایت کار ہوں گے۔ اپنی دوسری قلم کے لیے وہ ایک تجربہ کار ہدایت کار کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ابراہیم رئیس کی شاندار دلی دیکھی کہ کسی ہیں ویش کے بغیر اس جدلی پر رضامند ہوئے بلکہ حسن طارق صاحب کے معاون خصوصی کے طور پر کام کرنے بھی تیار ہو گئے۔ قلم میں

اور بھائی چارے کے ماحول میں بنی اور بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ جیسے جیسے طرف کے لوگ تھے۔ اب نہ جانے ایسے لوگ پیدا ہوئے کیوں بند ہو گئے۔

”بھاران“ میں سرور انور کے گیتوں نے دھوم مچا دی۔ وجو مراد اور پرویز ملک کے ہفت میں شامل ہونے سے پہلے ہی وہ ایک کامیاب اور مقبول گیت نگار بن چکے تھے۔ ان کی دوسری قلم ”جب سے دیکھا ہے نہیں“ تھی۔ اقبال شہزاد نے قلم ”شرارت“ بنائی تو اس میں بھی سرور انور اور وجو کا اشتراک تھا۔ مسعود رانا کا گایا ہوا یہ نغمہ آج بھی کانوں میں گونجتا ہے۔

اے دل تجھے اب ان سے یہ بھی شکایت ہے
وہ سامنے بیٹھے ہیں کافی یہ عنایت ہے
قلمیں پرویز ملک، وجو مراد، سہیل رعنا اور سرور انور کے ہفت کی قلموں سے پہلے بن چکی تھیں۔ پرویز ملک، وجو مراد کے بچپن کے دوست تھے۔ سرور انور سے پرویز ملک کی دوستی ہوئی۔ سہیل رعنا نے تو چاروں اکٹھے ہو کر ”میرا چہرہ“ اور ”چہرہ ارمان“ کے نغمے بھی دھاک بٹھا دی۔ ”ارمان“ کے نغمے اور موسیقی غضب ڈھائی۔ اسلئے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم
تہا رہے یا ہم بھلا کیا جنس کے

بھولی بھولی ہوں داستان
گزرا ہوا خیال ہوں

پاکستان کی قلمی صنعت عروج کی جانب رواں دواں تھی کہ 1965ء میں سبر کی جنگ چھڑ گئی۔ ہماری قلم ”کینز“ کی پہلی منظر موسیقی اور منسنگ بلیک آؤٹ کے دنوں میں ہی مکمل ہوئی تھی۔ شاعروں، موسیقاروں، گلوکاروں نے ریڈیو کی چوکت چکڑی اور ایسے قوی اور ملی ترانے تخلیق کیے کہ بھی بھلائے نہ جا سکیں گے۔ آج کے قومی ترانے ان کے مقابلے میں جوش و جذبہ اور تاثر سے خالی اور سخرہ پن لگتے ہیں۔

سرور انور نے بھی اپنے حصے کے نغمے لکھے اور ایسے لکھے کہ چند لغات تو قومی ترانوں کی حیثیت اختیار کر گئے۔

جی بھری اللہ کے
قدم قدم آتا ہے

اپنی جان بڑھ کر دے
پہاڑیوں کی طرح

قوم کے مرد و جاہل
تجھے کیا پیش کروں

سرور انور نے دھرتی کا حق ادا کر دیا۔ دوسرے شاعروں، گلوکاروں اور فنکاروں کی طرح وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

”سوتلی دھرتی اللہ کے“ سرور انور نے لکھا۔ سہیل رعنا نے اس کی طرز بنائی۔ مشرقی پاکستان کی گلوکار شہناز بیگم نے پہلی بار یہ نغمہ گایا تھا جس میں شاید ہی کوئی گلوکارہ بلکہ اداکارہ ایسی ہو جس نے یہ نغمہ گایا ہو۔ یہاں تک کہ کراچی کے ایک جلسہ عام میں وزیراعظم یحیٰی اس کے گانے میں شریک ہو گئے تھے۔ یہ بے حد سادہ، موثر اور جذبہ سے بھرپور نغمہ ہے جس کی طرز بے حد معنی اور آسان ہے۔ ہر شخص اسے گا سکتا ہے اور شاید اسی لیے گا بھی ہے۔ آپ نے بھی شاید بھی گایا ہو۔ نہ گایا ہو تو ابھی آزا کر دیکھ لیجئے۔

سرور انور کے اس نغمے کو ایک طرح سے قومی ترانے کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر سرور انور نے صرف یہی ایک نغمہ لکھا ہوتا تب بھی ان کا نام ہمیشہ کے لیے تابندہ ہو جاتا۔ انہیں خود بھی اس پر بہت فخر دیتا تھا۔

اس سے پہلے سرور انور کراچی میں مقیم تھے مگر جب قلموں میں مالک بن گئے تو قلمی منڈی لاہور کا رخ کیا۔ ان کے دوسرے بہت سے ساتھی بھی لاہور آ گئے تھے یا آتے جاتے رہتے تھے۔

اقبال شہزاد نے سعادت حسن منٹو کے افسانے ”جھمکے“ پر قلم ”بدنام“ بنائی تو یہ لکھنے کے لیے سرور انور کی خدمات حاصل کیں۔ ”بدنام“ کے موسیقار بھی وہی تھے۔ اس کے سبھی گانے بہت ہوئے مگر شریا مٹا نگر کی گائی ہوئی ایک غزل نے تو سرحد پار بھی پہل چا دی۔ اس غزل نے شریا مٹا نگر کو بھی شہرت دوام بخشی۔ دراصل یہ غزل سرور انور نے ریڈیو پاکستان کے لیے ریکارڈ کرائی تھی۔ اقبال شہزاد نے اس کے حقوق حاصل کر لیے اور اپنی قلم ”بدنام“ میں شامل کر لیا۔

بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے
نہیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا
شری مٹا نگر کی مخصوص گائیکی ہوئی آواز میں ریکارڈ ہونے والی یہ غزل مقبولیت کی ایک تاریخ بن گئی۔ اس زمانے میں ریڈیو سولن بہترین فرما کی قلموں کے لیے

جاتے تھے لیکن اس گانے نے ایک نئی تاریخ مرتب کر دی۔
 "بدنام" کے دوسرے نغمے بھی بہت مقبول ہوئے۔
 شکار مسووران کی آواز میں یہ گانا۔
 ہم بھی مسافر تھے ہم بھی مسافر
 کون کسی کا ہوئے
 کا بے چارے چپ چپ دوئے
 سرور انور کے جس سزا کا آواز ہو چکا تھا وہ ان کی
 زندگی کے آخری سال تک جاری رہا اور وہ مسلسل آگے ہی
 بڑھتے رہے۔ انہوں نے اپنی ملا جلیوں کا بھرپور اظہار
 کیا۔ بہرہ برتوں کے نئے اور اسکرپٹ لکھے۔ فلموں کی
 ہدایت کاری کی۔ فلم سازی کا بھی مزہ چکھا مگر پھر یہ سوچا کہ
 تو بگاری ہی ان کا مخصوص میدان ہے۔ سرور انور لیرک
 لکھنے والوں میں ایک ممتاز مقام کے مالک تھے۔ بھارت
 میں بھی ان کے مقابل کم ہی تھے۔ بہت تیزی سے سوچتے
 تھے اور انتہائی زود لوگوں سے مگر معیار ایسا کر لگتا تھا جیسے
 ہفتوں، مہینوں کے سوچ بچار کے بعد تو لکھا گیا ہے۔ انہوں
 نے دوسرے زائد فلموں کے نقاشات اور درجنوں فلموں کے
 اسکرپٹ لکھے جن میں سے بیشتر کامیابی سے ہنسنا رہ گئے۔
 وہ ایک خوش نصیب گیت نگار تھے۔ فلم ہٹ ہوتی تو ان کا فخر
 ضرور ہٹ ہو جاتا تھا۔ ان کے مقبول اور کامیاب فلموں کی
 ایک طویل فہرست ہے۔ چند ملاحظہ کیجئے۔
 اک تھم اور میری جاں ابھی جاں باقی ہے۔ (صاحبت)
 آپ دل کی انجمن میں حسن بندہ کر آگئے (انجمن)
 اللہ کی اللہ کیا کرو دھندہ نہ تو پا کرو (پچکان)
 میرا تھم سے ایسا بندھن ہے (قربانی)
 اک بار تو ہم سے تو سوا رہیں گے
 پریم کو کہاں ایسے طلب کا رہیں گے (بولی)
 دیکھا جیرا اجو تو دل تھم لو گے (حلاش)
 بیاد کی یاد دگاہوں میں چائے رکنا (حلاش)
 سچا تیرا نام ہے مولا (پایزو)
 نوئے دلوں کا سہارا میرے اللہ تیرا نام (پاکیزہ)
 میں جس دن بھلا دوں گے (خوشبو)
 کچھ مہنگائی نے لوٹا (حلاش)
 کلف برطرف جاناں (قربانی)
 تیرا پار میرے جیون کے سنگ رہے گا (پچکان)
 یہ تیرا بھول سا چہرہ (آدنی)
 ماماں ان کا انسان بنا رہا ہے (احسان)

بے ایمان چاہوں تھے مجھ شام (جب جب بھول گئے)
 اس کے سوا میں اور کون کیا (بیوی ہو تو لکھی)
 یوں زندگی کی راہ میں نکرا گیا کوئی
 اک روشنی اندھیرے میں دکھایا کوئی (آگ)
 ایسے بھی ہیں مہرباں زندگی کی راہ میں
 جب ملے تو یوں لے جیسے جانے نہیں (جیسے جانے نہیں)
 کیا جانتی تھی کیا بھروسا (جب جب بھول گئے)
 دل کو بھلا تا ہم نے چھوڑا یا چھوڑ دیا (عبت زندگی ہے)
 بیاد کی یاد دگاہوں میں چھائے رکنا (حلاش)
 اسے دل اپنا درو چھائے (پچکان)
 تو ہے نصیبوں والی (ہم دونوں)
 لو تیرا میرے سن کا (نارانی)
 تقدیر کے ہاتھوں میں بھلا تا ہے آدنی (آدنی)
 میں ہوں راستے کا چہر (راستے کا چہر)
 دل دے کے تم کو احسان کیا ہے (نارانی)
 کبھی خواہشوں نے لوٹا
 کبھی حسرتوں نے مارا (مہربانی)
 ترے ہاتھ میں گئے نہ ہم (مہربانی)
 پیاسی نگاہوں میں (آرزو)
 دھن کرنا ہے تو پھر (زنجیر)
 بچے دلوں کی یادوں کو کیسے میں بھلاؤں
 اسے دل کیسے میں بھلاؤں (آگ)
 رت بدلے چاہے تو میرے نصیب)
 اسے ابر کرم آج اتار دے اس کا جس کو وہ جانتے ہیں
 اسے بہار دگوار بنا (صاحبت)
 سرور انور نے قریباً سبھی ناموز موسیقاروں کے
 ساتھ کام کیا۔ ممتاز ہدایت کاروں، ناٹی گراں، ٹھکانوں کے
 ساتھ انہیں کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ ایک منکسر الملو اچ،
 جس کھ اور کسی بھی طرح منور یا نا رکھنے والے انسان نہ
 تھے۔ اول تا آخر ایک ہی روش، ایک ہی انداز پر کاغذ
 رہے۔ نہ غرور نہ تکبر، انکساری اتنی کہ حیرت ہوتی تھی۔ ہر
 کام کے لیے آمادہ۔ ہر ایک منصوبے کے لیے کمر بستہ۔
 دوستوں کے دوست۔ دشمنی ان کی کسی سے بھی نہیں تھی۔
 برائی، عجب جوتی، حسد ان کی فطرت ہی میں شامل نہ تھے۔
 اپنے ہم عصروں کی تعریف میں کسی گل سے کام نہیں لیا۔
 سرور انور کو بے شمار روز اور اعزاز ملے۔ انتقال
 کے وقت ان کی عمر 72 سال تھی۔ ان کا انتقال
 2022ء

ملا۔ دراصل وہ اس قدر نرم خور منکسر الملو اچ تھے کہ کسی کو اپنی
 ملا۔ دراصل وہ اس قدر نرم خور منکسر الملو اچ تھے کہ کسی کو اپنی
 بڑائی اور نصیبت کا اندازہ ہی نہ ہونے دیتے تھے۔ ایسے
 سادہ سادہ دل تھیں ملا جلیوں سے بھرپور لوگ ہماری فلمی
 صنعت میں ایک زمانے میں تو بہت سے تھے۔ بعد میں یہ
 سب رفتہ رفتہ مٹا ہوئے۔ شاید قضا کر جال اسی کو کہتے ہیں۔
 سرور انور کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے۔ ان کا
 پس منظر بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ وہ خود شریلیے اور کم سخن
 تھے (اپنے بارے میں) اپنی بات بہت کم اور بوقت
 ضرورت ہی کرتے تھے۔ انشوروی بھی انہوں نے بہت کم
 دیے یا شاید وہ سب میں اپنے کھلے ہوئے تھے کہ کسی کو
 خیال ہی نہ آئے کہ سرور انور کا بھی انداز کرنا چاہیے۔
 سرور انور ان کا فلمی نام تھا۔ اصلی نام انور علی تھا۔
 بھلا کہاں انور علی اور کہاں سرور انور مگر یہ فلمی نام ان کو اس
 لحاظ سے چنا تھا کہ ہر وقت سرور رہتے تھے۔ ہم نے بھی
 انہیں برائیاں، غم زدہ یا ڈپریشن نہیں دیکھا۔ کبھی ٹھوڑی دیر
 کے لیے سوچ میں پائے گئے مگر ذرا چھیڑا تو ہنسنے پونے
 لگے۔ وہ اس بات کے قائل تھے۔ میرا بیگام، محبت ہے
 چال تک پہنچے۔
 شطرنج کی جائے ولادت ہے۔ یہ شہر انگریزوں کے
 دل میں مرکزی حکومت کا صدر مقام اور وائسرائے کا
 موسم گرما کا پایہ کو کر تھا۔ بہت خوب صورت، شاداب، سرور
 اور تاریخی شہر ہے۔ اپنے پانچ بھائیوں اور دو بہنوں میں وہ
 سب سے چھوٹے تھے۔ سنے آئے تھے کہ چھوٹا بھوتا ہوتا ہے
 مگر یہاں معاملہ الٹ تھا۔ ایک متوسط تعلیم یافتہ گھرانے
 سے ان کا تعلق تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان
 کراچی میں آباد ہو گیا تھا پھر فلمی مصروفیات انہیں کھینچ کر
 لاہور لے آئیں۔ پس ماندگان میں ایک بیوہ اور ایک بیٹا
 چھوڑا ہے۔
 سرور صاحب سے ہماری دوستی لاہور میں ہوئی۔
 ملاقات تو کراچی میں بھی رہی تھی۔ ہر وقت ہنسنے ہنساتے
 رہتے تھے اس لیے قربت ہو گئی۔ ہماری بہت کم فلموں کے
 گیت انہوں نے لکھے ہیں مگر خوب لکھے ہیں۔ "غم" "آس" کا
 گیت
 کوئی یوں بھی روکتا ہے
 مانا میری خطا ہے
 مگر اب معاف کر دو
 2022ء

انہوں نے لکھے تھے۔ ان کی سب سے بڑی قربانی ان کا
 وقت پر نہ پہنچنا تھا۔ کبھی دن بھر کا وقت ہے۔ وہ پانچ بجے
 منکراتے ہوئے آجائیں گے۔ غم سادہ ہدایت کار اور
 موسیقار آتش بدماں جیسے سنگ رہے ہیں مگر سرور صاحب
 یوں منکراتے ہوئے آتے اور کوئی واقعہ یا الحظ اس طرح
 سنا تا شروع کر دیتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ہم ان کی اس
 عادت سے بہت تالاں تھے۔ ان کے ساتھ کام نہ کرنے کا
 سب سے بڑا سبب بھی یہی تھا۔ "ظلم" یا "کیم" کے ایک گیت کا
 واقعہ بیان کر رہے ہیں کہ جب وہ پورے ایک دن غائب
 رہے تو ہم نے سلیم قاسمی صاحب کو بلا لیا تھا۔
 سرور انور خوبیاں کا مرجع تھے۔ برائی ڈھونڈنے
 سے نہیں ملتی تھی مگر ایک دو برائیاں ان پر شرح تھیں۔ انہیں
 ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پان اور تاش ان کی
 کزور ہاں تھیں۔ ایک زمانے میں سگریٹ نوشی بھی کرتے
 تھے جوں کے پہلے کھلے کے بعد ترک کر دی تھی مگر پان اور
 تاش آخر دم تک ان کے ہوم رہے۔ جب وہ ملاقات سے یا
 گھر سے غائب ہوتے تھے تو جاننے والے جانتے تھے کہ
 کتنی تاش کھیل رہے ہوں گے۔ یہ بھی نہیں کہ جہاد
 تھے۔ جی نہیں۔ بس تاش کے دیا تھے۔ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ
 گئے پھر وہ دنیا و مافیاء سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ بیگم سے
 بہت محبت اور ان کا بہت احترام کرتے تھے مگر تاش کھیلنے بیٹھتے
 تو سب کچھ بھول جاتے۔ رات کے نہ لگاتے ہر جگہ،
 کھپائی سی منکراہٹ چہرے پر نہایت آتے تو بیوی کا سامنا
 غصہ بھی غائب ہو جاتا تھا۔ دراصل وہ بچوں کی طرح مصمم
 اور سیدھے سادے تھے۔ کوئی چالاکی، بہانے بازی کری
 نہیں سکتے تھے۔ ہم کہا کرتے تھے کہ جیسے اشتہار ہوتے ہیں
 کہ جہاں ہے جس حال میں ہے کی بنیادینڈر مطلوب
 ہیں۔ اس طرح ان کا بھی معاملہ تھا کہ جہاں ہیں، جیسے ہیں،
 جس حال میں ہیں مگر مطلوب ہیں۔
 بہت پھرتیے مستعد اور محنت کش تھے۔ زیادہ کھانے
 کے شوقین بھی نہ تھے۔ بس پان، چائے اور سگریٹ کے
 عادی تھے۔ شاید یہی دل کے عارضے کے اسباب بن گئے۔
 سگریٹ سے باز آئے مگر پان اور تاش سے منہ نہ موڑا۔
 چائے بھی کم کر دی تھی۔ کہتے تھے کہ اننگ کرتا ہوں۔ اللہ
 جانے۔ ایک دو بار معمولی سے جھٹکے لگے تو چند دن اسپتال
 میں رہ کر آگئے۔ تمام مصروفیات حسب معمول شروع ہو
 گئے۔ وہ ان کا وقت، بھلاؤں کا احترام، ان کی

کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اسی لیے انسان آخر دم تک بیماری سے جنگ کرتا رہتا ہے لیکن جب آلات جنگ ہی میسر نہ ہوں تو یہ جنگ نہیں بے بسی کی موت کہلاتی ہے یا پھر خودکشی۔

شام چوراسی گھرانے کے بارے میں ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شام چوراسی ایک گاؤں کا نام ہے جو جالندھر (بھارتی پنجاب) سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ اس گاؤں میں موسیقی کے ایک خاندان نے اس فن میں بہت نام پیدا کیا۔ ایک مخصوص انداز کی گانگی کو اپنایا جس نے شام چوراسی گھرانے یا شام چوراسی اسکول کا نام پایا اور اسی نام سے نہ صرف برصغیر میں بلکہ ساری دنیا میں شہرت حاصل کی۔ یہ دو بھائی تھے۔ سلامت علی خان و نزاکت علی خان۔ ان کے والد ولایت علی خان ایک نامور اور مہتمم موسیقار اور گلوکار تھے۔ دھرم دے گانے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ دونوں بھائیوں سلامت علی خان اور نزاکت علی خان نے شام چوراسی کے گاؤں میں جنم لیا اور وہیں موسیقی کی خاندانی وراثت کے حوالے سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔

نزاکت علی خان بڑے بھائی تھے اور سلامت علی خان چھوٹے۔ ان دونوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور کا رخ کیا جو قیام پاکستان سے پہلے بھی فن کا کھوروں تھا۔ دونوں بھائی لاہور آئے اور لاہور کے ریڈیو اسٹیشن سے موسیقی کے پروگراموں میں حصہ لیا۔ یہ چالیس کی دہائی کا ذکر ہے۔ سلامت علی خان نے ریڈیو پروگراموں کے ذریعے شہرت حاصل کی کہ اس زمانے میں یہی اکتھارٹن کا واحد ذریعہ تھا۔ جالندھر میں ہر سال ایک میلہ منعقد ہوتا تھا جس میں ہندوستان کے تمام گوشوں سے آنے والے موسیقار، گانگی اور سازندے شریک ہو کر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا جاسکتا ہے کہ اس میلے کے مقابلے موسیقی کی کارروائی آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے نشر کی جاتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد آج بھی اس روایت کو دور درشن نے تازہ رکھا ہے۔ اس میلے میں ہر سال موسیقی کا مقابلہ منعقد ہوتا ہے جو ریڈیو کے ذریعے نشر کیا جاتا ہے۔ اس میلے میں نادر روزگار فن کاروں کے علاوہ نوآموز اور نووارد فن کار بھی شرکت کرتے تھے۔

بات یہ تھی کہ ان کا تعلق برصغیر کے قدیم ترین موسیقی کے ممتاز گھرانوں سے ہے اور گانا سیک موسیقی میں انہیں ماہر اور جانا جاتا ہے۔ ان کی اکثریت گلوکاری یا گانگی میں مہارت رکھتی ہے اور اپنے اسی ہنر پر فخر کرتی ہے۔ اس گھرانے کو دھرم دے کی گانگی کا ماہر سمجھا جاتا ہے لیکن نزاکت علی سلامت علی خان نے خیال گانے میں بھی بہت نام پیدا کیا اور اپنا لوہا منوایا۔

اپنے والد ولایت علی خان سے تربیت حاصل کرنے کے علاوہ انہوں نے دوسرے ممتاز گانگیوں سے بھی تربیت حاصل کی۔ شام چوراسی گھرانے کے دوسرے فنکاروں کی طرح نزاکت علی خان، سلامت علی خان نے بھی بھارت میں قیام کرنے کے بجائے پاکستان کو اپنایا۔ ایک زمانہ تھا جب نزاکت علی خان، سلامت علی خان کی جوڑی مل کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی اور انہیں خیال گانے میں ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ ایک زمانہ ان کا معترف تھا۔ جب وہ دونوں کسی محفل میں غمگین ہوتے تو سننے والے سانسیں روک کر ساری ساری رات ان کی ہنرمندی اور موسیقی کی شفافیت اور انارچر حاضری سے محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ ان کے کمال فن کی معراج تھی۔ 75-1974ء میں فیض نامعلوم و جہالت کی بنا پر یہ جوڑی ٹوٹ گئی جس کا فن موسیقی کے پرستاروں کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ گون سا مسئلہ تھا جس نے خون کو خون سے اور دماغ کو فکارتوں کو جداد کر دیا۔ یہ راز آج تک سر بستہ راز ہی ہے۔ نزاکت علی خان تو ایسے پھول ہوئے کہ رفتہ رفتہ آسمان موسیقی سے ہی غائب ہو گئے۔ سلامت علی خان نے اپنے بیٹے رفاقت علی خان کے ساتھ جوڑی بنائی اور یہ دونوں فن کا مظاہرہ کرتے گئے۔ سلامت علی خان، نزاکت علی خان کے جن بھائی اور بھی تھے۔ اختر علی خان اور ذاکر علی خان نے اپنی الگ جوڑی بنائی تھی لیکن جو شہرت سلامت علی خان، نزاکت علی خان کی جوڑی کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہ مل سکی۔ سلامت علی خان کی گانگی کا مخصوص اور انتہائی دل نشیں انداز تھا جس میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ہمسایہ ملک بھارت میں بھی ان کی عظمت اور ہنرمندی کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ لاٹکھنچر جیسی گلوکارہ ان کی مداحوں میں شامل تھیں۔ انہوں نے ایک بار اپنی زندگی میں یہ اعتراف کیا تھا کہ لاٹکھنچر نے ایک بار بذات خود ان سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

راز و آواز سے نوازا تھا جسے وہ انتہائی مہارت سے استعمال کر کے سننے والوں پر سحر طاری کر دیتے تھے۔ ان کی آواز میں سولہ کے علاوہ احساس، نزاکت اور سلیقہ بھی تھا۔ موسیقی کے امور پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ انہوں نے ”میں اور موسیقی“ کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جو موسیقی سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے ایک انتہائی مفید اور کارآمد تحریر ہے۔ وہ گانے کے لیے بہت اچھے کلام کا انتخاب کرتے تھے۔ گانگی میں تالوں، ردیم اور نفس کی انتہائی خوب صورتی سے آمیزش کرنے پر قادر تھے۔ وہ خیال انتہائی خوب صورتی اور موثر انداز میں گاتے تھے۔ انہوں نے اور نزاکت علی خان نے قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں بھارت کے مختلف شہروں میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور اپنی دھاک بٹھا دی۔ دونوں بھائیوں کی جوڑی نے اور علی خان کے بعد سلامت علی خان نے تنہا بھی یورپ اور امریکا میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور بے شمار مداح پیدا کیے۔ یورپ اور امریکا میں پاکستانی کلاسیک موسیقی کو متعارف اور مقبول کرانے میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ وہاں ان کی گانگی کے ویڈیو کیسٹ اور ریکارڈ بھی تیار کیے گئے اور ان کی زیورست مانگ رہی۔ امیر خسرو (مترجم) کی 7 سوویں سالگرہ کے موقع پر ان کا ایک لانگ پلے خصوصی طور پر ریلیز کیا گیا تھا۔

انہوں نے یورپ اور امریکا کے شہروں میں تربیتی مراکز بھی قائم کیے تھے جہاں کلاسیک موسیقی سکھائی جاتی تھی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ان گھلوں میں ان کے پرستار اور شاگرد پاکستان سے گھنٹوں زیادہ ہیں۔ استاد سلامت علی خان کے بعد ان کے صاحب زادے رفاقت علی خان تنہا رہ گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ استاد سلامت علی خان کی آواز کو پیوستہ یاد رکھے گا اور وہ ساری دنیا میں جاودہ جگہ رکھے گا لیکن پاکستان میں گانگی موسیقی کا ایک روشن چراغ اور شام چوراسی گھرانے کا ایک تابندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔

زندگی کے آخری ایام میں وہ پاکستان میں کلاسیک موسیقی کے بارے میں خاصے ناامید اور مایوس تھے۔ بظاہر ان کی مایوسی سے اتفاق کیے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔

اور حیثیت میں بھی بڑے تھے۔ جب بھارتی ان سے لاہور کے کئی چوک کے گانا ریسٹوران میں ملنے ملاقات ہوئی تو ہم اس وقت ایک نوآموز موزیئر تھے جس کی صاحب فہمی اور ادبی دنیا میں اپنا نام اور مقام پیدا کر چکے تھے۔ کئی چوک کے ریسٹوران اس زمانے میں ادیبوں، صحافیوں، شاعروں، فلم والوں اور سب سے بڑھ کر فلم میں کام کرنے والوں سے ہر وقت بھرے رہتے تھے۔ لاہور اس زمانے میں قدوسہ چھوٹا شہر تھا۔ یہاں کی فلمی صنعت بھی از سر نو اپنے قدوں پر کھڑا ہونے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ادبی، سیاسی اور فلمی چراغ کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی اور اخباروں میں کام کرنے والوں کی تعداد بھی آج کے مقابلے میں بہت محدود ہوتی تھی اس لیے کئی چوک کے ریسٹورانوں میں آج سے رات کے یکے ایک ان سب لوگوں کا ہنگامہ اور آج جانا رہتا تھا۔ ایک مسلسل محفل کا سانس ہر ہوش اور ریسٹوران میں آج سے شام تک جاری رہتا تھا۔ ہر ایک کی ہر ایک سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو جانتا تھا۔ ذوق اور طبیعت کے مطابق تعلقات اور دوستی کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ بہت دینی رہتی تھی۔ ہر طرح کے کام کی باتیں، شعر و ادب، فلم، سیاست، ساحت، فلسفہ، دست شای غریبہ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ہر شخص اپنے ہم ذوق لوگوں کو تلاش کر کے ایک الگ میز پر چائے کی پیالی لے کر بیٹھ جاتا تھا اور پھر مل جل کر صبح سے رات کے تک بکشی شب و روز تھے۔ چھوٹا بڑا ہر شاعر اور ادیب یہاں مل جاتا تھا۔ سوائے چند ایسے اصحاب کے جو ریسٹورانوں میں جا کر بیٹھے ہی نہ تھے۔ ان میں سعادت حسن منٹو بھی شامل ہیں۔ وہ حلقہ ادب ذوق کے اجلاسوں میں اور بعض اوقات کافی ہاؤس میں کچھ دیر کے لیے نظر آ جاتے تھے ورنہ اسے مگر تک ہی حد دور رہتے تھے اور وہ ان کی کس آرازی ہوئی تھی۔

فہمی صنعت ابھی بہت چھوٹی اور ”غریب غربا“ جیسی تھی اس لیے فلمی حوالے سے کوئی بھی بہت بڑا یا قد آور نہ تھا اسی لیے سب لوگ کسی گفتف کے بغیر آزادانہ ملنے اور ہر طرح کی باتیں کر لیا کرتے تھے۔

1950-51ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت فیمل صاحب کی عمر تیس بیس سال ہوئی۔ کھانا ہوارنگ، چک دار، ذہن آگین، کچھ ساہو بال اور سب سے نمایاں ان کے

خوش گذار اور خوش لباس آدمی تھے۔ خوش لباسی سے مراد قیمتی لباس نہیں ہے۔ قیمتی لباس کا اس زمانے میں فیض تھا نہ لوگوں کو اس کی استعداد تھی پھر بھی خوش پوش لوگ دو گھوڑا پر سکی کی قیسی یا کرت اور کمین زمین کی چٹون مہکن کر خوش پوش کہلانے کے مستحق ہو جاتے تھے۔ قیسی شٹائی کو ہم نے بند کرتے اور شلوار یا پاجامے میں ہی دیکھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے وہ شلوار کے مقابلے میں کچھ پانچوں کا پاجامہ زیادہ استعمال کرتے تھے۔ واسٹ یا شیر وانی کو آپ رکھی لباس کہہ لیتے۔ قیسی صاحب چٹون قیسی اور کوٹ چٹون میں بھی نظر آئے مگر بہت کم۔ کرت یا جامد اور شیر وانی ہی ان کا پسندیدہ اور عمومی لباس تھا۔ قیسی گھڑ یا رنگی گھڑ کے کرتے بھی پہنتے تھے۔ جیسی خوب صورت شاعری کرتے تھے وہیے ہی خوب صورت اور خوش لباس انسان تھے۔ ادبی بحث و مباحثے میں بھی پیچھے نہ رہے۔ اپنا مفہوم اور مدعا وضاحت کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ بعض معاملات میں وہ ہمیشہ بہت حساس یا پٹائی رہے۔ مثلاً معاشرے اور قلمی صنعت میں شاعر کی اہمیت اور مرے کو بلند کرنے کے لیے وہ ہمیشہ معصوف جگہ رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اچھی شاعری کے بغیر اچھی موسیقی اور نغمہ نہیں بن سکتا۔ گانے کی مقبولیت میں شاعری کو نمایاں حیثیت حاصل ہے مگر شاعر کو اس کی اہمیت کے مطابق معاوضہ اور مقام نہیں ملتا۔ اس لحاظ پر وہ آخر دم تک بحث کرتے رہے۔

قیام پاکستان سے پہلے بھی وہ لاہور میں قلموں کے گیت لکھتے رہے لیکن بد قسمتی سے کوئی قلم عمل نہ ہو پایا۔ شاید اس لیے کہ ان کے جیسے ہیہ اعزاز اور معاذات لکھ دی گئی تھی کہ پاکستان کی پہلی ریڈیو ہونے والی قلم "شیری یاد" میں قیسی شٹائی کے نغمات ہوں گے۔ اس اعتبار سے "شیری یاد" ان کی پہلی قلمی کامیابی تھی۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی لاہور میں دو دو چوں شاعروں کا اجتماع رہتا تھا۔ سحر لدھیانوی بھی لاہور ہی میں تھے۔ احمد راسی، قیسی شٹائی، حمید اختر، اسے حمید وغیرہ کا ہر وقت ساتھ رہتا تھا۔ یہی عجیب بات ہے کہ سحر لدھیانوی کو قلمی شاعری کی حیثیت سے شہرت بھارت جا کر ملی اور لکھی شہرت ہی کہ وہ ضرب انگلی بن گئے۔ شاعر کی اہمیت اور تازہ برداری کا جو طریقہ اور قرینہ انہوں نے بھارت کی قلمی دنیا میں رائج کیا وہ پہلے موجود نہ تھا۔ ان کے ہاں قلمی فروخت اور پڑھنے کا رواج تھا۔

طرح بہتینی میں سحر کو اہمیت، مقام اور دولت حاصل ہے اسی طرح پاکستان کے قلمی گیت نگار کو کیوں حاصل نہیں ہے۔ یہ ان کا کمزور یا مضبوط پہلو تھا۔ اپنے اس حق سے وہ بھی محروم ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے اندر ایک پشمان اور شاعر کی اتنی جھنجھکی تھی کہ بڑے سے بڑے موسیقار یا قلم ساز کے سامنے بھی جھکنے سے روک دیتی تھی۔ وہ عزت کرتے تھے اور عزت کراتے تھے۔ انہوں نے بڑے سے بڑے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا۔ خواجہ خورشید انور، ناصر عنایت حسین، رشید عطرے، ماسٹر قلام حیدر اور ناشاد وغیرہ وغیرہ۔

شاید ہی پاکستان کا کوئی موسیقار ایسا ہو جس کے ساتھ انہوں نے کام نہ کیا ہو اور اپنی شاعری سے نغمات کو نہ جگہ دیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیسی صاحب کی بے پناہ کامیابی میں قیسی شٹائی کی شاعری کا بہت بڑا ہتھوڑا ہے۔ اسی لیے وہ کسی سے دسپے نہ تھے۔ قلم "سزا" کے لیے ہم نے موسیقار ناشاد سے وعدہ کر رکھا تھا۔ قیسی صاحب سے نغمات لکھوانے چاہے تو معلوم ہوا کہ دونوں حضرات میں ان بن ہے۔ بڑی مشکل سے انہیں متایا اور دونوں کی اتنا کا خیال کرتے ہوئے انہیں ایک جا کر دیا۔

"سزا" کا ایک گیت تو یاد پڑا ہوتا ہے ہی پر ہٹ ہو گیا تھا اور ایسا چلا کہ سرحد پار کر کے بہتینی جا پہنچا جہاں اس کی بو بھول کر گئی تھی۔

جب بھی جاہل اس کی صورت بتا لیتے ہیں لوگ ایک چہرے پر کئی چہرے سما لیتے ہیں لوگ اس قلم کے اور نغمات بھی متیل ہوئے مگر بطور قلم ساز یہ قیسی صاحب کے ساتھ ہماری ایک ہی قلم تھی۔ بعد میں دوسرے قلم سازوں کی قلموں میں ہمارا ساتھ ضرور دیا جیسے "دوئی" کے قلم گیت قیسی شٹائی نے لکھے تھے اور کیا گیت لکھے تھے اور اسے حمید نے اس کی کیا خوب صورت دھن بنائی تھی۔

جیسے نہ احب ہے ہماری ملاقاتیں زیادہ تر ان ریستورانوں ہی میں ہوتی رہیں۔ بعد میں نگار خانوں، شاعروں اور دوستوں کے دفتر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان سے ہماری بہت اچھی ملاقات تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔ نہ ہی اسے دوئی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے تعلقات بہت اچھے رہے۔ اس کے علاوہ

ہم نے قیسی صاحب، شمع وار، شاکستہ اور شین قاف کے قلموں میں بہت لطف اٹھایا ہے۔ کوئی اہل زبان بھی لفظ سٹیلے میں بہت ٹوک دیتے یا اہل لفظ کو کچھ اعزاز میں اراہوں قاف سے تاکہ سننے والے کو محسوس نہ ہو مگر غلطی کا منتہی وہاں رہا ہے۔ ہم اکثر حیران رہتے ہیں کہ پنجاب بھارتی کردیا جائے۔ ہم اس طرح کے سنگٹاخ علاقوں میں کے قاف اور شاکستہ کے ساتھ شاعر اور ادیب کیسے بن رہے والے اور کسی بڑے سے بڑا اہل زبان بھی انہیں نہ سمجھنے کی زبان پر بھی بڑے سے بڑا اہل زبان بھی انہیں نہ رکھ سکتا تھا۔ قیسی صاحب بھی ایسے ہی لوگوں میں تھے۔

قیسی صاحب کا معاملہ عجیب تھا۔ شاعر اور ادیب کے رشتے قلموں میں آتے ہیں لیکن قیسی صاحب نے پانچ قلم میں نام اور مقام پیدا کیا۔ ادبی رسائل اور قلموں میں ان کے گھڑ سرائی پائی اور مستند وجید ادبی شاعر تسلیم کیے گئے۔ قلمی شاعری میں تو ان کا مقام بہت بلند تھا مگر ادب میں بھی وہ اعزاز یافتہ اور نامور تھے۔ انہوں نے بھی ادب اور قلمی شاعری میں امتیاز روا نہ رکھا۔ دونوں کو وہ یکساں عزیز اور محترم رکھتے تھے۔ قلمی شاعر ہونے پر انہوں نے بھی دھماکہ نہ دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ان کی قلمی شاعری کا معیار کسی طرح بھی ادبی شاعری سے کم نہ تھا۔

کہنا چاہیے کہ سحر لدھیانوی کی طرح وہ صرف شاعری کرتے تھے اگر قلموں میں اپنا بیانیہ جانے تو وہ قلمی شاعری کہانی تھی۔ ادبی پرچوں اور شاعروں میں جبکہ پائے تو ادبی شاعری تھی۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ قیسی صاحب اکثر دیکھ کر شاعروں میں تازہ کلام سناتے تھے ورنہ ایک نامور ادیب ہے کہ شعر و شاعری میں پرانا کلام سن کر چیخا پڑا کرتے ہیں۔ ان کی آواز میں ٹھنک اور رعب و دبہ تھا۔

شاعرے میں پڑھنے کو توجہ کر لیتے تھے۔ پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا۔ ہم نے بھی انہیں شاعروں میں بیاض باکالی دیکھ کر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ان سے پہلی ملاقات کے بعد ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہمارے تعلقات پانچویں احترام کی بنا پر ہمیشہ یکساں رہے۔ ان کے بعض خیالات اور نظریات سے ہمیں اختلاف بھی رہا مگر وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ قلمی شاعر کی حیثیت ہے ان کے گھر بے لگاتار ہیں۔ ادب کی جانشینی اور شعری نفسی کے ساتھ انہوں نے نہ صرف حسین و بڑا نغمات لکھے ہیں جو

وہ ایک مرتبہ شاعرے میں شرکت کے لیے ہمارے گھر آئے تو وہاں بھی ہمیں قیسی صاحب کی جگہ ان کے بہت سے ادبی دوست تھے۔ قیسی صاحب نے ان سے اپنا قلموں کے لیے گیت لکھوائے۔ وہاں کی قلمی شاعر کی انہیں نے اس کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا کہ ایک پاکستانی شاعر سے بھارتی قلموں میں گیت لکھوانے کا کیا جواز ہے۔ اس معاملے میں ان کے بہت سے بھارتی قلم ساز حامی تھے مگر قیسی صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے مزید غزبات لکھنے سے انکار کر دیا اور قلم سازوں سے لی ہوئی رقم بھی واپس کر دی۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ گزشتہ چند سالوں میں جب بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات انتہائی کشیدہ تھے وہ گیت لکھنے کے لیے بھی پہنچ گئے۔ قلم ساز اور موسیقاروں کی تو عید ہو گئی مگر پاکستان میں ایک طبقے نے اس پر کڑی تنقید کی۔

قیسی صاحب نے اس کے جواب میں کہا: "مگر پاکستان جتنی بھارت بھیج سکتا ہے تو پاکستانی شاعر بھارتی قلم کے لیے گیت کیوں نہیں لکھ سکتا؟"

اسے آپ جواب برائے جواب ہی کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے اس بارے میں لکھا کہ قیسی صاحب کا کام اور جتنی مگرم وغیرہ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ قیسی اور مگرم سے تو بہت بھرتا ہے اور فوراً ہی خالی ہو جاتا ہے۔ شعری اور ادبی تخلیق و فنون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ثقافت اور تجارت میں بہت فرق ہے۔ اس کے بعد ہماری قیسی صاحب سے آئے سامنے ملاقات نہ ہو سکی ورنہ خاصی گرم بحث ہوتی۔ قیسی صاحب دلائل اور بحث کے معاملے میں پارمانے والے نہ تھے۔ دلائل جاری ہی رکھتے تھے خواہ کوئی ان سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔

قیسی شٹائی کی شاعرانہ اتالیقی تھی جس کی بدولت انہوں نے قلم سازوں کو اشتہاروں اور قلم کے کرکٹ میں شاعر کا نام نمایاں طور پر دینے پر مجبور کیا۔ ریڈیو پاکستان سے شاعر کا نام نشر نہیں کیا جاتا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ قیسی صاحب نے اس خلاف ایسی زوردار مچلائی کہ ریڈیو والوں کو ہار مانتے ہی تھے۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان میں بلکہ بھارت میں بھی گیت میں موسیقار اور گھوکار کے ساتھ گیت نگار کا نام نشر کیا جانے لگا۔

قیسی شٹائی کی ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ انہوں نے



فنونِ ادبیاتی رنگوں سے مرصع اومبر 2022ء کا دسواں نمبر

محمد عظیم گیلانی

ایکینہ

ماہنامہ

دلشاد نسیم اور ناہید سلطانہ اختر کے ناول کی دلکش افسانہ

عالیہ حرا کے قلم کا شاہکار مکمل ناول اپنے اختتام پر

شبینہ گل، رضوانہ پرنس، غزالہ عزیز، شیریں حیدر و دیگران کی شاندار تحریریں

پاکیزہ کے مہمان میں

شائستہ آریں نے مدعو کیا

یاسر عباس اور بیگم گوہر عباس کو

اختر شعلات کا ایرانِ افروز مقالہ

سمائل حضرت محمد ﷺ

ادبیاتی رنگوں سے

مکمل ناول سترائی کے بارے میں شائستہ آریں کے حیکمے سوال اور شاعر کے دلچسپ جواب

مرصع اومبر سے بجا، خوب صورت تراشوں پر مبنی، شعر و شاعری سے مرصع اور حسن و بخت

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

مکرمیت کا لہجہ کی ادبی سوسائٹی میں انہیں اپنے شوق کو بھلا دینے کا موقع ملا۔ سوسائٹی کے جلسے میں ایک غزل پڑھی جو انہیں پسند کی گئی کہ پرنس نے انعام کا تمغہ ہرایا۔ 1941ء ہی میں وہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔

قتیل صاحب کے ساتھ یہ الیہ ہوا کہ نو عمر ہی تھے والد کے سامنے سے محروم ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ان کے والد ایک خوش حال زمین دار تھے۔ ناز و نعم میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ والد کے اچانک انتقال کی وجہ سے مگر کی زندگی داروں کا پروردگار کے کاندھوں پر پڑ گیا کیونکہ وہ سب سے بڑے بھائی تھے۔ نا تجربہ کاری اور رشتے داروں کی خود غرضی نے بہت جلد انہیں نکال کر دیا۔ کئی کام کیے مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ گھانا اٹھا کر چھوڑ دیے یہاں تک کہ کھانے کے لالے پڑ گئے۔ زمین جا کا فروخت ہوئی۔

ان حالات میں قلیل شغلی نے اپنے اندر کے شاعر کو نکلتے ہوئے دیکھا اور زرا دلچسپی چلے گئے۔ جہاں ایک بس کہتی تھی۔ میں انہیں ٹھکر کے طور پر ملازمت مل گئی۔ جیسے جعفری مرحوم نے انہیں جلیا بار بس کہتی کے ٹھکر مگر میں کھڑکی کے پیچھے کٹ فروخت کرتے ہوئے دیکھا تھا اور حیران ہوئے تھے کہ مشاعرے میں کلام سنانے والا یہ البیلا نوجوان شاعر بس کہتی میں جگہ ٹھکر ہے اور کٹ فروخت کر رہا ہے۔

مگر یہ کسی انہونی بات بھی نہ تھی۔ اردو کے بہترین افسانہ نگار احمد حسن دانی لاہور کے ایک پوسٹ آفس میں ڈاک کلرک تھے اور خطوں پر فہم لکھا کرتے تھے۔ کون جانتا تھا کہ ایک دن وہ اردو افسانہ نگاری پر بھی اپنے نام کا ٹھکانا لگا دیں گے۔ راجندر سنگھ بیدی کو ان کے دوستوں نے بڑی مشکل سے گلے پر ہانک کر لیا تھا۔ وہ احساس کمتری کا شکار تھے۔ غربت و افلاس۔ اس پر بھائی اور مزید یہ کہ ایک سکھ۔ سوچا کہ میں بھلا اردو افسانہ کیسے لکھ سکتا ہوں مگر یار لوگ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ انہیں ادیب اور افسانہ نگار بنا کر دی دیا۔

اس کے برعکس قلیل شغلی بھی احساس کمتری میں مبتلا نہ رہے۔ انہیں اپنے اوپر اعتماد تھا۔ بہت جلد انہوں نے ٹھکر کی چھوڑ دی اور لاہور پہنچ گئے۔ اس سے پہلے ان کی اردو کے نامور شعرا اور ادیبوں سے ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ وہ سب ان کے معترف تھے۔ اس حوصلہ افزائی نے بھی انہیں

ابتدائی ایام کے سوا صرف قلم کے زور پر روزی کما تے رہے اور کبھی معزک المال بھی نہیں رہے۔ کہنے کو یہ معمولی بات ہے لیکن ہمارے معاشرے اور ملک میں لکھنے والوں کو جتنا کم معاوضہ ادا کیا جاتا ہے اس کے قیاس نظر سے بہت بڑا کارنامہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس فہرست میں کئی کے قلم کاروں کے نام بھی آتے ہیں۔ یہ بھی کسی شاعر یا ادیب کے لیے ایک بہت بڑا انکار ہے۔ قلیل شغلی نے حصولِ پیے بھی کمائے اور قلمی وادبی ایوارڈز بھی حاصل کیے۔ وہ راتوں رات کے سیکرٹری اور "ادب لطیف" کے مدیر بھی رہے۔ قلمی شاعری کا آغاز انہوں نے اس وقت کیا تھا جب پاکستان اور ہندوستان میں بہت قدر آور اور نامور شعرا اس میدان میں شہرت حاصل کر چکے تھے مگر قلیل صاحب اپنے لیے ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

قتیل شغلی کو جاننے والے بہت کم لوگ ان کے اصل نام سے واقف ہیں۔ قلیل شغلی کا اصل نام اورنگ زیب خاں تھا۔ وہ دسمبر 1919ء میں ہری پور ہزارہ کے ایک گاؤں اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوئے تھے۔ اس گاؤں میں چشتی کے عظیم شاعر خوش حال خاں خٹک نے بھی جنم لیا تھا۔ اس اعتبار سے اکوڑہ خٹک کو ایک نمایاں حیثیت اور اہمیت حاصل ہے۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں تیر و تنگ کا رواج عام ہو اور شعر و شاعری بلکہ شکتی تک کو محسوس اور خلاف روایت سمجھا جاتا ہو۔ قلیل شغلی جیسے شاعر کی پیدائش کو قدرت خداوندی کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا لیکن قلمی صلاحیت اور خدا داد حقیقی طاقت کو بھلا کون دے سکتا ہے۔

قتیل پیدائشی شاعر تھے۔ وہ کہیں بھی کسی بھی ماحول میں پیدا ہوتے شاعر ضرور ہوتے۔ افریقا میں پیدا ہوتے تو افریقی زبان میں شاعری کرتے، یورپ میں جنم لیتے تو یورپی زبان کے شاعر ہوتے۔ اس حساب سے اکوڑہ خٹک میں جنم لینے کے بعد تو انہیں پشتو شاعر ہونا چاہیے تھا مگر اردو کے شاعر بن گئے اور شاعر بھی ایسے جن کا شمار ممتاز شعرا میں کیا جاتا ہے۔

کہنے کو وہ سرمدی علاقے میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کے ارد گرد کا علاقہ سرسبز و شاداب اور گستاں تھا۔ جنگی خود رو پھولوں، لہلیاتے ہوئے گھیتوں اور سرسبز میدانوں نے ان کی طبیعت کے شاعرانہ ذوق کو ابھارنے میں بہت مدد کی۔ ہری پور سے ٹھکر کرنے کے بعد وہ راولپنڈی چلے گئے۔

اولی پرچوں میں شائع ہونے کا تھا۔ وہ لاہور آکر "ادب لطیف" میں ملازم ہو گئے مگر وہ تین مہینے تک تنخواہ نہ لی تو یہ ملازمت بھی ترک کر دی۔

اس کے بعد انہوں نے قلمی دنیا کا رخ کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے بھی لاہور میں قلمیں بٹائی جاتی تھیں۔ انہیں برائے نام کام میں مل گیا مگر کوئی ایک قلم بھی ریلیز ہونے کی نوبت نہ آ سکی۔ جس قلم کے بھی انہوں نے نقادانہ کلمے و کھل نہ ہو سکی یا پھر اس کی نمائش نہ ہو سکی۔

قیام پاکستان کے بعد سینہ بچوں کی لاہور سے رخصت ہو گئے تھے اور اپنے جزل نچر دیوان سرداری لال کو لاہور میں اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ یہ بھی ستم غریبی ہے کہ جب وہ دوبارہ پاکستان آئے تو خود دیوان سرداری لال نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ نہ بچوں کی جو کہ ایک ابتدائی شائستگی، مہذب اور باوقار انسان تھے اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکے اور پاکستان سے ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر نہ آئے۔ یہیں میں بھی انہوں نے از سر نو قلم سازی کی مگر ایسا عروج اور کامیابی حاصل نہ ہوئی جیسی کہ غیر منقسم ہندوستان میں انہیں نصیب ہوئی تھی۔

دیوان سرداری لال نے لاہور میں سینہ بچوں کے ہاٹے اور دولت سینے کی پوری کوشش کی۔ عیش و عشرت میں پڑ کر زندگی سے لطف اٹھا دیکھی ہوئے۔ انہوں نے "تیری یاد" کے نام سے ایک قلم شروع کیا جو پاکستان میں تیار ہونے والی اور نمائش پذیر ہونے والی پہلی قلم تھی۔ آشنا پوسٹل اور نامرغاں اس کے مرکزی کردار تھے۔ یہ قلم حسب توقع ناکام رہی مگر اس قلم نے پاکستان میں ریلیز ہونے والی پہلی قلم کی تاریخی حیثیت حاصل کر لی۔ اس کے نقادانہ قلمیں شطانی نے لکھے تھے اور یہ ان کی پہلی قلم تھی۔ اس کے بعد انہوں نے قلموں میں باقاعدہ نقد نگاری شروع کر دی۔ ابتدائی دور میں پاکستان کی قلمی صنعت خستہ و بد حال اور بہت محدود تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی اور اس کے ساتھ ہی قلم سے وابستہ دوسرے لوگوں نے بھی ترقی اور عروج حاصل کیا۔ اس طرح قلمی صنعت کے قدم قدم عروج پانے والوں میں قلمیں شطانی بھی شامل تھے۔ انہوں نے قلموں کے لیے نقد نگاری کی اور بہت اچھے نقادانہ لکھے۔ اس زمانے میں پاکستان میں دوسرے قلمی نقد نگار بھی موجود تھے جن میں سیف الدین سیف، خورشید توغی، فضل ہوشیار پوری، احمد راہی جیسے ہر مند و معروف شاعر بھی شامل تھے۔ گوئی

مقابلہ بہت سخت تھا مگر قلمیں شطانی نے اپنے کام کی اس طرح شناخت کرائی کہ ممتاز نقد نگاروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ دوسرے قلم نگار بھی نمایاں ہو گئے تھے جن میں حمایت علی شاعر، کلیم جٹانی، سرور بارہ بنگوی، اختر یوسف سرور انور، تسلیم فاضل، دیکھی پریم نگر، حبیب جالب، منیر نیازی جیسے شاعر اور ہر مند بھی تھے لیکن قلمیں شطانی نے اس کے باوجود اپنی پہچان برقرار رکھی۔ وہ ہر زمانے میں نمایاں رہے۔

ادور کمال پاشا کی قلم "حاصل" میں ان کا نقد۔
الذلت کی کئی منزل کو چلا
تو پائیں ڈال کے انہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

ایسا مقبول ہوا کہ سارے برصغیر میں دھوم مچ گئی۔ ہر مہذبیت حسین کی طرز اور اقبال بیگم کی آواز میں صدا باند کی ہوا یہ بگڑا ہر زمانے میں برصغیر کے کلاسیک نقادانہ میں شمار کیا جانے لگا۔ اس گانے نے جیسی کے قلم سازوں اور موسیقاروں کو بھی چونکا دیا بلکہ چھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ قلمیں شطانی کے کلاسیک سڑکا آواز تھا۔ انہوں نے سیکڑوں لکھے تھے، گیت لکھے۔ غزلیں لکھیں جن میں سے بیشتر بے حد مقبول ہوئیں۔

قلمیں شطانی کی ایک خوبی یہ بھی کہ وہ گیت، غزل اور قلمی سچے سچے اور جنوں کے مطابق موزوں نقادانہ لکھنے پر قادر تھے۔ ان کے گیتوں میں شغف، ریلیے الفاظ کی آمیزش ان کے حسن میں مزید اضافہ کر دیتی تھی۔

بھٹے آئی نہ یک سے لاج
میں ایسے جھوم کے نامی آج
کہ مختصر نوٹ گئے

ایسے گیتوں نے انہیں ہزار داستان شاعر بنا دیا تھا اور گیتوں نہ ہوتا۔ جو شاعر لوگوں اور اسکول میں طالب علمی کے زمانے میں مشاہدے اور احسان کی بنا پر ایسے گیت لکھ سکتا ہو اسے آگے چل کر قلمیں شطانی ہی بننا تھا۔ ان کے ابتدائی گیت کا نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

مکنتانی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوعدیں
کوئی بدلی تری پازیب سے نگرانی ہے
اس شعر میں انہوں نے اپنے ارد گرد کے خوب صورت ماحول کی بہت خوب صورت عکاسی کی ہے۔ ان کے ابتدائی زمانے کی قلموں میں یہی عکاسی مشاہدات

جو ان کی لکھی ہے رات جدائی کی
جو ان کی لکھی ہے رات جدائی کی
جو ان کی لکھی ہے رات جدائی کی
جو ان کی لکھی ہے رات جدائی کی

ایک قلم نگار کے ساتھ رات گزرنے والی ہے
اک جوتی لکھی ہے کہ رات گزرنے والی ہے
انہوں نے قلمیں شطانی کی کہانی پر مبنی قلم "مکنتانی" لکھے تھے جن میں سے ہر نقد سپر ہٹ تھا۔

ہر مہذبیت حسین میں مکالموں سے زیادہ گانے تھے۔
پاؤں رات جاری ہے
چاند تو سو جاو
سکھ کر مل جاتی ہے

چاند تو سو جاو
ہیں تو آج کی شب
پہلے تک جاگتا ہوگا
بکارت جاتی ہے

چاند تو سو جاو
بکارت اقبال بالو کی آواز میں صدا باند گیا اور آج
بکارت اقبال بالو کی آواز میں صدا باند گیا اور آج
بکارت اقبال بالو کی آواز میں صدا باند گیا اور آج

بکارت اقبال بالو کی آواز میں صدا باند گیا اور آج
بکارت اقبال بالو کی آواز میں صدا باند گیا اور آج
بکارت اقبال بالو کی آواز میں صدا باند گیا اور آج

بکارت اقبال بالو کی آواز میں صدا باند گیا اور آج
بکارت اقبال بالو کی آواز میں صدا باند گیا اور آج
بکارت اقبال بالو کی آواز میں صدا باند گیا اور آج

کے بیشتر نوجوان فنکاروں کی طرح قلمیں شطانی بھی اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ وہ شروع ہی سے قلموں کے لیے نقادانہ لکھنا چاہتے تھے۔ زیادہ وقت قلمی مصروفیات میں گزارنے کی بنا پر وہ تحریک کو زیادہ وقت نہ دے سکے لیکن مرتے دم تک وہ ایک ترقی پسند انسان اور شاعر رہے۔ 82 سال کی عمر میں بھی ان کے دل میں بے غایتی اور سماجی بے انصافی کے خلاف نفرت کی شمع روشن تھی لیکن انہوں نے ساتھ لودھیانوی کی طرح اپنے قلمی گیتوں میں محض ترقی پسندی کا پرچار نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ پاکستان کی پختہ قلمی صنعت میں ترقی پسند قلم سازوں اور ہدایت کاروں کی تعداد زیادہ نہ تھی اور نہ ہی یہاں ایسے موضوعات ملتاے جاتے تھے۔

قلمیں ایک بار لاہور آئے تو پھر ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس کے بعد وہ دنیا بھر میں گھوم آئے مگر جین انہیں لاہور ہی میں آتا تھا۔ وہ اس ملک کی قلمی صنعت کے ساتھ بڑے بڑے تھے۔ اس شہر کی قلمی اور ادبی پیش قدمیوں کے شاہد اور امین تھے۔ اور یہ بھی لاہور کی آب و ہوا اور فضا میں نہ جانے کیا بات ہے کہ جو ایک بار یہاں آیا پس یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ان کی ابتدائی شاعری میں ان کے پند انہی ماحول کارنگ رچا بسا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے شاعر بن گئے جو ساری دنیا کا تھا اور ساری دنیا کے لیے تھا۔ قلمیں شطانی ایک شاعر تھے۔ حسن پرستی اور روئائش ان کے حراج کا ایک لازمی جزو تھا۔ قلم روزگار اور قلم عشق دونوں سے ان کا زندگی بھر کا واسطہ پڑا اور انہوں نے دونوں میں کسی ایک کو بھی شکایت کا موجد نہیں دیا۔ دونوں کے ساتھ انصاف کرتے رہے۔

اک ذرا سا دل ہے جس کو
توڑ کے بھی ختم نہ جاسکتے ہو
قلمیں شطانی نے جب قلمی نقادانہ لکھنے شروع کیے تو ان کا براہ راست مقابلہ بھارت کے نامور اور جدید قلمی شعرا سے بھی تھا جن کی قلمیں ایک زمانے میں کھلے عام پاکستان میں آیا کرتی تھیں۔ ان کے گیت ریڈیو سیلون اور آل انڈیا ریڈیو کے قلمی قلموں کے پروگراموں کے ذریعے دروہام میں گونجنے لگے تھے۔ یہ شاعر تھے سارے اردو ادبی، فکری، بدایوانی، بھوج سلطان پوری، کبھی علمی، جان نثار خیر۔ یہ مقابلہ صرف قلمیں شطانی ہی کا نہ تھا۔ پاکستان کے کسی بھی شاعر کو یہ مقابلہ درپیش تھا اور بھی نے بڑی دل جی اور

فراری

زین مہدی

انہوں نے ایک غیر قانونی نجی جیل میں جنم لیا۔ وہیں اپنے بڑے اس لحاظ سے باہر کی دنیا کی کسی یہ انہیں مطلق معلوم نہ تھا۔ قسطنطنیہ نے پیادری کسی اور وہ اس بینکار کیمنپ سے فرار ہو گئے۔ شہر لاہور تو پر چڑان کے لیے تھی تھی۔ اس عمار و مکار شہر میں ان پر کیا گزری آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ایک ایسے دور کے داستان جس نے شہر پہلی بار دیکھا تھا



واپس نہیں کرتے تو وہ انہیں لا کر اپنی اس خفیہ قبرستان میں بند کر دیتا اور ان سے جبری مشقت کراتا کہ جب تک دم نہ لے لیں تو وہ انہیں زندہ کر کے دیتا ہے۔ اس بگاڑ کے بدلے انہیں ایک سال کی قید دی جاتی ہے۔

دوستو! یہ ایک طویل سرگزشت کا حصہ ہے۔ ہمارے 2020 میں اسی مٹوان سے ایک سچ بیان بھی لکھا گیا تھا کہ انہیں زندہ کر کے دیتا ہے۔ اس بگاڑ کے بدلے انہیں ایک سال کی قید دی جاتی ہے۔

نے انہیں بستر پر لٹا دیا۔ قوت ارادی کے بل پر وہ ہرگز نہیں ہونگے اور گیت لکھنے اور دنیا بھر کے مشاعروں میں شرکت کرنے گئے۔ انہوں نے بھارت جا کر قتلوں کے نقبات کی لکھے مگر فنانس نے ہجر آدھو چا۔ زندگی کے آخری دو سال وہ مختلف پیادریوں سے تیر و آزار سے یہاں تک کہ بستر اور کھانے چیر تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اس معاملے میں وہ تمام نور جہاں کی طرح تھے جو چند سال پہلے تک روشن آنکھوں اور دھندلے چہرے کے ساتھ رات دن گیتوں کی مسما میں مصروف رہا کرتی تھیں مگر آج ایک ایسی پیادری ہو گئی کہ بستر سے لگ گئیں۔ پیادریاں بھی شاید اسی انتظار میں تھیں کہ وہ کمزور ہوں تو ان پر قابو پا لیں۔ ایک کے بعد ایک پیادری ان پر حملہ آور ہوئی یہاں تک کہ وہ ان سے ہار گئیں۔

کچھ ایسا ہی معاملہ قتل صاحب کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ ایک باری سیریس پیادری میں مبتلا ہوئے اور ہر ایک کے بعد ایک پیادری نے انہیں گھیر لیا۔ مگر یہ ان کی قوت ارادی اور روشن دماغی کا ثبوت ہے کہ آخر وقت تک وہ شعر لکھتے رہے۔ میڈم کے لیے گلوکاری اور قتل شفا کی کے لیے گیت نگاری کی علامات تھیں۔ جب ان سے رشتہ ٹوٹا تو زندگی سے بھی رشتہ ٹوٹ گیا لیکن وہ جب تک زندہ رہے۔

سراٹھا کر فخر کے ساتھ زندہ رہے۔ ایک ہی سر ہے جھکا سکا ہوں کس کس کے لیے ان گت مرے خدا اور میں اکیلا آدی قتل شفا کی کے شہری جموں کی تعداد چودہ کے قریب ہے جن میں ہریالی، جٹریگ، مٹریہ، پھوار، مٹ، اپاتیل، آموختہ، روزن، جھومر، برنگہ، ٹھکرو، پرچم، موہلیز اسٹریٹ میں سحرانی شامل ہیں۔

ان کے بڑے بڑے ہم مصروف نے انہیں خراج تحسین پیش کیا اور ان کی شاعری کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ جب بھی بیداو پ بیداو کرے گی دنیا ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا زندگی بھاگ چکی موت کے دروازے سے اب نفس کون سا ایجاد کرے گی دنیا جس سے تو وہ آزاد ہو گئے اور ان کی قید میں گرفتار ہو گئے۔ کہاں ہزارہ کی زمین اور کہاں لاہور کے قبرستان کی مٹی۔ مگر اس سے فرقی بھی کیا جاتا ہے۔ انسان کو ایک دن مٹی ہی میں مل جاتا ہے۔

کا یہ ثبوت کیا کم ہے کہ بھارت میں ان کے نقبات کی نشانیوں کی گئیں۔ دھندلے چہرے کیوں کے توں اپنا لیے گئے۔ یہی پاکستانی قلمی شاعروں کی جیت تھی۔ قتل شفا کی نے بے ہجر قتلوں کے لیے خوب صورت گیت لکھے۔ قاتل، اغیار، دوڑی، انارکلی اور بہت سی نامیں ان کے گیتوں سے جڑ گئے تھیں۔ ساحر لدھیانوی نے انہیں ایک بار دوست کے نام ایک خط میں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔

”برادر! میں نے کہا ہے کہ تم میری طرف سے جو بھی چاہو لکھ سکتے ہو لیکن اگر تم مجھ سے پوچھو تو یہ کیوں گا کہ قتل شفا کی پاکستان کا ساحر لدھیانوی ہے اور ساحر بھارت کا قتل شفا کی۔“

یہ ایک بے حد خود پسند شاعر کا خراج تحسین تھا۔ جو کسی کو گردانتی نہ تھا۔ ان دونوں کی دوستی اتنی گہری اور پائیدار تھی کہ قتل شفا کی نے پاکستان میں چند قتلوں کے لیے ساحر لدھیانوی کے گیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ قتل شفا کی نے قلم سازی بھی کی۔ اور ان کی ہندو قلم ”تھہ خولی“ تھی جو کامیاب نہ ہو سکی مگر انہوں نے ایک اردو قلم بنانے کی کوشش بھی کی مگر قلم سازی کی حیثیت سے وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ کاروبار ان کے بس کی بات نہ تھی۔ احمد عظیم قاسمی ان کے بہت گہرے دوست اور مداح تھے۔ یہ بات دو طرفہ تھی۔ ان دونوں کی دوستی کا سلسلہ نصف صدی سے بھی زیادہ جاری رہا اور اس میں کبھی دراڑ نہ آئی۔ قتل شفا کی نے لگ بھگ 82 سال کی طویل عمر پائی۔ پچاس ساٹھ سال بلکہ اس کے بعد تک وہ بالکل صحت مند رہے۔ ایک زمانے میں انہیں بہت زیادہ دھندلہ ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد ان سے ملے تو وہ بالکل ٹھیک تھے۔ بہت حیرت ہوئی۔

پوچھا ”قتل صاحب آپ کو کس دوائی سے فائدہ ہوا؟“

بولے ”شہد۔ میں نے کثرت سے شہد کا استعمال کیا اور کھینچے۔ ٹھیک ہوں۔“

سنا کہ ایک بار انہیں پارکسٹن کی پیادری ہو گئی مگر قتل شفا کی کی مصروفیات اور سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ چند سال پہلے تک وہ بالکل چاق و چوبند اور صحت مند نظر آتے تھے۔

سائل بھی رہے تھے۔ جن کی یہ انہی اسی جیل میں ہوئی تھی اور ہوش نہ ہونے تک انہوں نے دنیا نہیں دیکھی تھی۔ اسی قید خانے کو دنیا سمجھتے تھے کہ وہ دونوں وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور کراچی آ گئے۔ کراچی آ کر ایک دکان بھرنے انہیں سہارا دے دیا کہ کہیں وہ کسی غلط شخص کے ہاتھ نہ چڑھ جائیں۔ انہوں نے مول کو ایک بھاری جلی سبز جوا کے گھر کھانا بنانے اور چھاڑ پونچھ کرنے کا کام دلوا دیا تھا۔ ساتھ ہی اسے سبز سلطان کے ہاں کا کام بھی مل گیا تھا۔ اور سائل کو سراج صاحب کی دکان پر لگوا دیا تھا۔ اب آگے بڑھیں۔

سے نکل رہے تھے۔ اس نے آسمان کا چاند دیکھا اور اس وقت صرف ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس لڑکی سے پوچھا کہ تیری والدہ کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں کی وضع قطع دیکھ کر سائول حیران ہو گیا۔ اس نے آج تک یہی دیکھا تھا کہ کانوں میں پائیاں لڑکیاں پہنتی ہیں۔ چوڑیاں لڑکیوں کا سنگھار ہے لیکن یہ دونوں ایک ایک کان میں پائیاں پہنتے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں پلاسٹک کی چوڑیاں تھامنے کے لیے دھبے جیسا ہار تھا۔ بال بھی عجیب و غریب انداز میں تراشے ہوئے تھے۔ گدی اور کانوں سے اوپر کے بال وہ سے زیادہ باریک تھے جب کہ سر کے درمیان جیسے میں سر کی کٹائی کی طرح کھڑے بال تھے۔

کی باتیں کر رہا تھا۔ جب شہید جواب دے گیا تو اس نے
 اس کے کہنے پر یہ کیا ہوا ہے؟
 ”یہی جو ایک نوجوان لڑکے کو کرتا چاہیے۔ اب ہم
 اپنے ہونے چاہتے ہیں۔ روزی دینی کچھ سارے محبت کرو کا
 پیام اپنے والے ذرا سے دیکھو کہ کراسے عملی فعل دے
 دے گا۔ ایک لڑکے نے واقعی آنکھ دپا کر مسکراتے ہوئے
 کہا: ”اچھا پاکستانی ذرا منوں میں یہ سب کچھ دکھایا جاتا
 ہے۔“ مخالف کرتا میں پاکستانی نہیں دیکھا۔ ڈائریکٹ
 انگریز کمانڈوں اور سرسے، ہلو کے نے کہا۔
 اس نے ہے یہ یہ تو خوشی کی بات ہے تم انہیں دیکھتے

لڑکے نے دوڑ لگائی اور چاروں دوسرے نے اس کی تھپکی۔ اب حالت یہ تھی کہ آگے آگے لڑکے تھے اور پیچھے پیچھے ساروں۔ کچھ دور تک ان کا چھٹا کرنے کے بعد وہ لوٹ آیا۔ لڑکی اب تک کھڑی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ ”ابھی ہم لوگ لڑنے بھٹکنے والے نہیں ہیں۔ اگر میں ان سے لڑنا تو دو دو تھے۔ اس لیے۔۔۔“ پھر وہ ہنسنے لگا۔

”اچھا تم نے ایک تک کی تھی۔۔۔ میں خود بھی یہی سمجھی کہ تم۔۔۔“ وہ ہنس نکلی۔

☆☆☆
مولیٰ بزریاں لے کر کھٹی میں داخل ہوئی تو اس کے
قدم خود بخود سبز سلطان کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ سبز
سلطان کے ہاں بھی وہ کام کر دیا کرتی تھی۔ انہوں نے بھی
اسے سبز یوں کے لیے پیسے دیے تھے۔ انہیں بزریاں بھی
دیتا تھا۔ وہ ان کے دروازے پر پہنچ کر تیل بجاتی کہ اسے
دروازہ کھلا نظر آئے اور وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ رنگ روم میں
سبز سلطان پہنچی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک بڑی تلی میں جو
چہرے سے ہی خراث لگ دی تھی۔ مولیٰ نے اندر دیکھتے ہی
اکٹیں سلام کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ "میزبم
سبزی۔"

کی طرف مڑ کر بولی۔ "ہاں آپ کیا کر رہی ہیں۔"

"جی کر ان کا عادت ہے۔" بیگم جواد شوہر کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"چوری کرنے کی؟" ثناء کے لہجے میں حیرت تھی۔

"انہی نہیں۔ ہم ان کا نہیں ان کا بات کر رہے ہیں۔"

"الہام تری۔۔۔ ایہم پر ہیسہ الہام لگاتے ہیں۔"

"سڑ جواد چچ کر بولے۔" بیگم۔

"کھامسوں۔" بیگم جواد نہ ہر انگلی رکھ کر بولیں۔ "ہم دیکھ رہے ہیں۔ سادی کے بعد سے اسے ہی کیے جا رہے ہیں۔"

"سڑ جواد پھر چچ کر بولے۔" بیگم۔

"عقنان جو گیم کھینے میں مشغول تھا وہ ہم روک کر مگر نظر اسکرین پر رکھ بولا۔ "یہ ہے کون۔۔۔ شوریے جا رہا ہے۔"

"تیرا لہا ہے۔" بیگم بٹے بٹے انداز میں بولیں۔

"ایسا لہا کہاں سے لہا۔۔۔ اہا ایسا ہوتا ہے۔" عقنان نے کی بورڈ پر ہاتھ چاٹتے ہوئے کہا۔

"اباسے بدلتا۔۔۔ کان پکڑ کر چاند دکھا دیں گے۔"

"اہا ایسا ہوتا ہے۔۔۔ ہر بات پر مانتا ہے۔"

"کیا؟"

"دیکھیں۔" عقنان نے اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناہ بدو کہ ہیں، پرانے جوت پر پتھر۔۔۔ لیکن تو لڑتیں گے۔۔۔ جب سادی کے دن ہمارا گھونٹ اٹھا کے لائیں۔" ثناء کی بات سن کر جواد اٹھ کھڑے ہوئے اور پچھو اور کا

"تائیں۔۔۔ بس۔" بیگم جواد اٹھ کھڑے لہجے میں بولیں۔

"بیکواس بند کرو مگر میں چوری ہوئی ہے۔"

"تھا جھلجھل بھری آواز میں جیتی۔

"کس کے؟" عقنان نے پوچھا۔ اس کی نظریں بند ہو گئیں۔

"اسکرین پر ہیں۔"

"پڑ دی کے۔۔۔ بدعاش۔۔۔ الماری سے روچا چوری ہو گیا۔"

"اچھا اچھا۔" ثناء نے عقنان پر ہنسے۔

"تو میں چوری تھی آپ کو کس پر شک ہے؟"

"ان پر۔" بیگم جواد کی انگلی کا اشارہ شوہر کی طرف تھا۔

"ان کی وجہ سے چوری ہوئی۔"

"عقنان نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"اوا اچھا۔" ثناء نے اس طرح کیے کہ بیگم جواد کی طرف سے چار آدمی نوکر ہیں۔۔۔ میں انتظار بڑا ہوں۔۔۔ پورے چار آدمی نوکر ہیں۔۔۔ مگر کبھی کسی نے وقت کی بھی چوری نہیں کی۔۔۔ سب چم پر آتے تھے اور یہاں۔۔۔ میرے گھر میں سیف سے تم چوری ہو گئی۔۔۔ میں نے سوچا ہے۔" جواد وانی نے بات عمل بھی نہیں کی تھا کہ بیگم جواد بول اٹھیں۔

"اب آپ کچھ نہیں سوچے گا۔۔۔ اب کی بار ہم سوچیں گے۔"

"آپ لوگ سوچتے رہے۔۔۔ یہاں دھنک کر میں چلی۔" ثناء کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہے لیکن وہ بول نہیں پاری اسی لیے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اور پھر۔" اس کا کیا ہو گا؟" عقنان نے کی بورڈ پر انگلیاں روک کر پوچھا۔

"وہ چلا گیا جائے گا۔" ثناء نے دانت چیں کر جواب دیا۔

"کب؟" عقنان نے اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بعد مغرب۔۔۔ وہ آکر کے گا میں نے چوری کی ہے۔"

"آپ لوگ سوچ چکے تو مجھے کوئی کارادیں۔" ثناء نے اپنی کپ کو سر پر بٹھا کر جواب دیا۔

"تو کیا میں نوکر کو نکال دوں؟" جواد صاحب نے مصمم لہجے میں پوچھا۔

"انتاخیر سرد رہے گا اگر آپ ایسی بی صاحب کے دوست نہ ہوتے تو میں مشورہ دینے تھا نے لے جاتی۔ اگر کسی کو نکالنا ہے تو اپنی مرضی سے نکال دیں۔"

"اسی وقت خالد خیرن اندر آ گئے۔ انہوں نے اپنا چشمہ درست کیا اور باری باری سے سب کو دیکھا اور پھر ثناء کی طرف مڑ کر بولی۔ "اے غیا۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔ کئی عیاری ہو آہا۔" عادت کے مطابق انہوں نے دائیں بائیں سر ہلایا تھا۔

"آپ دیکھ نہیں رہیں۔۔۔ میں کون ہوں؟" ثناء نے گزرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں بات ہے کہ پولیس کے کپڑے میں تو ہونے صورت شکل سے بہت شریف دکھ رہی ہو آہا۔" خالد خیرن نے بیگم جواد کی طرف اشارہ کیا۔

ان کی بات پر ثناء کی چوری پر ہل آئے تھے لیکن اس نے کہا۔ "میں پولیس آفیسر ہوں۔"

"اے خالہ ہمارے ہاں چوری ہو گئی۔" بیگم جواد نے جواب میں کہا۔

"مبارک ہو۔۔۔ اب تو چوری خواب ہو گئی ہے۔۔۔ ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے۔۔۔ اب تو ڈاکا پڑتا ہے ڈاکا۔۔۔ آہا۔" خالد خیرن نے چٹکی آواز میں جواب دیا۔

"خالہ آج موڈ میں ہیں۔" جلدی سے بولو کیے آئے ہوا؟

"تمہارے پڑوس میں آئی تھی۔ ایک اچھا رشتہ لے کر آہا۔"

"خالہ کی بات سن کر عقنان نے گم روک دیا اور جتنے ہوئے بولا۔ "اس بٹے ہنس جیسی آواز والی کے لیے؟"

"اولی اللہ۔۔۔ جیسے رہو کیا تعلیم دی ہے۔۔۔ نہیں اس مردانہ آواز والی کے لیے نہیں۔ اس کے بھائی کے لیے آہا۔"

"ہائے اللہ۔۔۔ اس کے لیے جو سب کو نکھسی مارتا ہے۔" بیگم جواد نے کہا۔

"ایسا نہ بولو۔۔۔ تمہارے کی آنکھ میں مسلہ ہے۔"

"ہم سوچ کر تو چھوڑ دیا تھا ورنہ وہ جوت لگاتی۔" بیگم نکھسی مار رہا تھا۔ "سڑ جواد بولیں۔"

"اس کو چھوڑو یہ بتاؤ۔ تمہارے بیٹا ماسٹر بننے کے لیے ایک رشتہ ہے۔ کیا رشتہ ہے آہا۔"

"بیگم جواد نے ناگوار سے خالہ کو دیکھا پھر بولیں۔ "اے بے خالہ ایسا تو نہ بولو، وہ بیٹا ماسٹر نہیں پاپ مگر ہے۔ اس جیسا گناہ بھانے والا کوئی نہیں ہے۔"

"ابھی ان کی آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ آصف کمرے میں داخل ہوا اس کا طبعی ہنسنے لگا تھا کہ دیکھنے والے غصے میں پڑ جائیں کہ یہ ہے کیا چیز۔ سر پر لٹی لٹا مٹھی بھر ہال۔ کانوں میں بڑی بالی۔ انہوں میں چوڑی نما جینز۔ گلے میں گنار۔ اور تو اور ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپٹک۔ اس نے اندر آتے ہی روم میں کہا۔ "سلام۔ سلام۔ سب کو سلام۔"

"وہیکم السلام۔۔۔ آج بیٹا یہاں بیٹھ۔ دیکھ یہ میرے لیے رشتہ لے کر آئی ہیں۔"

"اونوی۔" وہ شرما جانے کی اداکاری کرنے لگا۔

موتے پر بیٹھ کر بولیں۔ "آئے ہائے۔ اس طرح مدرسہ لکھنا کھنی ڈال کے کیوں بیٹھے ہو۔"

"اے خالہ ہمارے ہاں چوری ہو گئی۔" بیگم جواد نے جواب میں کہا۔

"مبارک ہو۔۔۔ اب تو چوری خواب ہو گئی ہے۔۔۔ ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے۔۔۔ اب تو ڈاکا پڑتا ہے ڈاکا۔۔۔ آہا۔" خالد خیرن نے چٹکی آواز میں جواب دیا۔

"خالہ آج موڈ میں ہیں۔" جلدی سے بولو کیے آئے ہوا؟

"تمہارے پڑوس میں آئی تھی۔ ایک اچھا رشتہ لے کر آہا۔"

"خالہ کی بات سن کر عقنان نے گم روک دیا اور جتنے ہوئے بولا۔ "اس بٹے ہنس جیسی آواز والی کے لیے؟"

"اولی اللہ۔۔۔ جیسے رہو کیا تعلیم دی ہے۔۔۔ نہیں اس مردانہ آواز والی کے لیے نہیں۔ اس کے بھائی کے لیے آہا۔"

"ہائے اللہ۔۔۔ اس کے لیے جو سب کو نکھسی مارتا ہے۔" بیگم جواد نے کہا۔

"ایسا نہ بولو۔۔۔ تمہارے کی آنکھ میں مسلہ ہے۔"

"ہم سوچ کر تو چھوڑ دیا تھا ورنہ وہ جوت لگاتی۔" بیگم نکھسی مار رہا تھا۔ "سڑ جواد بولیں۔"

"اس کو چھوڑو یہ بتاؤ۔ تمہارے بیٹا ماسٹر بننے کے لیے ایک رشتہ ہے۔ کیا رشتہ ہے آہا۔"

"بیگم جواد نے ناگوار سے خالہ کو دیکھا پھر بولیں۔ "اے بے خالہ ایسا تو نہ بولو، وہ بیٹا ماسٹر نہیں پاپ مگر ہے۔ اس جیسا گناہ بھانے والا کوئی نہیں ہے۔"

"ابھی ان کی آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ آصف کمرے میں داخل ہوا اس کا طبعی ہنسنے لگا تھا کہ دیکھنے والے غصے میں پڑ جائیں کہ یہ ہے کیا چیز۔ سر پر لٹی لٹا مٹھی بھر ہال۔ کانوں میں بڑی بالی۔ انہوں میں چوڑی نما جینز۔ گلے میں گنار۔ اور تو اور ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپٹک۔ اس نے اندر آتے ہی روم میں کہا۔ "سلام۔ سلام۔ سب کو سلام۔"

"وہیکم السلام۔۔۔ آج بیٹا یہاں بیٹھ۔ دیکھ یہ میرے لیے رشتہ لے کر آئی ہیں۔"

"اونوی۔" وہ شرما جانے کی اداکاری کرنے لگا۔

ایکٹک پر بند ہوا کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔
 رات کا دل بچا تھا۔ قیصر صاحب کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ یہ ان کے سونے کا وقت تھا۔ مول اور سائل بھی کھانے سے نہ کھینچ کر اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ اس وقت مول بیڈ پر لیٹی تھی اور سائل کا روپیہ پرانی دی پر کوئی ڈراما چل رہا تھا۔ مگر آواز بگنی تھی تاکہ قیصر صاحب ڈسٹرب نہ ہوں۔ کچھ دیر تک سائل نے ڈراما دیکھا بلکہ دیکھنے کی کوشش کی مگر یوں اٹاے مول۔ تیری چاکری کبھی چل رہی ہے نہ؟
 ”ارے مت پوچھ۔ ایسے لوگ ہیں کہ تو ان کے ساتھ ایک دن بھی گزار نہ سکے۔ بہت مزہ آتا ہے۔ ایک دن تجھ کو بھی وہاں ملوانے لے جاؤں گی۔ بڑے عجیب لوگ ہیں۔“
 ”مجھے بھی دن بھر ایسے ایسے لوگوں سے پالا پڑتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ اللہ محاف کرے۔ انسان کی اتنی قسمیں ہیں یہ پہلی بار جانتا ہے۔“
 ”کراچی کراچی ہے۔ ہر آدمی ایک ہی کہانی ہے۔“
 ”ہاں رے۔ ہم پہلے سمجھتے تھے کہ بڑے سائیں عالم ہیں لیکن اب پتا چلا کہ ہر آدمی عالم ہے اور ہر آدمی مظلوم بھی ہے۔“
 ”کیا تو عجیب بات ہے کہ ہر آدمی ایک ہی کہانی ہے۔ ایک یا تھہ ہے۔ گوشہ میں تو سب دو طرح کے تھے۔ عالم اور مظلوم۔“
 ”اے مول تجھے گوشہ کی یاد آتی ہے۔“
 ”ہاں آتی تو ہے لیکن دلائی نہیں ہے۔ بس یاد آتی اور میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔“ کہہ کر مول اس دی۔
 ”پتا نہیں بڑے سائیں نے کیا طوفان اٹھایا ہوگا۔ کس کس کی کھال کھینچ لی ہوگی۔“
 ”وہاں تیرا تو کوئی ہے نہیں جس پر ظلم ہوا ہوگا۔ تیری اس جہارت کا بدلہ اس سے لیا ہوگا۔ ہاں میرے بابا سائیں ہیں لیکن وہ اسے ہی جالاک ہیں۔ انہوں نے خود کو بھالایا ہوگا اور سارا اثر اٹھ کر خود مظلوم بن گئے ہوں گے۔“ مول نے کہا اور کروت بدل لی۔ اگر وہ کروت نہ بدلتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو سائل کو دکھ لیتا۔ وہ ماں باپ کے لیے روئی تھی لیکن اپنے آنسو کو کھائی نہیں تھی۔ اندر اندر رو لیتی تھی۔ وہ آنسو پچھ کر کوئی نہ سوچا تھا۔

”وہ تو اٹھنا ہی ہے لیکن یہ پتا ہم اس طرح کسکے ایک ایک سوئے رہیں گے۔ کب تک دوری تم کو کرسکتا۔“
 ”جس تک نکاح نہیں ہو جاتا۔ سائیکے نے بولا تھا۔ ہمارا نکاح کرا دیں گے تاکہ شادی کا ڈھن سنے۔ اب ہم چاہے۔“ مول اندر ہی اندر دھوا چلتی تھی اسی لیے وہ بار بار اسے سونے کو کہہ رہی تھی، سائل نے اس کے ذہم کو چھوڑ دیا تھا۔ اسے ماں باپ کی یاد آنے لگی تھی۔
 ☆☆☆
 عظیم جہاد نے مول کو ایک کام سے مسز سلطان کے یہاں بھیجا تھا۔ وہ کام ہی ایسا تھا کہ خود چاکری نہیں اور نہ کسی اور کو بھیج سکتی تھیں اسی لیے مول کو بھیجا تھا۔ اسے تاکہ کر دینی تھی کہ یہ بات کسی اور کو معلوم نہ ہو۔ مول خود بھی گئی دن سے وہاں جانے کا سوچ رہی تھی۔ اسے ان کی بیٹی کی آواز سننے میں مزہ آتا تھا۔ بانٹل مراد نے آواز دی۔ اسے آواز سن کر ہی آ جاتی تھی۔ وہ اسی تصور میں لاکر لطف لیتی ہوئی ان کے کمرے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔
 ”اچھا وہ دروازے پر پہنچی تھی کسی اس کے سامنے کی مراد پوری ہو گئی۔ اندر سے لگا کر آواز آئی تھی موم ایک بات بولوں۔“
 ”بولو۔“ مسز سلطان کی آواز گونجی۔
 ”مجھے ایک ماسٹر کی ضرورت ہے۔“
 ”یونٹن کے لیے؟“ مسز سلطان نے پوچھا تھا۔ مول کو یہ بات ابھی نہیں لگ رہی تھی کہ وہ دروازے پر کھڑی ہو کر ان لوگوں کی باتیں سن کر لطف لینے کی خاطر وہ کھڑی ہو گئی تھی۔
 ”جی۔“
 ”کسی ایسے کو جنگ سینئر کو جو نہیں کرلو۔“
 ”نہیں میں پڑھنا نہیں چاہتی۔“
 ”پھر؟“
 ”میں گائے کی پریکٹس کروں گی۔۔۔ کسی ایسے ماسٹر کی ضرورت ہے جو موسیقی کی تعلیم دے۔“ لگا کر اس بات پر مول کو زور سے فنی آئی تھی مگر اس نے فنی کو روک لیا تھا۔
 ”اپنی آواز دیکھی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سوختہ ایک ساتھ تیار ہو۔“ مسز سلطان کی اس بات نے مول کے پیٹ میں بل ڈال دیا تھا۔
 ”موم۔۔۔ یہی بات تو نہ کریں۔۔۔ آج کل بیٹھے سر کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔۔ آج کل تو کسے ویڈیو سے کام چلا

خالی کر کے بولیں۔ ناف یہ بڑھا بھی۔۔۔ جڑ جڑ کر رہ گئے۔ کمرے کھلنے کا دل نہ تھا کہ وہ شہو کے لپا لپا کرتے تھے کہ جس کا ایک گلاس پانی بھی بیوقوف کا کام ضرور کر دے اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔“ مگر سانس لے کر بولیں۔“ تم تو کون سے وعدہ جو کر لیا تھا اس لیے دوڑھاگ میں گئی رہی۔ ایک لڑکی دیکھی اور ان لوگوں سے وعدہ بھی کر لیا کہ تم لوگوں کو لے کر آ رہی ہوں۔“
 ”لیکن لڑکی ہے کہی؟“
 ”لڑکی کیا ہے۔۔۔ میرا ہے میرا آہا۔۔۔ بس تم دیکھو رو جاؤ گی۔“
 ”بس مجھے ایسی ہو چاہیے جو کمر کو سنبا لے۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھومنے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سٹینڈرڈ ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک سال کے لیے 12 کتابیات شامل معزناک خرچ پاکستان کے کسی بھی شہر یا دیہات کے لیے 2000 روپے

بیرون ملک کے لیے 25,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

مرزا اشتر عباس: 0301-2454188

مرکز لکھنؤ: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ، سٹینڈرڈ ڈائجسٹ

63-C فیز III، سٹیشن ڈینس ہاؤس، اتھارٹی

مین کورنگی روڈ، کراچی

فاطمہ بنت اسد

نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم کی دختر اور رسول اکرم کے چھوٹے چچا حضرت عبدالمطلب کی بیٹی۔ آپ کا نکاح عبدالمطلب کے فرزند ابوطالب سے ہوا جن سے حضرت علیؓ پیدا ہوئے۔ اس نسبت سے حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی خوشنامی تھی۔ مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو آپ بھی ان کے ہمراہ تشریف لے گئیں۔ ان کی وفات رسول اللہؐ کی زندگی ہی میں ہوئی تھی۔

مرسلہ: نعمان قادری لاہور

نہا۔ اس نے مجھے آنکھ ماری۔ وہ رو دیتے ہیں۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

نہا۔ اس نے مجھے آنکھ ماری۔ وہ رو دیتے ہیں۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

نہا۔ اس نے مجھے آنکھ ماری۔ وہ رو دیتے ہیں۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

ہاں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔ میں بولیں۔ "خالد آپ نے ان کو بتایا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں پتھر ہے۔" مسز سلطان خالد پر ہنس پڑیں۔

نورول کتے کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ ”اور سے بابا کوکور..... کتا۔“

بھونکنے کی آواز سن کر آصف بھی چونک گیا تھا۔ اس نے منہ بنا کر منار کے سر میں کہا۔ ”مجھ کو بھی ڈر لگتا ہے آ۔“ ”ہم کو بہت ڈر لگتا ہے..... میں انجکشن پیٹ میں لاگاتا۔ پوڑے گا بابا۔“ نورول رو دینے والی آواز میں بولا۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ ”او رے بابا یہ تو ذیل ہے..... اس کا کوکور ہے..... کتا..... ڈنجر..... بھاگو۔“

انہیں بھاگتے دیکھ کر کتے نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز سے آواز ملا کر آصف نے راگ الاپنا شروع کر دیا۔ ”یووووو..... پاسٹر ڈڈڈڈ..... ڈوووگ..... کینے..... او کتے..... او کینے..... او کتے اے اے اے۔“

ان لوگوں کو خبر نہ تھی کہ ان دونوں کو باہر جاتے دیکھ کر مول بھی ان کے پیچھے آگئی تھی۔ وہ ان دونوں کا ڈراما دیکھنے کے لیے چلی آئی اور اب آصف کی حرکت پر منہ دبا دبا کر ہنس رہی تھی۔ اسے ہنستے دیکھ کر جلیل صاحب نے اسے گھورا اور اپنا کتا لے کر دوسری جانب مڑ گئے۔ ان کو جاتے دیکھ کر آصف نے ختم کین نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ”نورل کہاں گیا۔“

”وہ تو اب تک گھر پہنچ چکا ہوگا۔ اتنی تیز دوڑا تھا کہ کتا کیا، ہوائی جہاز بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میری مانیں تو آپ بھی اب گھر جائیں۔“

”یس یس اب وہی کروں گا۔“ کہہ کر وہ بھی مڑ گیا۔ سامنے ہی مسز سلطان کا گھر تھا۔ مول نے سوچا کہ ان کے گھر کا بھی ایک چکر لگا آئے۔ وہ ان کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی کچھ ہی دور گئی ہوگی کہ اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ آس پاس کے گھروں کے سامنے بالکونیوں میں کھڑی عورتیں زور زور سے ہنس رہی ہیں۔ وہ ان کی طرف دیکھ ہی رہی تھی کہ ان کے ہنسنے کی وجہ اس کی سمجھ میں آگئی۔ نگار کی چٹکھارٹی ہوئی آواز نے راز کھول دیا تھا کہ وہ لوگ کیوں ہنس رہی ہیں۔ اس نے قدم تیز کر دیے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ایک اور ڈراما منظر ہے۔ جیسے ہی وہ ان کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کی سماعت سے نگار کا بے سُر ار اگ نکرایا۔ ”دل لوجگر لو جان لو..... ہم تمہارے ہیں ضم تم ہمیں پہچان لو۔“

ایسی اردو بولنے سے بہتر ہے کہ انسان خود کشی کر لے۔“ جواد صاحب نے نورل کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہم پونز ابی بھی بولے۔“ جواد صاحب ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ”خدا کے لیے پشتو مت بولنا..... پختون کلاشن کوف چلا دیں گے۔“ ”کیوں کیوں؟“

”اپنی زبان کی بے حرمتی دیکھ کر۔“ ”اششاشش..... ہم پونز ابی بھی بولے گا..... اب چلو ہمارا ساتھ چلو۔“ ”میں کیوں چلوں؟“ جواد صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم آپ کا چاکور..... نوکور..... وہ ہام کو مارا آپ کا بچے..... ابھی چلو۔“

”ابے جسم تیرا..... چٹ تھے لگی۔ میرا کیا..... ایسا کر ٹو آصف کو لے جاوہ گٹار بجا بجا کر اسے گالیاں دے گا۔“ ”ہاں..... موزا ہی موزا..... ہام اس کو لے جائے گا۔“

”موزا مت لے جائیو..... دھلا نہیں ہے بہت بدبو ہو گی۔ آصف کو لے جا۔“ اسی وقت بیگم جواد اندر والے دروازے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ اندر آتے ہی بولیں۔ ”اے لو... وہ مزہ کو موزا بول رہا ہے اور آپ اپنا بدبو دار موزا سمجھ رہے ہیں... اللہ آپ سے سمجھے۔“

نورل جلدی سے بولا۔ ”ہاں شاب بہت اچھا بودھی دیا۔ ایسا عقل والا بات بولا..... ہم آپ کا موزا لے جائے گا۔ اس کے ناک پر مار کر موزا لے گا۔ کوب موزا لے گا۔ چلو آصف بھائی۔“ کہتے ہوئے اس نے آصف کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب کھینچنا ہوا چلا۔ باہر آ کر اس نے آصف سے کہا۔ ”آصف بھائی آپ اس کو دو تھپوڑ مارے گا۔“

آصف نے گٹار بجا کر سُر میں جواب دیا۔ ”میں مار..... آ آ..... مار پیٹ نہیں کرتا آ آ۔“ ”اششاشش..... مارے گا ہم..... آپ ہم کو پچائے گا۔“

”پل ادے آ آ۔“ آصف نے پھر تان ماری۔ وہ دونوں جلیل صاحب کے بیٹے کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ اندر سے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

موتمر عالم اسلامی

(دورلہ مسلم کانفرنس) مسلمانان عالم کی ایک عالمگیر تنظیم۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ 1926ء میں مسلمانان عالم کی موتمر (کانفرنس) شاہ عبدالعزیز ابن سعود کی دعوت پر مکہ معظمہ میں منعقد ہوئی۔ اندونیشیا سے عمر سوکرہنیوتو، ہندوستان سے مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی، ملتی کفایت اللہ، علامہ سید سلیمان ندوی، فلسطین سے مفتی اعظم سید محمد ائین السنی، لبنان سے علامہ رشید رضا، الحاج شیخ اسماعیل الحافظ، مصر سے شیخ الاسلام محمد انصواہری، ترکی سے جناب ثروت بے جیسے اہم قائدین نے شرکت کی اور مسلمانان عالم کے مسائل پر غور و خوض کیا۔

دوسری موتمر 1931ء میں مفتی اعظم سید محمد ائین السنی کی دعوت پر بیت المقدس میں منعقد ہوئی۔ اس موتمر میں عراق سے مشہور آیتا کبرآیت اللہ کاشف الغطاء، ایران سے ضیاء الدین طباطبائی، شام سے شہری القزوی، لبنان سے ریاض اسرار، مصر سے صوبہ پاشا، جارجیا سے سعید شال، ترکستان سے ابازے، الحاقی، ہندوستان سے علامہ اقبال، مولانا شوکت علی، مولانا فتح دادوی اور مولانا غلام رسول میریسے اکابرین نے شرکت کی۔ اس موتمر کے بعد مفتی اعظم کی نگرانی میں موتمر عالم اسلامی کا ایک باقاعدہ سیکرٹریٹ بیت المقدس میں قائم ہوا اور ضیاء الدین طباطبائی سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔

11 تا 19 فروری 1949ء کو تیسری موتمر کراچی میں منعقد ہوئی۔ مدعوین میں علامہ شبیر احمد عثمانی، پروفیسر ابو بکر احمد طیم، خواجه شہاب الدین اور عبداللطیف بادانی کے نام سرفہرست ہیں۔ افتتاح گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے کیا۔ فیصلہ ہوا کہ اس کو مکہ شریف والی پہلی موتمر عالم اسلامی، کے نام پر موتمر عالم اسلامی کے نام سے موسوم کیا جائے۔ دو سال بعد فروری 1951ء میں چوتھی موتمر بھی کراچی ہی میں منعقد ہوئی جس کا افتتاح شہید ملت لیاقت علی خان نے کیا۔ عالم اسلام کے زعمائے شرکت کی۔ موتمر کے اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالوہاب غزام کی قیادت میں ایک دستوری کمیٹی تشکیل دی گئی۔ 1962ء میں موتمر کا پانچواں اجلاس بغداد میں منعقد ہوا۔ اس کا دستور اجلاس عام میں منظور ہوا۔

مول اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ سزا بھی پڑا آری ہوں۔ سلطان کی آواز آئی: اپنی گوشت کی دکان بند کر بھیجی کیچڑا کھیں اور جا کر کھج... سامنے کی بالکونی میں کھڑی خورشید اور دیکھو دیکھ کر کس رہی ہیں۔ "ان سب کو ڈرے کہ میں اگر بڑی گلوکارہ بن گئی تو ان کا کیا ہوگا۔" نگار نے ترکی جواب دیا تھا۔ "ان کا تو جو ہوگا سو ہوگا مگر کھلے والے ہمارا جناح رام کروں گے۔ اب بند کر ہارمونیم۔ بھانا تو آتا نہیں۔ مگر ہے۔" "بھو بھو بھو... ریاض مکمل تو کر لوں۔" "ریاض اور نیاز کو گولی مار... اگر گانے کے انداز میں حیرا رونا بند نہیں ہوا تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔" سزا سلطان اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"پھر سے..." نگار نے اتکا کہا ہی تھا کہ سزا سلطان نے چہل اتاری۔ وہ اسے پیچک کر باتیں کر رہی تھی: "میں بس بند کر رہی ہوں۔" اس نے اتکا کہا ہی تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بج رہی تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر کان سے لگا دیا اور بولی: "ہاں رضوان بول گیا ہوا۔ اچھا بھائی رہی ہے۔" لیکن یہ سزا

بہت مشکل حالت اور تحریک کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ منظور شدہ دستور کے مطابق باقاعدہ سیکرٹریٹ قائم کیا گیا۔ ہائی مرکزی دفتر کراچی میں رہا۔ بیروت میں صدیقی دفتر اور مشرق وسطیٰ میں علاقائی دفتر رہا۔ اقوام متحدہ سے رابطہ کئے گئے۔ ایک دفتر رابطہ نیویارک میں بھی قائم کر دیا گیا۔ موتمر کا چھٹا اجلاس موبالیہ کے دارالسلطنت موگودیشیو میں 24 ستمبر 1964ء سے 2 جنوری 1965ء تک جاری رہا۔ دہم فریقین میں یہ اجلاس عالمی اجلاس تھا۔ اس موتمر میں پہلی بار یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ افریقہ مسلمانوں کا جزو اعظم ہے۔ کیونکہ دہم فریقین میں یہ اجلاس عالمی اجلاس تھا۔ اس موتمر میں پہلی بار یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ افریقہ مسلمانوں کا جزو اعظم ہے۔ کیونکہ

افریقہ کا ساتواں اجلاس جنر 1967ء میں اس وقت کے حالات کے مطابق بیت المقدس کے قریب ترین شہر عمان میں منعقد ہوا۔ موتمر عربوں پر اسرائیلی جارحیت کے خلاف منعقد ہوئی تھی۔ موتمر عالم اسلامی نے مسلمانان عالم کے بنیادی سیاسی، قانونی، اقتصادی، قانونی غرض بر لوہیت کے مسائل کے ضمن میں خاصی پیش رفت کی ہے۔ موتمر کے موجودہ صدر ڈاکٹر عرف الدین ہیں۔ جو اسلامیات کے فاضل ہیں۔ موتمر کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر انعام اللہ خان ہیں۔ جن کی فعال قیادت عرف الدین کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب پرانے صحافی اور اعلیٰ پائے کے محقق ہیں۔ انہوں نے برامیں آل برامیں عالمی اسلام کی بنیاد پائی تھی اور اسلامی پاکستان کی حمایت میں وہاں تحریک چلائی تھی۔ اپنا روزنامہ "برامیں مسلم" بھی "اس مقصد کے لیے لگ کر رہا تھا۔ آل برامیں مسلم جمہور آف کاسر بھی ڈاکٹر صاحب نے قائم کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں کراچی واپس آئے۔ اپنی زندگی مسلمانان عالم کے اتحاد اور با خصوص موتمر کے لیے وقف کر دی تھی۔ نومبر 1950ء میں ان کی والدہ ہوں سے وفات ہوئی۔ ان کی ایک بیٹی سیدہ شہیر کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو پیش کیا تھا جس پر تقریباً پانچ لاکھ روپے دیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی توجہ خلوص محبت اور ثابت قدمی کی وجہ سے موتمر ایک موثر عالمی آواز بن گیا ہے۔

مرسلہ: عابد علی خان، سرگودھا

نے لال اور تیزی سے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ "آپ کون ہو؟" "ہم ڈاکو ہیں۔ خاندانی ڈاکو۔" اسلی والے ڈاکو۔ ہمارا نام ہے سلطان ڈاکو۔ ایک نے جواب دیا۔ "پستول اسلی سے؟" "عقار نے پوچھا۔" "ہاں ایک دم اسلی۔ جو کچھ سے بس نکال دو۔" فورل جوابی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا ٹھک گیا۔ اس کی چاپ سن کر ڈاکو نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ خبردار... جو ہے نکال دو۔ ڈاکوؤں کو دیکھتے ہی فورل کی روح نکال ہو چکی تھی وہ اپنی دھوتی پکڑ کر دوپٹے والی آواز میں بولا: "ہم کو شوروم آتا... ہم جی نکالے گا... ہم ادھر کا چاکر ہے۔" "اے دیکھنے میں آدی دیکھا ہے اور بول ہم چکور ہے۔ چکور ہے یا تمیں کونے والا ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ مال نکال۔" "اور بے پایا ہام کو بیوت شوروم آتا ہے۔ تمہارے اپنی دھوتی پکڑ کر بھی کی اور دروازے سے بول رہا تھا۔" ہام کوئی نکالے گا۔ دکھائے گا بھی نہیں۔

آواز سن کر سلطان نے نیم روک دیا اور پوچھا: "کون ہو؟" "انداز آنے والے دونوں شخص نے اپنے چہرے بھانے کے لیے اٹھا ہاتھ دکھا دیے۔ ان دونوں نے عقار کی آواز سن کر بھی مڑ کر دیکھا ایک نے دوسرے سے پوچھا: "اساتاد آواز کہاں سے آئی؟"

گئے۔ "ایک ڈاکو نے اس کی پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
 "ہم کو..... کیوں مارتا ہے..... ہام چاکور ہے۔"
 ڈاکو نے ایک اور دھپ لگا کر کہا۔ "چپ..... آواز
 نکالی تو گولی ماروں گا۔"

نورول نے روتے ہوئے کہا۔ "ہم چپ رہے
 گا۔ ہام کو مت مارو۔"
 "روتا ہے..... اب اور ماروں گا۔" اس نے ایک اور
 دھپ لگا دیا۔

نورول روتے ہوئے اپنی مادری زبان میں بین
 کرنے لگا۔ "ماں گوماں..... آئی کی بے کورلام..... ہے اللہ
 آمارے پاچا..... اول اول اوں۔"
 ڈاکو نے پستول کے بٹ سے ضرب لگائی۔ "گولی
 تجھے مارا ہی پڑے گا۔" پھر مڑ کر ساتھی سے بولا۔ "استاد مار
 دوں۔"

اس کے بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ڈاکو کم مغزوہ
 ڈاکو ہے۔ اس کے سوال پر اس کے ساتھی نے کہا۔
 "نہیں..... گولی مت چلا..... آواز باہر جائے گی۔ اس کو
 میں خود ماروں گا۔"

نورول نے یہ بات سنی تو اور زور زور سے رونے لگا۔
 "ہام کو مات مارو ہام پوزانی جانتا..... ہام رو کو کم رو کو کم کا کھانا
 بنانا جانتا..... ہام کو مات مارو۔"

نورول کے بین سے پریشان ہو کر سلطان ڈاکو نے
 کہا۔ "اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دو۔ اور اسے بچن میں لے
 جا کر باندھ دو۔"

دوسرا ڈاکو اس کی طرف بیساحی تھا کہ غفان نے
 کہا۔ "یہ صرف پوتا ہے اس کو مت مارو۔"
 "ابے لی ٹی ٹٹ..... خاموشی رہو ورنہ....." ابھی اس
 کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دوسرے کمرے سے عظیم جواد
 نکلیں۔ "ہم کہہ رہے ہیں۔ اس سوراہ کا بے کا ہے۔ تم
 لوگ چپ کیس رہتے ہو۔" اسی وقت ان کی نظر ڈاکو پر پڑی
 اور وہ گڑبڑائیں۔ "اے بھائی تم کون ہو؟"

"ہم ڈاکو ہیں..... جو کچھ ہے نکال دو۔" سلطان ڈاکو
 ڈاکو نے پستول دکھاتے ہوئے حکم دیا۔
 مسز جواد پستول کو نظر انداز کر کے بولتی چلی
 گئیں۔ "اُمی بات تو ہم کب سے کہہ رہے ہیں..... نکال
 دو..... اس کو نکال دو مگر میرے میاں ہیں نا۔ لا کسی کا سنتے
 نہیں۔"

"اوسے میں کہہ رہا ہوں جو زیور است ہے وہ نکال
 دو..... رو دیا چنسا جو کچھ ہے سب نکال دو۔" اس نے دوبارہ
 پستول ہلا کر کہا۔

"اور ایسا بولو نا..... ہم سمجھے تم نورول کا بات است کر
 رہے ہو..... کہنا بیساکا ہے نکال دیں؟" عظیم جواد نے ہاتھ ہلا
 کر کہا اور پھر جیلے کے اختتام پر انکشت شہادت کو تھوڑی پر دھک
 لیا۔

"ہم ڈاکو ہیں اور ڈاکا مارنے آئے ہیں۔" ڈاکو کے
 لہجے میں جھلک تھی۔
 "اچھا چھا ڈاکو..... ڈاکا مارنے آئے ہو..... تو
 مارو..... اتھار کیسا۔" عظیم جواد عام سے لہجے میں بولیں پھر
 ایسے چنگیں جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ "آں کا بولے؟ ڈاکو
 ہو..... اوسے باپ۔" کہتے ہی وہ تیرا کر گر گئیں۔ بے ہوش
 ہو گئے۔

غفان اور نورول ان کی طرف بڑھے تھے کہ کال بیل بج
 ائی۔ عظیم کی آواز سن کر سلطان نے اپنے ساتھی سے کہا۔
 "اے صابر بے دیکھ کون ہے..... جو بھی ہوا سے باہر سے ہی
 چلتا کر دے۔ میں ان لوگوں کو اتھار لے جا رہا ہوں۔"

"جی اچھا۔" کہہ کر وہ ڈاکو سے صابر کہہ کر مخاطب کیا
 گیا تھا وہ ڈراٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر
 اس نے اسائی آئی سے باہر دیکھا۔ اسے باہر دو لڑکیاں نظر
 آئیں۔ لڑکیوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شادابی چھا
 گئی۔ اس نے واپسی کے لیے دوڑ لگا دی۔ کمرے میں پہنچ کر
 کہا۔ "استاد دو لڑکیاں ہیں۔" بھی تیل پھر گئی۔ اس نے مڑ کر
 دروازے کی طرف دیکھا اور بات پوری کی۔ "لڑکیاں
 خوبصورت بھی ہیں۔"

"اے آئیں جا کر بیگا۔ ہم یہاں ڈاکا ڈالنے آئے
 ہیں۔ لڑکیاں دیکھتے نہیں۔" سلطان نے کہا۔
 دونوں ڈاکو باتوں میں مشغول تھے کہ نورول نے کسما
 کر کہا۔ "ام جائے گا۔"

"ابے چپ۔" سلطان نے اس کی چیخ پر دھپ بھا
 کر کہا۔
 "ہام کو مات مارو..... اول اول اوں۔" نورول نے
 باضابطہ روٹا شروع کر دیا۔
 اس کے رونے سے سلطان اور پریشان ہوا تھا۔ اس
 نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اے بھائی کبھی ہے۔"

"انہار کہا میں کوئی بارہوں؟"
 "بے شاید پہلی بار ہی کی گڑا ہے اور بار بار گولی
 مارنے کا کہہ جا رہا ہے۔ میں گولی چل نہ جائے۔" سلطان
 نے غصہ سے جھکا۔

"نیل پھر ہی تیرا دروازے کی طرف دیکھ کر بولا۔" استاد
 واپس ہوا تو اس نے
 سلطان نے بیٹھا کر جواب دیا۔ "ابے تو ڈاکا مارنے
 آتا ہے۔" سلطان نے کہا۔ "جان کو بھگا دے..... کوئی بھانا
 آج ہے۔" اور اسے بھی لیتا تھا۔ "اس کا اشارہ نورول
 کر کے بھاگے۔"

"نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"
 نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"

"نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"
 نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"

"نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"
 نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"

"نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"
 نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"

"نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"
 نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"

"نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"
 نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"

"نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"
 نورول نے نورول کو لڑکیوں میں کھڑا کر دیا اور اس کے
 ہاتھ میں بولا۔ "چل بے اتھ۔"

دوڑ کر اندر داخل ہو گئی۔ ڈاکو چپ تھے میں پر کیا۔ وہ چکر
 بولا۔ "تم لوگ باہر نکلو۔"
 "نہیں ہم تو اپنا سامان دکھا کر ہی جائیں گے۔ ہائی کو
 اندر سے جائیں۔"

صابر نے کہا۔ "نہیں نہیں آپ جائیں ورنہ استاد کا
 غصہ..... اف۔"
 رضوان نے اس کی طرف دیکھے ہوئے کہا۔ "آپ
 استاد کو بلا لیں..... ہم دو ہیں..... ایک ساتھ دونوں کو دکھا
 دیں گے۔"

صابر تھوڑے میں بولا۔ "میں نے کہا آپ نکلیں۔"
 رضوان نے اس کی بات کو ٹھکرا کر کہا۔ "غصہ نہ کریں
 پہلے مال تو دیکھیں..... دیکھتے ہی خوش ہو جائیں گے۔"
 صابر نے چیخ کر کہا۔ "میں کہتا ہوں باہر نکلیں۔"
 رضوان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "پانی تو پیئے
 دیں..... فریج کہاں ہے؟"

فرزانہ نے جلدی سے کہا۔ "گنا ہے ادھر بچن ہے
 وہیں لے گا..... فریج تو ہے نا۔"
 رضوان بچن کی طرف بڑھی تھی کہ صابر چٹایا۔ "اے
 رکو۔"

فرزانہ نے اسے اپنی طرف مڑ کر تاجا۔ "آپ مال
 دیکھیں..... پہلے زمانہ اسٹلم دکھاؤں یا مردانہ..... اوسے
 دیکھیں نا۔"

اتنی دیر میں رضوان بچن میں داخل ہو گئی۔ اندر جاتے
 ہی اس کی نظر نورول پر پڑی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے
 تھے اور منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر
 بولی۔ "اوسے نہیں کس نے باندھ دیا؟"

نورول نے۔ "آں آں..... کمرے سمجھانا چاہا کہ اس کا
 منہ بند ہے۔ رضوان نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹاتے ہوئے
 پوچھا۔ "اچھا اچھا منہ بند ہے۔ تمہاری یہ حالت کس نے
 کی؟"

نورول نے اپنے ہونٹ ملتے ہوئے جواب
 دیا۔ "ڈاکو۔"
 "نہیں بھائی ہم ڈاکو نہیں اسپرل کینی کی لہاندہ
 ہیں۔"

اتنے میں صابر اندر آگیا۔ رضوان نے اس سے
 پوچھا۔ "اے باندھ کر کہاں رکھا ہے؟"

”اس نے چوری کی..... تب تو اسے باندھ کر رکنا ہی
بہتر ہے۔“ رضوانہ نے اس کے منہ پر ٹیپ دو بارہ لگا دی
—

صابر نے فریئر سے بوقت ٹکالی اور اس کی طرف بڑھتا ہوا۔ ”کو پانی پیا اور ہمارا۔“

رضوانہ نے بوسلی کی اور منہ سے لگا کر کہنے لگی۔ پانی پی کر دو بچن سے باہر نکل گئی۔ ڈرامنگ روم میں پہنچ کر بوسلی نے ”اے رضوانہ جانتی ہے، اس گھر کا نوکر چور ہے اس نے چوری کی ہے۔۔۔۔۔ اس کو پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔“

فریئر نے پوچھا۔ ”چور ہے۔۔۔۔۔ کیسا ہے۔۔۔۔۔ دیکھنے سے ڈرو تمہیں لگ رہا ہے۔“

رضوانہ نے کہا: "اے نہیں..... بنگالی ہے۔"
 "اچھا۔۔۔ اب بنگالی چور بھی کراچی آنے لگے۔۔۔ بنگلہ دیش میں کون نہیں بچا کیا؟"
 وہ دونوں باتیں کرتے کرتے رقیہ کو سلطان آگیا۔ "تم لوگ کئی نہیں؟"
 "سر آپ بھی دیکھیں۔۔۔ بہت اچھا مال ہے۔۔۔ دل خوش ہو جائے گا۔۔۔ دکھاؤں؟"

سلطانہ نے جلدی سے ٹوٹ نکالا اور بولا۔ ”یہ لو پاؤں
 سو روپے۔۔۔۔۔ اب بھاگو یہاں سے۔“
 رضوانہ درویشا لے کر دو بارہ اس کی جیب میں ڈال دی
 رہتے ہوئے بولی۔ ”نہیں جناب ہم بھکاری نہیں۔۔۔۔۔ اب تو
 آپ کو سامان دیکھنا ہی پڑے گا۔“ پھر اس نے تھیلوں سے
 سامان نکالنا شروع کر دیا۔

”مجھے پتہ نہیں لیٹا۔ اب تم لوگ جاؤ۔“

”تمہیں جناب آپ کو سامان دیکھنا ہی پڑے گا۔ آپ نے روپے دے کر گھاری پر عزتی کی ہے۔“

”میں نے کہا تھا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ حکم باہر مٹی۔“

”لیکن باقی تو.....“ ابھی اس نے اسی کہا تھا کہ
 ”میں سے بیکم جواد کی آواز آئی۔“ ہم کے دے
 ”اس کے بعد کی آواز وہی تھی۔“ سنا کی نہیں دی تھی
 ”میں نے اسے منہ دیا وہ پھر بھی فرزند زور سے چلتی۔“ باقی تو
 ”میں نے۔“

ماهنامه سرگزشت

نہی۔ عقاب بھی تھا اور مول بھی مگر اس وقت اسکا غاموشی
 چھائی ہوئی تھی جیسے سب پتھر کے بن گئے ہوں اسکا لیے کہ
 سلطان کو خطرہ تھا کہ اگر آواز باہر مٹی تو لڑکیاں سن لیں گی کہ
 لیے اس نے سب کو دھکا رکھا تھا کہ کوئی آواز نہ نکالے مگر وہ
 مسز جواد تھیں جن کو سمجھا آیا تھا جیسے رشتے میں اونٹ کو کھانا
 دینا۔ وہ ان کی باتیں سن کر بھی بار بار ان مٹی کر دے رہی
 تھیں۔ تنگ آ کر سلطان نے پستول ہلا کر مسز جواد سے کہا۔
 ”اے چالی دو..... جتنا ڈالر پاؤنڈ..... دو دیا..... زنجیرات
 ہیں سب نکالو۔“ اور اصل اس کے صبر کا پیمانہ یہ لہجہ ہو چکا تھا مگر
 محرم والوں پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سب ڈاکوؤں کو
 ایسے گھور رہے تھے جیسے وہ ان کے ساتھ لطیفے بازی کے لیے
 آئے ہوں۔

اسے گرم ہوتے دیکھ کر مسز جواد بولیں۔ ”سب سب نے لوگر چیکو اڈ کوٹھی..... ہم کو اکتھلا ج (اختلاج) کا بیماری ہے نا..... ہارٹ ایک ایک ہو جائے گا۔“

سلطان کا پارا پہلے ہی ہائی تھا۔ عثمان کے مذاق نے
 سے سوار کیا۔ وہ سچ بولا۔ "خاموش۔۔۔ نکالو چالی۔"
 "چالی تو اُن کے کر گئے ہیں۔"
 سلطان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے
 "۔۔۔ وہ کون؟"

سبز جواد یا کوئی اور کچھ کہتا کہ صابر نے احمد آکر کہا۔ استاد دونوں لڑکیاں جانے پر تیار نہیں..... وہ کہتی ہیں ہمارا مان و بھگوان ہم نہیں جانیں گے..... میں بخوارہ..... کیسے ہوں۔“ کہہ کر وہ شرانے کی ایکٹنگ کرتے لگے۔ سلطان فیصلی آواز میں کہا۔ ”خبریں دیکھنا ہوں۔“

وہ تھری سے ڈرا تنگ روم میں آیا تھا کہ کان بیل بج
- سلطان کے چہرے پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔ وہ
یوں کی طرف جاتے جاتے دروازے کی جانب مڑ
جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا ایک سختی سے آدی نے
آئے کی کوشش کی "شکلا کیدھر ہے نورول کا بچہ... دام
کو سوڑے گا مانی (ہم اس کو چھوڑیں گے نہیں)۔" نے
نے والے کی زبان بتا رہی تھی کہ وہ بھی یہی ہے۔ "کہاں

114

[illegible][illegible]

”مگر یہ توڑا کو ہے اور اوز کو کو مارنا ثواب ہے“

اس نے ہلکی ہلکی دوچپت لگائی۔
 "مے برا جاتا ہے۔" سلطان بولا۔

”میں جانتی ہوں کہسے مارا جاتا ہے۔ ایسے مارتے ہیں
 براہِ رزاقہ نے سلطان کے سر پر زور سے چپت لگائی۔

”میں نہیں، اسے اس کو مارو۔“ سلطان جھلکا کر بولا۔
 دونوں فریادیں نے ہاشم کو چیل سے مارتا شروع کر
 دیا۔ پارچہ چیل کھاتے ہی ہاشم کی گردن ڈھلک گئی۔
 ”میں اسے باہر پھینک کر مارتا ہوں۔“ کہہ کر سلطان
 نے باکی کو گھسیٹنا شروع کر دیا۔

”اسے سب سے پہلے۔“ اہم کو پہنچنے کے لیے خزانہ بولی۔
”پھر کیسے؟“
”خزانہ بولی۔“ ہم کراچی والے ہیں..... ساتھ کرا

Version of "Waterm

سلطان خضے میں ہنگامی کو کھڑا ہوا باہر نکل گیا۔
 ”نکار کو فون کر اس کو بھی تو تاک ہم نے ایک ڈاکو کی
 چٹائی کی ہے۔ اس پر دھاک بیٹھ جائے گی۔ جلدی فون
 کر۔“ غر زانہ بولی۔

”میرے موبائل میں ایپس نہیں ہے۔“ رضوانہ نے منہ بنا کر کہا۔

”ایسا کرتے ہیں ان بھائی صاحب سے مواہل
 مانع لیتے ہیں“ اس نے سلطان کی طرف اشارہ کیا۔
 ”ہاں یہ صحیح ہے..... انجنا پلٹس بے گم۔“ رضوانہ نے

جواب دیا۔
 ”اب تم لوگ بھی نکلو۔“

”اُسی بھی بد اخلاقی اچھی نہیں۔“ دونوں ایک ساتھ
بولیں۔

”اخلاق کی..... ستونوں کی بہت ہو گیا..... اب جاؤ۔“
سلطان نے کہا۔

”ہم چلے جاؤں گے..... ایک منٹ کے لیے اپنا
موبائل دیکھئے گا۔“

دیکھی ہے۔ ”سلطان زور سے بولا۔

ہم پوچھیں گے کہ (چرا اپنی آواز میں کمرے کی طرف منہ کر کے) کوئی ہے۔ میں اعظم

”لو کیاں آسٹم دکھائیں گی..... واہ استاد اس لیے

ایسے..... میں سی دی چھوٹا۔ صابر نے سرے میں لیا
 ہی کہا۔ ”اس کمرے تک آواز جا رہی ہے۔ میں نے بھی سن لیا“

سلطان نے صابر کو دھکا دے کر کہا۔ ”مردا کر رہے

ہیں۔ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔“

اٹھا کر اندر کی طرف دوڑتی ہے۔ اس کے پیچھے سلطان۔ اس

”ارے مجھے کیوں چھوڑے جا رہی ہے۔“ رضوانہ

یہ ہنسی مسکراتی فکرتیں تحریر ابھی جاری ہے۔

ected with free v

115



جونتیسواں حصہ

روسیہ

عاشق شاہین

وہ ایک مہم جوئی کا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خواہوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کر لیا گیا اور اب اسے آنکھیں اپنہوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

گزشتہ اقسام کا خلاصہ

رادھا کے شوہر چاہنے پر علی کو کھڑا کیا تھا اس نے رادھا کو تھپڑ مارا تھا۔ پھر علی نے کہنے پر جوتی نے ایک کی اصلیت بتا دی تھی جس کی رادھا یقین نہیں کر رہی تھی۔ دھنیا وہاں نہیں آئی اور رادھا کے لیے کسی ایک آئے کی مدد سے علی کو بے ہوش کر دیا تھا۔ علی نے نہایت چالاکی سے خود کو صرف آزاد کرایا بلکہ جوتی کی اس کے اہول ماری کی تھی۔ رادھا فرار ہو کر پناہ پات والے کمرے میں چھپ گئی تھی مگر وہ علی کو پکڑنے کے لیے اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں ایک کے گناہوں نے علی کو دیا تھا۔ علی نے بڑی مشکل سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہاں نکلنے والے ایک کے ہمدون کے بعد علی کو وہ کسی ڈراما میں گیا تھا جس نے پہلی بار علی کو ایک کیا تھا اس کی مدد سے اپنے رشتہ داروں کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس کی جوتی جس نے بتا کر کچھ لڑکے اس کے پیچھے بڑے ہوئے ہیں اور موری کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ علی نے انہیں دیکھ کر ہنس کر انہیں سے کہہ کر انہیں ایک کے گناہوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ علی نے پناہ گاہ میں روڈ پر پہنچا تو اس کے سامنے ایک کار آئی تھی۔ وہ کار میں جوتی عورت کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

اب آگے پڑھیں

کار میں رادھا برا بھلاں تھی۔ اس کے چہرے پر استہزاء مسکراہٹ ابھری ہوئی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ بچہ کہاں تک بھاگے گا آخر کار پکڑے ہی گئے گا۔ وہاں بھاگے جا رہے ہوں مگر۔۔۔ رادھا کی نظریہ آواز میری سماعت میں پڑی۔ اس کے ساتھ سن آئی تھی جتے جو رادھا کے کہنے پر جوتی رادھا سے کار سے نکل کر میری طرف بڑھے تھے۔ دو کی رگت تو سنا لی تھی جیکہ حیران تو بالکل ہی کالا بھنگ تھا۔ اس نے دائیں گلائی میں کڑا پہنا ہوا تھا۔ وہ حیرت میں بھی ہاتی وہ سے بھاری تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر کھاتی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بائیں طرف دوڑ پڑا۔ وہ جوتی بھی میرے پیچھے دوڑے۔

چند لمحوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی اس لیے وہ جوتی مجھے آسانی سے نہیں پکڑ سکتے تھے۔ میں لوگوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا بگٹ دوڑتا جا رہا تھا۔ ایک لمحہ تو ایسا بھی آیا کہ میں ایک آدمی سے ٹکرا گیا تھا اور ہم دونوں ہی زمین پر گئے تھے۔ وہ آدمی عمر رسیدہ تھا۔ اس نے مجھے گالیاں دی تھیں لیکن میرے پاس اس کی گالیاں کھانے کے لیے وقت نہیں تھا پھر لی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا چلا گیا تھا۔

ابا میں تھا کہ میں بڑی دکھا رہا تھا میں اس سے ڈر گیا تھا۔ دراصل میں جوتی دست تھا اور ان کے پاس ہتھیار تھے۔ انکی صورت میں۔ میں بے موت مارا جاسکتا تھا اس لیے میں نے اپنی جان بچانے کی بجائے ہاتھ سمجھا تھا۔ ان سب سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کراچی کی گھرائی کرنے والوں نے ہی رادھا کو مار کر کے میرے بارے میں بتا دیا ہوگا اور وہ رادھا

میں بہت بری طرح چھس گیا تھا۔ مجھے دور سے ہی میں اپنی آنکھوں کی دیکھائی دی۔ جب اچانک وہ کار میرے رادھا کی طرف آئی تو میں نے اس کی رگت میں سے ایک کوٹھے سے اٹھ کر پھرتی تھی۔ اس کار کی رگت میں سے جوتی سے ہی میں نے دیکھ لی تھی۔ میں جلدی سے قریب میں بڑے رادھا کی طرف بھاگتا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہاں ایک کے گناہوں نے علی کو دیا تھا۔ علی نے بڑی مشکل سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہاں نکلنے والے ایک کے ہمدون کے بعد علی کو وہ کسی ڈراما میں گیا تھا جس نے پہلی بار علی کو ایک کیا تھا اس کی مدد سے اپنے رشتہ داروں کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس کی جوتی جس نے بتا کر کچھ لڑکے اس کے پیچھے بڑے ہوئے ہیں اور موری کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ علی نے انہیں دیکھ کر ہنس کر انہیں سے کہہ کر انہیں ایک کے گناہوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ علی نے پناہ گاہ میں روڈ پر پہنچا تو اس کے سامنے ایک کار آئی تھی۔ وہ کار میں جوتی عورت کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

کار میں رادھا برا بھلاں تھی۔ اس کے چہرے پر استہزاء مسکراہٹ ابھری ہوئی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ بچہ کہاں تک بھاگے گا آخر کار پکڑے ہی گئے گا۔ وہاں بھاگے جا رہے ہوں مگر۔۔۔ رادھا کی نظریہ آواز میری سماعت میں پڑی۔ اس کے ساتھ سن آئی تھی جتے جو رادھا کے کہنے پر جوتی رادھا سے کار سے نکل کر میری طرف بڑھے تھے۔ دو کی رگت تو سنا لی تھی جیکہ حیران تو بالکل ہی کالا بھنگ تھا۔ اس نے دائیں گلائی میں کڑا پہنا ہوا تھا۔ وہ حیرت میں بھی ہاتی وہ سے بھاری تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر کھاتی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بائیں طرف دوڑ پڑا۔ وہ جوتی بھی میرے پیچھے دوڑے۔

چند لمحوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی اس لیے وہ جوتی مجھے آسانی سے نہیں پکڑ سکتے تھے۔ میں لوگوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا بگٹ دوڑتا جا رہا تھا۔ ایک لمحہ تو ایسا بھی آیا کہ میں ایک آدمی سے ٹکرا گیا تھا اور ہم دونوں ہی زمین پر گئے تھے۔ وہ آدمی عمر رسیدہ تھا۔ اس نے مجھے گالیاں دی تھیں لیکن میرے پاس اس کی گالیاں کھانے کے لیے وقت نہیں تھا پھر لی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا چلا گیا تھا۔

ابا میں تھا کہ میں بڑی دکھا رہا تھا میں اس سے ڈر گیا تھا۔ دراصل میں جوتی دست تھا اور ان کے پاس ہتھیار تھے۔ انکی صورت میں۔ میں بے موت مارا جاسکتا تھا اس لیے میں نے اپنی جان بچانے کی بجائے ہاتھ سمجھا تھا۔ ان سب سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کراچی کی گھرائی کرنے والوں نے ہی رادھا کو مار کر کے میرے بارے میں بتا دیا ہوگا اور وہ رادھا

کرنا ہے۔ میں نے قریب پڑے ایک ڈرم کی طرف چلا گیا۔ لگا دی تھی۔ مدد شکر کمرے کے قریب میں کوئی ڈرم لکڑی موجود نہیں تھا۔ رادھا کو لگا دکھار ہوا تھا۔ گولی میرے عقب میں موجود دیوار پر گئی تھی اور پلستر کے کچھ ڈرے اکڑ کر قریب وجہ میں پھیل گئے تھے۔ گولی کی آواز سے فضا سرکش ہوئی تھی اور وہاں موجود لوگوں میں ہلچل مچ گئی تھی۔ آن واحد میں وہ ملاقات ہوئی جسٹان ہو گیا جیسے وہاں کوئی خونی عفریت کھینچ رہی ہو۔ میں اس کے کالا بھنگ دو بارہ مجھ پر فائر جھونکا۔ میں نے قریب میں بڑا ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے اسے مار دیا۔ پتھر اس کے سر پر لگا اور اس کے منہ سے ایسی آواز خارج ہوئی جیسے کسی بکرے کو ذبح کیا گیا ہو۔ یقیناً پتھر کھانے کے باعث اس کا دماغ بھیجھا گیا ہوگا۔ اس کے ہاتھ سے رادھا کو کھینچ کر زمین پر گر چکا تھا۔ میں نے ڈرم کی اوٹ سے دیکھا تو اس کا دوسرا ساگی دوڑتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا چہرہ ہم موجود تھے۔ مجھ سے مکالمہ کرنے والا بھی اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

"اس کی ہڈی پہلی ایک کر دو۔" دھنیا دور کھڑی رادھا نے چیخے ہوئے کہا۔ "اسے بچ کر نہیں جانا چاہیے ورنہ تم تینوں میرے ہاتھوں میں جاؤ گے۔"

کالے بھنگ کے دونوں ساگی اس کی مدد کرنے کی بجائے میری طرف بڑھے۔ میں ڈرم کی آڑ سے نکل کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جگ میدان جنگ کا منظر پیش کرنے لگی۔ وہ دونوں مجھ پر پلٹ پڑے تھے۔ میں نے ان کی حرمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ دونوں میرے ہاتھوں بری طرح ڈھکی ہو گئے تھے۔ وہاں ایک قلمی ماحول سامنے آیا تھا جیسا کہ انڈین فلموں میں دکھایا جاتا تھا لیکن اس وقت وہ حقیقی مناظر تھے۔ لوگ دور دور و دور بخود کھڑے تھا شائی کا کردار ادا کر رہے تھے۔ رادھا کی حالت بھی دیدنی تھی۔ شاید اسے اپنے گناہوں پر یقین تھا کہ وہ مجھے قابو کرنے یا مارنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن میں نے اس کی امیدوں پر ڈھیروں پانی بہا دیا تھا۔

کالے بھنگ نے اپنے ساتھیوں کی میرے ہاتھوں درگت بننے دیکھی تو وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی پیشانی خون آلود ہو چکی تھی۔ کھل اس کے کردہ اٹھا۔ میں نے ایک کو اٹھا کر اس پر پھینک دیا۔ وہ دونوں ہی زمین پر گئے ہو گئے۔ ان کا تیسرا ساگی پہلے ہی زمین پر گرا ہوا تھا اور وہ

گماشتوں کی طرف مڑا، وہ بدستور زمین بوس تھے اور کڑا رہے تھے۔

میرا اب وہاں رکنا فضول تھا اسی لیے سبک رفتاری سے ایک طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ مدھشکرتا کہ کسی تماشاگاہ نے ہمارے قریب آنے یا پوچھنے کی رحمت نہیں کی تھی ورنہ مشکل کمڑی ہو جاتی۔ لڑائی بھڑائی کی وجہ سے میرے زخمی بازو سے میسٹس اٹھ رہی تھیں جنہیں میں ضبط کیے ہوئے تھا۔ کافی دور آنے کے بعد میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور دیاں سنگھ کو کال کی۔ تیسری ہی منٹ پر اس نے فون اٹھالیا۔ ”سرکار! تسی نے دوست سے ملنا تھا، مل گیا دوست؟“ دیاں سنگھ کی آواز سنائی دی۔

”ہاں۔“ میں نے جوابا کہا۔ ”تم اس سے کہاں ہو؟“

”ای کالونی میں جتنے تسی کو اتارا تھا۔“ دیال سنگھ نے بتایا۔ ”تسی کتھے ہو کر؟“

”دیال سنگھ! میں بڑے مندر کے قریب موجود ہوں۔“ میری نظر ایک مندر پر پڑی تو میں نے کہا۔ اس مندر کے صدر دروازے پر ہندی زبان کے علاوہ انگریزی میں بھی بڑا مندر لکھا ہوا تھا اسی لیے میں نے نشانی کے طور پر دیال سنگھ کو یہی نام بتا دیا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے سرکار۔“ دیال سنگھ نے سمجھتے ہوئے کہا۔ ”تسی وچیں رکو، میں آ رہا ہوں۔ میں نے بڑا مندر دیکھا ہوا ہے۔“

میں بڑے مندر کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ میں نے مندر میں جھانکا۔ اندر مندر کی کھٹیوں اور بچن گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مرد و زن اور بچے بچیاں بھی موجود تھے۔ باہر سے آنے والے لوگ بھی مندر کے اندر جا رہے تھے۔ میں نے کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے جو وہاں سے گزرتے ہوئے مندر کی سیڑھی پر عقیدت سے ماتھا کیٹتے اور آگے بڑھ جاتے۔ میرے اپنے شہر میں بھی مندر تھے لیکن میں وہاں بھی نہیں گیا تھا۔

وہنا میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا تو میں بے اختیار چوک کر مڑا۔ وہ ایک عمر رسیدہ سادھو تھا۔ اس نے

جس طرح نرم لہجے میں استفسار کیا لیکن لہجے میں طنز کی آمیزش شامل تھی۔ چہرے پر خنکی کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔
”جج..... جی.....“ میں گڑبڑایا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔
”کیا کسی تارکے کا“

دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ اس نے بہ غور مجھے

چاہتا ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں
مہاراج۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔ ”اعذر منور قی پو جا ہور سی ہے۔ اگر پو جا کر نے آئے ہوتو چلو میرے ساتھ۔“

”میں پوچھا کرنے نہیں آیا۔“

”ناری کا؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا تو میں نے دل ہی دل میں اسے کوسا۔ پتا نہیں وہ مجھے کسی ناری کے ساتھ کیوں ایچ کرنا چاہ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، دیال سنگھ پہنچ گیا اور میری جان خلاصی ہوئی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر سادھو سے خستے کہا اور بجلی کی سی سرعت سے ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی میں سوار ہوتے وقت میں نے سادھو کی طرف دیکھا تھا وہ پُر غور نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں ٹیکسی میں سوار ہوا تو دیال سنگھ نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ یہی میں نے سکون کی ایک لمبی سانس لی اور خود کو سکون کیا۔

”مہاراج کیا کہہ رہا تھا؟“ دیال شلے مستفسر ہوا۔
اس کا اشارہ سیاہو کی طرف تھا۔

میں نے کہا: ”اس کا خیال تھا کہ میں مندر میں کسی ثاری کا انتظار کر رہا ہوں۔“

دیال سنگھ میری طرف دیکھتے ہوئے زہر پب مسکرا

کی کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟“
 ”راوہا سے سامنا ہو گیا تھا۔“ میں نے جواب کہا اور
 مختصر اتار دیا۔ دیوال سنگھ کے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے
 لمحے جلوہ بازی لگے۔

”گرو دی سوں۔“ وہ فرط جوش میں بولا۔ ”یقین نہیں آ رہا تھا، تہی نے تین تین آدمیوں کی خالی ہاتھ مرمت کی۔“

میں رمان سے منکر اویا۔ اس نے مزید سلسلہ کلام
جوزا۔

”ہاں۔ یوں۔“

”سراکار کی بڑے کی دار ہو۔ کسی فلموں میں کام کیوں نہیں کرتے؟ فلموں میں تو آؤی قانگ بڑی مشہور ہو پاتے گی۔“

”مجھے فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”تو سناٹے دیکھتے ہوئے کیا۔“

”سرکار افسروں میں کام کرنے پر بہت پسند
 ہے۔“ دیوال سنگھ نے بتایا۔
 ”جانتا ہوں۔“

”ایک آدمی میرا جاننے والا ہے۔“ دیال سنگھ نے
 ”تو کیوں تو میں اس سے بات کروں؟“

”نہیں وہ بال سگھ۔“ میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

جواب اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر کے بعد ہم اس سنگھ کے کمرے پہنچ گئے۔ راستے میں، میں نے ایک ملتان کے ہوٹل سے کھانے پینے کی چیزیں خرید لی تھیں۔ وہاں دیا ہوا سنگھ اور اس کی منہ بولی بہن پر بوجھ نہیں بیٹھا جانتا تھا۔ ویسے بھی کیا یہ کم تھا کہ دیا ہوا سنگھ میری مدد کر رہا تھا۔ اس سنگھ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ جاتے وقت کہہ گیا تھا کہ رات کو آؤں گا۔

میں نے سارا سامان میز پر رکھا اور واٹس روم میں بیٹھ گئی۔ کچھ گھنٹے پہلے رادھا کے دوستوں اور میرے درمیان ہونے والی جان لیوا گفتگو میرا بالاس گرو آؤد ہونے کے ساتھ پھٹ بھی گیا تھا۔

فیملی خطرے میں تھی۔ میں جانتا تھا اردو کا کسی بھی طرح ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ میری صفِ دشمنان میں رتن کمار، دیک، جوتی کے بعد اردو کا بھی اضافہ ہو گا تھا۔

دلفن کا مجھے ہاروے کا خیال آیا تو میں نے اس سے رابطے کی خاطر چٹون کی جیب میں ہاتھ مارا تو مجھے سودا کا کرنٹ لگا۔ میں انچل کر کھڑا ہوا اور اپنی چٹون کی تلاش لینے لگا۔ چٹون کی کسی بھی جیب میں اینڈر سن کا دوبا ہوا کاغذ جس پر ہاروے کا نمبر درج تھا، موجود نہیں تھا۔ میں نے چٹون کی ساری جیبیں ٹٹولی لی لیکن کاغذ وہاں نہ ہو سکا۔ سارے کیے کر کے پڑے چند ہی لمحوں میں ڈیویر وں پانی پھر گیا تھا۔ شاید رادھا کے گناہوں کے ساتھ لڑائی کے دوران وہ کاغذ جیب سے نکل کر گر گیا تھا۔

میں مگر کیا ہو، مجھ پر اضطراب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ بڑی مشکل سے میں اینڈرزن تک پہنچا تھا لیکن ساری محنت اکارت ہوئی نظر آئی۔ تاہم دل میں ایک سوہوم سی اُمید تھی کہ شاید کانڈ دیال گھم کی طبیسی میں گمراہ اسی خیال کے پیش نظر میں نے جلدی سے سیل فون نکالا اور دل میں گھم کو فون

”عظیم کردوسرکار!“ رابطہ ہوا تو دیاں سنگھ نے رساں

”کہاں ہو دیال سنگھ؟“

مستفسر ہوا۔ ”کہا کوئی مسئلہ ہو گا سے سرکار؟“

”جیس۔“ میں نے نے تنے کچھ میں کہا۔ ”تم =
دیکھ کر بتاؤ کہ تمہاری ٹیکسی میں کوئی کاغذ تو نہیں بڑا ہوا۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”اس پر ایک نمبر لکھا ہوا ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں سرکار۔“ دیوال سنگھ نے کہا پھر چند

میں نے اس کے لیے خاموشی چھا گئی۔ میں ارادی طور پر کمرے میں نہیں رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد دیوال سنگھ کی آواز سنائی

ی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں سرکار، پبلیسی میں تو ایسا کوئی کانفڈینس ہے جس پر نمبر لکھا ہو۔"

”تم نے ابھی طرح چپک لایا ہے؟“ میں نے

گیا اور میں اس کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

مزید دو دن میں نے اسی گھر میں گزار دیئے تھے۔ دیال سنگھ روز میرے پاس آتا تھا۔ میں نے اسے رتن کمار کی والہی کے بارے میں معلوم کرنے کا کہہ دیا تھا۔ میرے بازو کا زخم بھی منسل ہو رہا تھا اور تکلیف میں بھی کافی حد تک آقا تہ ہو گیا تھا۔

یہ تیسرے دن کی بات تھی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ اس دن دیال سنگھ مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ عموماً وہ روزانہ بعد از صبح آ جاتا تھا۔ دوڑھائی گھنٹے میرے ساتھ گزارنے کے بعد وہ چلا جاتا تھا۔ وہ میرے ساتھ اس مکان میں نہیں رہتا تھا۔ میں پوچھتا تو کہتا تھا کہ مجھے سواریاں اٹھانی ہوتی ہیں اس لیے دیر ہو جاتی ہے۔ دس بج گئے اور وہ نہ آیا تو میں نے اس کا انتظار کرنا ختم کر دیا اور اسے فون کر دیا۔

مگر اس کا فون بند تھا۔ وقفے وقفے سے میں اسے کال کرتا رہا لیکن فون بند ملتا تھا۔ اس صورت حال کے باعث مجھ پر اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ مجھے اس کا فون بند ہونے کی خطرے کی علامت لگا۔

”دیال سنگھ کا فون کیوں بند ہے؟“ میں عالم پریشانی میں پڑ گیا۔ بعد ازاں میں نے خود کو تسلی دی کہ ممکن ہے اس کے سیل فون کی بیٹری ڈیل ہو گئی ہو۔ میں بلا ضرورت دیال سنگھ کو فون نہیں کرتا تھا۔ صبح سے اس سے رابطہ نہیں ہوا تھا تو میں نے اسے کال کی تھی۔

دس منٹ کے وقفے کے بعد میں نے دوبارہ فون کیا تو اس کا نمبر بند ہی ملا۔ میں نے لمبی سانس لے کر خود کو پرسکون کیا۔ کسی بھی مسئلے کا حل پریشان ہونا نہیں ہوتا، اس سے نہ صرف پریشانی بڑھتی ہے بلکہ انہی بھی نتائج ہوتی ہیں۔ لہذا میں نے دماغ میں آئی سوچوں کو جھٹکا اور صحن میں لٹکے لگا۔

اسی طرح ایک دن مزید گزر گیا۔ دیال سنگھ نہ خود آیا نہ ہی اس نے کال کر کے اپنی خیر خیریت کی خبر دی تھی۔ پھر تو مجھے حیرت پریشانی ہونے لگی تھی۔ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دیال سنگھ سے کیسے رابطہ کروں۔ میں نے اس کی بے بے کا گھر بھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس سے ہی اس کے بارے میں پوچھ لیتا، نہ شہادہ دیال سنگھ کے پاس سے بات چیت ہوئی۔ اس وقت دن کے چار بج رہے تھے۔

”ہاں سرکار۔ میں نے جیسی کا ایک ایک کونہ دیکھا ہے۔“ دیال سنگھ نے جواب دیا۔

میں نے غصہ کی سانس لی۔ ”ٹھیک ہے۔“ اتنا کہنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ رگ گریس سوچنے لگا کہ آخر کاغذ کہاں گرا ہوگا۔ یہ الگ سے مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی تھی کہ میں اینڈ رن کو اپنا سیل فون ہی دے دیتا کہ وہ اس میں اینڈ رن کا نمبر فیز کر دے۔

مجھے دوبارہ اینڈ رن کے پاس جانا پڑے گا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس آپادھانی میں مجھ سے وہ کاغذ چھو گیا تھا جس کا مجھے بے حد ملال تھا۔ دوسری طرف دیکھ کی پیوہ بہن رادھا بھی میرے مقابلے میں مکمل کر سامنے آ چکی تھی، لیکن رتن کمار کا کوئی اتنا پتا نہیں تھا۔ دیال سنگھ کے ذمے دوبارہ کام لگانا پڑے گا کہ وہ رتن کمار کے ہونے کے پتے سے رابطہ رکھے اور اس سے رتن کمار کے بارے میں سن سکن لیتا رہے۔ میں نے تعلیم سے سوچا۔

اس آپادھانی میں، میری بھوک بھی مری چکی تھی۔ کھانے پینے کا جو سامان لایا تھا وہ دیسے کا ویسا ہی میز پر پڑا تھا۔ میرے پاس پیسے بھی ختم ہوتے جا رہے تھے۔ بیویوں کا بندوبست کرنا بھی ضروری تھا۔ میں دیال سنگھ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا اسی لیے سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ کچھ دیر تک غمیلے رہنے کے باوجود جب کوئی بات کچھ نہ آئی تو میں پورے دل کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔

دیال سنگھ رات کے سوا آٹھ بجے آیا تھا۔ چونکہ میں وہاں کو کھانے پینے کی چیزیں لایا تھا اس لیے دیال سنگھ کچھ نہ لایا تھا۔ اس نے میز پر رکھا سامان دیکھا تو حیرت سے چوٹا۔

”سرکار آجس نے کھانا نہیں کھایا؟“

”بھوک نہیں ہے دیال سنگھ۔“

”ہیں.....“ اس نے ہیں کو لمبا کھینچا۔ پھر مد فیصد اندازہ لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”کسی یقیناً اسی کاغذ کی وجہ سے پریشان ہو جو تیری سے چھو گیا ہے۔“

میں نے لمبی سانس کھینچ کر اپنے اندر اثر لی جس سے میری اندرونی اضطرابیت واضح ہوئی تھی۔ لمائی توقف کے بعد دیال سنگھ نے کہا۔ ”کسی اتجار (انتظار) کرو سرکار، میں آگے بڑھتا ہوں۔“

میں نے اسے روکنا چاہا۔ میں ارادہ کر رہا تھا کہ وہ چلا جائے۔

”یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔ یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔“ میں نے دہرایا۔

”یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔ یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔“ میں نے دہرایا۔

”یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔ یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔“ میں نے دہرایا۔

”یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔ یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔“ میں نے دہرایا۔

”یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔ یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔“ میں نے دہرایا۔

”یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔ یہ دیال سنگھ نہیں ہو۔“ میں نے دہرایا۔

وہ تصویر دیال سنگھ کی تھی جسے انتہائی بے دردی کے ساتھ کل کر دیا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر چاندی کے نشان تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر بے غناہ تشدد کیا گیا ہو اور تشدد کے دوران ہی اس کی موت واقع ہو گئی ہو۔

”یہ..... یہ تو دیال سنگھ.....“ میں نے سخت جھرسے لہجے میں کہا اور اس سے آگے نہ بولا گیا۔

”کسی نے میرے بھائی کی بتا کر دی ہے۔“ دیال سنگھ کی بے بے رحمی ہوئی۔ آواز میں بولی تو میں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

”تم جانتی ہو کہ میں نے دیال سنگھ کی بتا کی ہے؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ ساڑی کے پلو سے آلو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”پولیس جتارے کو تلاش کر رہی ہے۔“

”مجھے دیال سنگھ کی بتا پر بہت افسوس ہے۔“ میں نے کفر افسوس ملنے ہوئے کہا۔ ”وہ میرے بھائی جیسا تھا۔“

مجھے حیرت دیال سنگھ کے قتل پر بہت افسوس ہوا تھا۔ میں دماغی طور پر الجھ گیا تھا۔ کئی سوالات میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ مثلاً دیال سنگھ کو کس نے قتل کیا تھا؟ جس نے بھی اسے قتل کیا تھا کیوں کیا تھا؟ وہ اس سے کیا چاہتے تھے؟ ان سوالات کے ساتھ ساتھ میرا دھیان دیکھ اور رادھا کی طرف بھی گیا تھا۔ کہیں وہ میرے ساتھ ان لوگوں کی نظروں میں تو نہیں آ گیا تھا؟ ہو سکتا ہے انہوں نے دیال سنگھ سے میرے بارے میں انکوائری کے لیے سروکار کو کشش کی ہو اور دیال سنگھ نے حق دوتی ادا کرتے ہوئے بتانے سے انکار کر دیا ہو۔ نتیجتاً اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہو۔

”تم تو اس کے دوست ہو۔“ بے بے کہنے لگی۔

”یقیناً تم جانتے ہو گے کہ دیال سنگھ کی جیسا کہ نے کی ہے؟ کون ہے وہ جتارا؟“

میں نے بھی سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، میرے خیال میں دیال سنگھ کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ اس کی بھلاکس سے دشمنی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے دوران زندگی اس کی جی کی ہو؟“ میں نے آخر میں بات کو یاروغ دینے کی کوشش کی مگر تاکہ بے بے کا ذہن پلٹ جائے۔

”پولیس کا بھی یہی خیال ہے۔“ بے بے نے انہماک سے کہا۔

میں سر ہلایا۔ "دیال سنگھ کی ڈمکتی کے دوران بتایا ہوئی ہے، لیکن میرا دل نہیں مان رہا۔ میرا دل کہتا ہے کہ دیال سنگھ کے ساتھ کوئی اور مسئلہ ہوا ہے۔ بہر حال پولیس دیال سنگھ کے بتا رہے کو تلاش کر رہی ہے۔ شاید وہ تم سے بھی پوچھ چکے کہ کیونکہ وہ دیال سنگھ کے بھی جاننے والوں سے تحقیق کر رہی ہے اس لیے تم نے نہیں جانا نہیں ہے۔"

پولیس کا سن کر میں حیرت پریشان ہو گیا تھا۔ میرے پاس تو شاید کوئی ثبوت بھی نہیں تھے کہ جس سے میں خود کو لایا کا پاشوہ جات کر سکتا۔ میں نے سوچا ہوا تھا کہ ہاروے سے ملاقات ہوئی تو اس سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے انڈیا کی شہریت والا اصرار کا رڈ دلاوے۔ بیویوں سے ہر کام ممکن تھا۔ لہذا تو وقت اختیار کرنے کے بعد میں نے نامہ جان لے لیا تھا۔ "دیال سنگھ کی بے ہوشی کے بارے میں تم میری بھی بے ہوشی میں نہیں جانتا دیال سنگھ کی کس نے بتایا ہے لیکن میں آرام سے بیٹھنے والا نہیں ہوں۔ میں بتا رہے کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن میں تمہاری جتنی کرنا ہوں کہ مجھے پولیس کے سامنے مت لاؤ، تم پولیس کو جانتی تو ہو وہ بے گناہ ہوں کو بھی جیل میں بند کر دیتی ہے۔"

"کیوں؟" اس نے ترش روئی سے پوچھا۔ "تم پولیس کا سامنا کیوں نہیں کر سکتے۔ تم تو دیال سنگھ کے گھر سے بھاگے ہو۔"

"میری بھوری ہے۔"

"کیا بھوری ہے؟" اس نے ترش روئی سے استفسار کیا۔ "کیسے دوست ہو تم کہ..."

میں نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ "بھوری۔"

"کیا؟" وہ تو پوچھ رہی ہوں۔ "وہ تو پوری تفتیش ہی کرنے پر اتار آئی تھی۔ میری بھوری نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا بھوری بتاؤں۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں نے ہی دیال سنگھ کی بتائی ہو۔"

"لیکن تم نے تو دیال سنگھ کی بتائی نہیں؟" اس نے شک بھری نظروں سے میرے چہرے کے جائزہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اگر میں اس موٹی برکڑ بڑا جاتا تو اور کچھ دیکھتا تو جیتنا ہے بے کی نظروں میں مشکوک ہو جاتا اور وہ بھی جتنی کہ دیال سنگھ کے کل میں میرا ہاتھ ہے۔"

"یہ تم کی بات کر رہی ہو ہے۔" میں نے۔

"مجھے کیا بتایا؟" وہ بھی ترش ترش ہوئی۔ وہ کہنا لگا۔ "تم نے اس کا تفتیشی انداز پولیس جیسا تھا۔ اسے پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ میں نے سوچا تھا۔ وہ لگاتی تو قوت کے طور پر ہوا۔" اور ہاں۔ مجھے بے ہوشی کے بارے میں کہیں نہیں ہوں۔ میں صرف دیال سنگھ کی بے ہوشی کے بارے میں دیکھ رہے ہیں کہتا تھا تو اچھا لگتا تھا تمہارے منہ سے کہا اچھا نہیں لگتا۔"

"اب تو وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔" میں نے انہوں کی طرح منہ پر لہجے میں کہا۔ "پلیز، پولیس کو میرے بارے میں کچھ بتانا۔"

وہ لگاتی تو قوت کے دوران بڑے غور نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ اس دوران اس کا چہرہ خاموش مگر ادھر ادھر دیکھنے میں لگا تھا۔ یوں جیسے اس نے ہم دونوں کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پولیس کو تمہارے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔" وہ ٹھیک سے لہجے میں ہوئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے یا مجھے بے وقوف بنانے کی خاطر ہائی بھری ہے۔ لیکن اس کی بات پر یقین کرنا میری بھوری تھی۔

"وہی وہ۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "تمہاری بھوری ہو گئی ہے۔"

میں اس کا شور ہوں۔

"نہیں۔" میں نے لٹی میں سر ہلایا۔

اس نے اپنی گردن اٹھاتے میں ہلائی تھی اور جاتے وقت کہنے لگی۔ "میں کھانا بھجواؤں ہوں۔"

اس کے جاتے ہی میں نے یوں سانس لیا جیسے غبارے میں سے ہوا نکلتی ہے۔ اس پرے سفر کے دوران میرا ہمت بھارت کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ جن میں اچھے بھی اور برے بھی۔ البتہ برے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ جب تک میرا سفر اختتام پزیر نہیں ہو گا کئی اور طرح کے لوگوں سے بھی واسطہ پڑے گا۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر گزری کہ کتنی بے ہوشی کا سکھ جتنا میرے لیے کھانا لے آیا۔ دیال سنگھ کی جیتا کی خبر سن کر میرا دل ادب کیا تھا اور ہموک بھی تقریباً ختم ہو گئی تھی اسی لیے میں نے کھانا میز پر رکھ دیا۔ درحقیقت میں آئندہ کا لاکھ عمل سوچ رہا تھا۔ کیا دیال سنگھ کے گھر میں رہتا ہے۔ بے ہوشی کا

میں نے لٹی میں گردن ہلائی۔ "تم چتا

میں نے اس سے اس کی عمر نہیں پوچھی تھی لیکن شاید اس نے مجھے بتانا ضروری سمجھا تھا۔ جو دن میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ وہ پانچ پرقریب ہونگے ہیں اور اس کے ارادے ٹھیک نہیں تھے۔ چالیس سال کے بیٹے میں ہونے کے باوجود اس نے اپنی عمر کو سال گن رہی تھی۔ انسان کی عمر اس کے چہرے سے بخوبی پتا چل جاتی ہے۔ چاہے وہ چالیس سال کا ہونے کے باوجود خود کو کچھ سال کا کہے۔ لیکن چہرہ بتا دیتا ہے۔ چہرہ ایک کھلا آئینہ ہے جس میں دیکھنے کے بعد انکار ممکن نہیں رہتا۔ جس طرح روپ کا چہرہ بھی اس کی عمر کا پتا دیتا تھا۔ ذہنی عروج دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس سے کوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد اپنا پورا باجس سمیٹ کر کسی اور طرف جانا پڑے گا۔ اسی میں میری بھوری تھی۔

"ٹھیک ہے کس روپا؟" بالآخر میں نے طویل سانس کھینچی اور پر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور کچھ۔"

"اب میں چلتی ہوں۔" اس نے جانے کا ارادہ کیا۔

"شکر ہے میرے اللہ۔" میں نے دل میں کہا تھا۔

روپا کو کور چلی گئی اور میں یوجھل قدموں کے ساتھ چلا ہوا کمرے میں بستر پر ڈھسے سا گیا تھا۔ میرے دماغ میں چوٹیاں سی ریگ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے جلد از جلد روپا کو کور سے جان نہ چھڑائی تو وہ میرے گلے پڑ جائے گی۔ میں تو اسے ایک اچھی عورت سمجھتا تھا لیکن وہ کچھ اور ہی لگتی تھی۔

وہ ہر دوسرے تیرے دن میں خن کر آتی اور مجھے متاثر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے دیال سنگھ کی جیتا کے حوالے سے ہونے والی تفتیش سے بھی آگاہ کرتی رہتی تھی۔ ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود دیال سنگھ کے

میں نے لٹی میں گردن ہلائی۔ "تم چتا

میرے منہ سے شکر کا سانس نکلا۔ میں نے زمین لہجے میں کہا۔ "وہی وہاں ہے۔"

بے ہوشی کے نام پر وہ جتنی مڑتا کر ہوئی۔ "میں نے کہا تھا کہ میں تمہاری بے ہوشی ہوں۔ میں صرف دیال سنگھ کی بے ہوشی۔"

"پھر کیا کہوں۔" میں نے استفسار کیا۔ "مجھے تمہارا نام ہی معلوم نہیں ہے۔"

"میرا نام روپا کور ہے۔" وہ ارادے باز سے ہوئی۔

"تم مجھے روپا کہا کرو۔ ویسے میں کئی سال کی ہوں۔"

میں نے اس سے اس کی عمر نہیں پوچھی تھی لیکن شاید اس نے مجھے بتانا ضروری سمجھا تھا۔ جو دن میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ وہ پانچ پرقریب ہونگے ہیں اور اس کے ارادے ٹھیک نہیں تھے۔ چالیس سال کے بیٹے میں ہونے کے باوجود اس نے اپنی عمر کو سال گن رہی تھی۔ انسان کی عمر اس کے چہرے سے بخوبی پتا چل جاتی ہے۔ چاہے وہ چالیس سال کا ہونے کے باوجود خود کو کچھ سال کا کہے۔ لیکن چہرہ بتا دیتا ہے۔ چہرہ ایک کھلا آئینہ ہے جس میں دیکھنے کے بعد انکار ممکن نہیں رہتا۔ جس طرح روپ کا چہرہ بھی اس کی عمر کا پتا دیتا تھا۔ ذہنی عروج دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس سے کوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد اپنا پورا باجس سمیٹ کر کسی اور طرف جانا پڑے گا۔ اسی میں میری بھوری تھی۔

"ٹھیک ہے کس روپا؟" بالآخر میں نے طویل سانس کھینچی اور پر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور کچھ۔"

"اب میں چلتی ہوں۔" اس نے جانے کا ارادہ کیا۔

"شکر ہے میرے اللہ۔" میں نے دل میں کہا تھا۔

روپا کو کور چلی گئی اور میں یوجھل قدموں کے ساتھ چلا ہوا کمرے میں بستر پر ڈھسے سا گیا تھا۔ میرے دماغ میں چوٹیاں سی ریگ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے جلد از جلد روپا کو کور سے جان نہ چھڑائی تو وہ میرے گلے پڑ جائے گی۔ میں تو اسے ایک اچھی عورت سمجھتا تھا لیکن وہ کچھ اور ہی لگتی تھی۔

وہ ہر دوسرے تیرے دن میں خن کر آتی اور مجھے متاثر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے دیال سنگھ کی جیتا کے حوالے سے ہونے والی تفتیش سے بھی آگاہ کرتی رہتی تھی۔ ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود دیال سنگھ کے

میں نے لٹی میں گردن ہلائی۔ "تم چتا

واڑی اور مونچس بھی کافی بڑھ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ سر کے بال بھی کافی بڑھ چکے تھے۔ واڑی مونچس اور سر کے بالوں کے بڑے ہونے کے باعث میرا جلیہ کافی حد تک بدل چکا تھا لیکن اس کے باوجود میں رسک نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے سوچ بچھ کر قدم اٹھانا تھا۔

اس دن بدھ تھا، دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی روپا کو رکھنا مجھے کھانا دے کر گیا تھا۔ میں کھانا کھا کر قارغ ہوا ہی تھا کہ بیرونی دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اس انداز میں دروازہ یا تو پولیس والے بجاتے ہیں یا پھر محلے والے۔ اب دونوں میں سے کون آیا تھا میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ بہر کیف، میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے جھری سے جھانکا تو مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔

باہر کافی تعداد میں مرد موجود تھے، ان میں سبھی شامل تھے۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ وہ سب مرد مجھے جاچتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے سارے آدمیوں کو دیکھ کر مجھے پریشانی نے گھیر لیا۔

”مئی کیسے... کس سے ملتا ہے؟“ میں نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

”ہم تم سے ملنے آئے ہیں۔“ ایک پختہ العمر شخص آدمی نے جواب دیا۔ ”تم کون ہو اور دیال سنگھ سے تمہارا کیا سبب ہے؟“

”میرا نام ودو ہے اور میں دیال سنگھ کا دوست ہوں۔“ میں نے رمانیت سے جواب دیا۔

”اس گھر میں کب سے رہ رہے ہو؟“

”دو ہفتے سے۔“

”کیا کام کرتے ہو؟“

”کام کی تلاش میں ہوں۔“

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”ہم ترس کا۔“ میں نے کہا۔ میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنا شروع ہو چکی تھی۔ وہ سب مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی پالی ہوں۔ سوال و جواب کا سلسلہ تیز جاری تھا۔

”دیال سنگھ کہاں ہے؟“

”کیا آپ لوگوں کو معلوم نہیں؟“ میں نے سوالیہ لہجہ اختیار کر لیا۔

”نہیں، ہم نے اس کا پتہ نہیں لے سکتا۔“

”ہاں جانتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”روپا کو کور سے تمہارا کیا سبب ہے؟“ اب کہاں دیکھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ میری سہیلی ہے۔“

”بے بے سے یا؟“ دوسرے شخص نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا اور مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں کوئی مشکوک شخص ہو۔

اور روپا کو کور سے میرے تعلقات ہوں۔ مجھے خطرہ تو بہت آیا لیکن میں نے خود پر ضبط کیا کیونکہ اس وقت وہ کافی تعداد میں تھے اور میں اکیلا تھا۔ اگر میں نے ہٹ دھرمی دکھانے کی کوشش کی تو وہ مجھے چوٹیوں کی طرح مسل کے رکھ دیں گے۔

”غلط سوچ رہے ہیں آپ۔“ میں نے صراحت اور نرمی سے کہا۔ ”میں کسی گرتے ہوئے نہیں ہوں۔“

”مہان سنگھ؟“ ایک اور شخص نے جو ان کے کونکھ میں

”یہ واڑی مار رہا ہے۔“ میں نے کھود (خود) روپا کو کور کو

”میں نے چوک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا اور وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے گزب کا احساس ہو رہا تھا۔

پختہ العمر شخص، جو شاید جہانم بدھ تھا، متانت لہجے میں بولا۔

”دیکھو ودو! ہم تجھے نہیں جانتے کہ تو کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور کیا کرتا ہے۔ روپا کو کور منور سنگھ کی دھوا ہے، اس نے اپنی ساری زندگی پتی کے نام پر گزاری (گزارنی) ہے، اس لیے اگر تو مرنا نہیں چاہتا تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ منور سنگھ کا بھائی مہان سنگھ تجھے نرک میں پہنچانے میں ایک منٹ نہیں لگے گا۔“

اب ساری بات مجھے سمجھ آ گئی تھی کہ مسئلہ کیا تھا۔ مہان سنگھ تو میری جان کا خواہاں ہو رہا تھا اس لیے منور سنگھ کی بھی اس کی بات مان لوں اور وہاں سے نو دو گھر ہوں جو جاؤں چنانچہ میں نے فوراً ہی ہجرت کر کے چلے گیا۔

”نرک ہے اگلے! اگر آپ لوگوں کو مجھ سے کوئی مسئلہ ہے تو میں انہی کے اگلی پہاں سے چلا جاتا ہوں۔“

میرے پیٹے کو گھرا رہے ہوئے کہا۔ پھر وہ سب کو وہاں سے

ہوئی یا وہ لوگ فوری طور پر کہیں اور منتقل ہو گئے ہوں گے؟ میرا قیاس تو یہی تھا کہ وہ لوگ چھوڑ چکے ہوں گے کیونکہ ان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ چکی تھی۔ دوا اور اس کے گھماشتوں نے ممکن سے دوبارہ وہاں دھوا دھولا ہوا۔ ان کی خبر گیری بھی ضروری تھی لیکن میں نکل اور اس کی دھوا دیکھ کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے تو مجھے اپنے لیے رہائش کا بندوبست کرنا تھا اس کے بعد ہی میں رتن کمار، دیپک اور داس کے مقابلے میں آؤں گا۔ دھوا ہوئی میں ایک شخص دال ہو۔

”اسلم بھائی! ایک گرم چائے چلا دو۔“ وہ آدمی چائے بنانے والے پارٹیشن شخص سے کہتے ہوئے میرے ساتھ والی میز پر بیٹھ گیا۔

”اچھا اور، چھ منٹ انتظار کرو۔“ پارٹیشن آدمی نے جواب دیا۔ ایک چائے پینے کے بعد میں نے ایک اور منگوا لی۔ میرا مقصد چائے پینا نہیں تھا، میں دقت گزار کی کے لیے اس ہوٹل میں بیٹھنا چاہتا تھا کہ شام کا اندھیرا چیلے تو میں رات گزارنے کے لیے کسی عام سے ہوٹل کی تلاش میں نکلوں۔

دو ماچائے پی کر چلا گیا۔ یہاں تک کہ مزید کسی افراد آئے اور چائے پی کر چلے گئے لیکن میں بیٹھا رہا۔ شام کے دھندلے سائے آہستہ آہستہ اپنے زہر پھار رہے تھے۔ دھوا کار کے تیز ہارن کی آواز پر ہوٹل میں بیٹھے مجھے سمیت دیگر لوگ بھی بے اختیار چوک پڑے۔ کوئی آدمی کار کا ہارن مسلسل بجھا رہا تھا جس سے انھما میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں نے بھی مڑ کر دیکھا تو ایک گائے مین سڑک کے درمیان سے تیز چلی گئی اور کار والا مسلسل ہارن بجھا رہا تھا شاید وہ جلدی میں تھا گائے کا مالک اس کی رسی تھا سے اسے زور زور سے کھینچ رہا تھا لیکن گائے جی ٹکڑی تھی۔ اس کی وجہ سے وہاں ٹریفک بھی بلاک ہو گیا تھا۔ دوسری گاڑیوں نے بھی ہارن بجائے شروع کر دیے تھے۔

دھوا کار میں سے ایک سوئٹ بوٹز نو جوان باہر نکلا اور گائے کے مالک سے کہنے لگا۔ ”کیا خیر ہے انھوں میں خلالت نہیں ہے جو اپنی مائٹ کو کھینچ نہیں سکتا۔“

اس کی بات سے میں نے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ وہ آدمی مسلمان ہے۔

والے آدمی نے منہ نہ کھولا۔ وہ ہلکا سا اور اس نے اپنے ماتھے پر سونہرہ لکھا ہوا تھا۔ سبھی سونہرہ پتھر آدمی نے آگے بڑھ کر گائے کو ٹھٹھا مارا۔ گائے شاید ضدی بھی وہ اپنی ہی جگہ جمی رہی تھی۔

”اے تم ہماری گفوانا کولات سے مار رہا ہے۔“
وقتاً بوقتاً کھانسی سے ایک سانسو کی راحت کا آدمی باہر نکلا اور
فصے سے کہنے لگا۔ وہ بہت دھوا اور اس کے ماتھے پر بھیجی تک
خواب اس کا رنگ تانے کی طرح چمک رہا تھا۔

”تمہاری گزشتہ رائے درست ثابت ہوئی ہے۔“ جواباً
 ڈیڑھ گھنٹہ بعد آدی نے مڑ کر جواب دیا۔ ”کیا دکھائی نہیں دے
 گا؟“

”ہماری گونا گونا گوں جمع (عزت) سے لے کر“
 نے غیبیہ لہجے میں کہا۔ میں اور ہوش میں موجود سب
 اٹھ کر ہوئی سے باہر آ گئے تھے۔ چند لمحوں میں وہاں
 کا جہ فیر لگ چکا تھا۔

جانباز اور سہیل نے اسے دیکھا تو ان کے دل میں غصہ پیدا ہو گیا۔

”تیری تو.....“ ہندو آدمی حقیقتاً کہتا ہوا سونڈ بوٹڈ کی طرف بڑھا۔ ”تو ہماری ماما کی توہین کر رہا ہے
میں تم اسے توڑ دوں گا۔“

ہندو مسلمانوں کو مسلا کہہ کر پکارتے ہیں۔ سب
 ہیں کہ ہندو گائے کو مقدس جانور سمجھتے ہیں اور اس کی
 سب سے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اسے اپنی ماں کا درجہ دیتے
 اپنی مائے کا خاطرہ وہ کٹ مرنے بھی تیار ہو جاتے
 یہاں تک کہ وہ ہندو ہو گیا تھا۔ جبکہ مسلمان گائے کو ایک
 جانور سمجھتے ہیں اور اسے ذبح کر کے اس کا گوشت
 نہیں۔

”زبان سنبھال کر بات کر۔“ سوئٹڈ یونیفارم نے بھی
 کہا۔
 ”رام“

”تو زبان سنبھال کر بات کر۔“ وہ بھی دوہرہ بولا۔
اس نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ”تم مسئلہ زمین
ہے۔ تم لوگوں کی حشمت میری اس تھوک سے بھی

کلی ہاؤم مسلوں کو کہا ہے کہ ہماری گاؤں میں سے جہت سے چلے آیا کرو، لیکن تم لوگ کھجے ہی نہیں ہو۔

یہاں رہتا ہے تو ہماری گامگاہ کی محبت (عزت) کی گارنٹی ہے۔
اسے اپنی ماں سمجھو۔۔۔

بھی بنا خوف کے دو پرہیز بولا۔ "تمہاری نظر میں اس کا گوشت کھاتے رہیں۔ تمہاری عزت ہوگی۔"

کالی۔ وہ بچر گیا تھا۔ فیصے سے اس کی رحمت پہلے سے بڑی
بادہ کالی ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحہ اس نے

یہاں پہنچے رہتا تھا۔ اس کی غیرت کہاں گوارہ کرتی کہ کوئی

ریبان پکڑ لیا، پھر دونوں کے درمیان اقتصادی شرٹوں کا
 ایک اور ایک دوسرے پر کموں کے وار کر رہے تھے۔

نہ کے لیے گائے فروش کرنے کا بیڑہ بنا لیتے ہیں۔

پتا نہیں کس نے! اجپا پتہ ہندوؤں کو فون کر دیا تھا کہ

تے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ وہ شکل و صورت سے ہی
 لگتے تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ جؤ، اس مسلمان پر

ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائی کو بچانے کی
 کی اور اسی کوشش میں وہ بھی ہندو بلوائیوں کے
 شدید زخمی ہو گئے۔ وہ علاقہ میدان جنگ کی صورت

رہا تھا۔ پولیس کے آنے تک ہندو بھائیوں نے
نوجوان کو اتنا مارا کہ جب تک وہ مر نہیں گیا انہیں
پیش کیا تھا۔

ہے یہی وہاں پولیس پہنچی تو ہندو بلوائی "بے شری
نعرہ لگاتے ہوئے تہتر ہو گئے۔ میں نے اپنا
ہے اس سوشل بوڈ ٹو جان کی خون میں بہت

تھی۔ پتا نہیں وہ کس کا بیٹا تھا، کس کا بھائی تھا، کس کا اور کس کا شوہر تھا؟
ہاں جو وہ کوشش کے اُس مسلمان بھائی کی مدد نہ کر

مجھے ابھی تک دکھ ہے۔ کاش میرے پاس اتنی

فاس

مراکش کا ایک شہر اور سلطان کا مقام حکومت۔
آبادی دو لاکھ سے زائد۔ محل وقوع اسیابی اہم اور
شاندار ہے۔ فاس درحقیقت دوسرے درجے کا شہر ہے۔

فاس اجدید (نیا شہر) اور فاس البانی (پرانا شہر) فاس
 اجدید میں سرکاری دفاتر کا شہر ہے۔ صرف دارالحکومت ہی
 نصف سے زیادہ شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ دارالحکومت

ملاؤں اور احاطوں کا مجموعہ ہے جہاں حکومت
مرکزی دفتر واقع تھا۔ وہاں کے ملازمین
اور کوٹھک سلطانی بھی بیٹھتے تھے۔ ان کے علاوہ

رکھتا ہے اور جو اپنی ہیز رنگ کے گھٹاؤں کی چھتوں سے بچا جانے جاتے ہیں۔ یہاں طبر کی سیریاں سے طاقت

کے لیے ایک خصوصی کوٹنگ، مثالی چڑیا گھر، اسلیم خانہ اور باغات ہیں۔ تھوڑا سا جلد ہی، جتنی میں سب سے زیادہ قابل ذکر مسجد جامع، جامع احمد اور جامع اعظم

قیل۔ یہ مساجد اپنے میناروں کے رنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ فاس، آجندہ، وراصل فاس، البالی کا ایک ولی قصبہ ہے۔ فاس البالی کا نقشہ سے شہر کی نسبت

بہت ممنوع اور دس منظر پیش کرتا ہے۔ یہ شہر دیارے
قاس کی جنگ وادی کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس
کے مکانات، مساجد اور باغات اللہ پہاڑوں کی

فصل تک گھرے ہوئے ہیں جو چٹانوں کے پستوں پر بنائی گئی ہے۔ قاس صرف اپنے گل و قلع کی

خوبصورتی کی وجہ ہی سے نہیں، بلکہ اپنی مذہبی یادگاروں کی اہمیت کی بدولت بھی سارے مغرب اقصیٰ میں ممتاز و معروف ہے۔ یہاں مختلف شاخوں

خاندان کے بعد دیگرے سربراہان سلطنت ہوئے۔ اور انہوں نے پیشواؤں کے ناموں سے شہر کو مال کرنے کی طرف اپنا توجہ مبذول کیا۔

چنانچہ شہر میں تمام سلسلوں کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی آٹھ سو پچاس مذہبی عمارتیں، مساجد، مدرسے، عمارت خانے، زراوے یا معبد ہیں جو کسی نہ کسی بزرگ کے

مقبورے کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔
مرسلہ: سلطان محمد کویت

led with free

وقت انتظار کرنے کے بعد کہنے لگا۔ "میرا نام اسلم ہے۔
 ویسے سب لوگ مجھے حاتی اسلم کہتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ
 جب کوئی جگہ کر لینا ہے تو پھر اس کے نام کے ساتھ حاتی جو
 جاتا ہے۔ بہر کیف، میرے پاس کام ہے۔ کام تمہارے
 شان و شان ہے یا نہیں۔ تو نہیں جانتا لیکن کرو کہ تو تمہارا
 فائدہ ہو جائے گا۔ رہنے کے لیے رہاؤں گی میں دونوں گا۔"
 میری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ قدرت نے میرے
 رہنے کے لیے انتظام کر دیا تھا اس لیے میں نے کچھ بھی
 سوچے کچھ نہیں سوچے۔ پھر پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر
 لیا۔ یہ میں نے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے پاس کڑی قسم ہوتی
 جا رہی تھی۔ کڑی کے بغیر میرا گزارا ناممکن ہو جاتا تھا اس
 لیے میں نے فوراً ہائی بھرے ہوئے کہا۔ "شکریہ، میں
 نوکری کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن مجھے کیا کرنا ہوگا؟"
 "کچھ خاص نہیں۔" حاتی اسلم پر سوچ لگے میں
 بولے۔ "مجھے ایک بندے کی ضرورت ہے جو رات کو
 میرے ہونٹ کی دیکھ بھال کر سکے۔ میرا ہونٹ ہے تو چھوٹا سا
 لیکن چور چوری کرنے سے بھر بھی باز نہیں آتے۔"
 "یعنی مجھے چوکی داری کرنی پڑے گی۔" میں نے
 گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔
 "ہاں، لیکن مجھ کو۔" حاتی اسلم نے گردن کو جنبش
 دیتے ہوئے کہا۔ "تمیں وقت کا کتنا میری طرف سے ہوگا۔
 اس ہونٹ کے پیچھے ایک کمرہ ہے جہاں دن میں تم آرام کر
 سکتے ہو۔"

میں چند تارے حاتی اسلم کی پیش کش پر غور کرتا رہا پھر
 میں نے ہائی بھرے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے حاتی صاحب،
 مجھے منظور ہے۔ گواہ کتنی ملے گی؟"
 "تمہارے خیال میں کتنی ہونی چاہیے؟" حاتی نے
 اسلم نے گید بھری گھٹ میں بیچک دی اور مستشرقانہ
 نظروں سے مجھ دیکھنے لگے۔
 "مجھے تو اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔" میں نے
 حجت لگے میں کہا۔ "آپ جو سمجھ دیں گے مجھے منظور ہو
 گا۔"

"جی منکور ہے۔"
 "ماشاء اللہ۔" حاتی اسلم خوش ہو گئے۔
 مجھے حاتی اسلم کے ہونٹ میں چوکی داری کی فکر نہیں
 تھی اور میرے لیے کسی سہ چھانے کے لیے نہیں کہہ
 تھی۔ میں رات کو جاگ کر ہونٹ کا پتھر دوں گا وہاں جس قدر
 کمار کے خلاف کام کروں گا۔
 میری ڈیوٹی اسی رات سے ہی شروع ہوئی تھی۔ حاتی
 اسلم کا ہونٹ رات آٹھ بجے بند ہو جاتا تھا۔ حاتی اسلم نے
 ہونٹ کی صفائی ستمرائی اور برتن دھونے کے لیے دو گلاسے
 رکھے ہوئے تھے۔ دونوں مسلمان تھے۔ ہونٹ پر اردو زبان
 میں چھاپا ہوا اخبار بھی آتا تھا۔
 میں نے وہ رات ہونٹ کی چوکی داری کرتے ہوئے
 گزار دی تھی۔ میں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔
 ہونٹ کا دروازہ اندر سے بند کیا جاتا تھا جس کی چابی میرے
 پاس ہوتی تھی۔ مجھے حجت بھی تھی کہ حاتی اسلم نے میرے
 خوالے سے کوئی چھان بین نہیں کی تھی اور مجھے نوکری پر لگانا
 تھا۔ یہی بات اگلے دن میں نے حاتی اسلم سے پوچھ لی تو وہ
 مسکرا دیے۔ پھر کہنے لگے۔
 "بیٹا! ہم دونوں ہی مسلمان ہیں اور مسلمان ہی
 مسلمان پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم مجھے بھی کئی
 دھوکا نہیں دو گے اسی لیے میں نے چھان بین کرنا ضروری
 نہیں سمجھا۔"

حاتی اسلم کی بات نے میرے اندر نئی دھڑک چمک
 دی تھی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی تھی اور میرا سر خڑے بلند ہو گیا
 تھا۔ میں بڑی تندہی سے ڈیوٹی کرتا رہا۔ مجھے میں وقت کا
 کھانا مل رہا تھا۔ میں صبح ناشتا کرنے کے بعد ہونٹ کے پیچھے
 کمرے میں جا کر سو جاتا تھا اور دن دو یا تین بجے ہی اٹھا
 تھا۔ دوپہر کا کھانا میں حاتی اسلم کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا تھا۔
 کھانا حاتی اسلم کے گھر سے ہی آتا تھا۔ جو بے حد لذت بخش ہوتا
 تھا۔ اس کی چھٹی چھٹی اشتہا میری بیوک اور بڑھا دیتی تھی۔
 میرے شب و روز اسی ہونٹ میں گزارنے لگے۔ وہاں
 کام کرنے والے دونوں لڑکے مجھ سے خاصے باتوں ہو گئے
 تھے۔ ایک ہفتہ گزارنے کے باوجود میں اس ہونٹ سے باہر
 نہیں نکلا تھا۔ میں اخبارات کا پانچواں صفحہ سے مطالعہ کرتا تھا
 کیونکہ رات کو میرے پاس کرنے کو کوئی کام ہی نہیں ہوتا تھا
 تو اخبارات کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ موسم بھی بدل رہا تھا۔

اساتیرا نکل سے دن گزار کر پورٹ گیا جاسکتا تھا۔ میں
 اساتیرا تو تھا نہیں کہ کسی عمارت کی حجت پر بیٹھ کر دن گزارا
 نشانہ لے سکتا لیکن اگر کوشش کروں تو شاید میں کامیاب ہو
 جاؤں۔ مجھے اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا لیکن مسئلہ
 اساتیرا نکل کا تھا اس کا میں کیسے انتظام کرتا؟
 مجھے ایک بار بھر مسٹر بارو سے تک درمیانی حاصل کرنا
 ہوئی تھی اساتیرا نکل میرا کر سکتا تھا۔ رات کے لیے پتھر
 کوئی بھی کام کرنا ناممکن تھا اس لیے میں نے دوبارہ رات
 لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دن گزار کر کمرے میں پہنچنے کا یہ موقع
 میں کسی صورت گنوا نہیں جاتا تھا۔ مجھے جلد از جلد اس تک
 پہنچنا تھا۔ میں نے جیب میں موجود کڑی چمک کی تو ابھی
 اتنے پیسے موجود تھے کہ میں راتوں میں اس سفر کر سکتا
 تھا۔ دفعتاً میرے سب فون کی گھنٹی بج اُچی تو میں نے بے چارے
 ہوئے سب فون نکالا۔ کسی انجمن فیس سے کال آ رہی تھی۔
 میں نے قرب و جوار میں دیکھتے ہوئے کال اٹھائی۔
 "ہیلو۔۔۔۔۔" میں نے دھیمی گھنٹا لگے میں کہا۔
 "دوپاکر بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے روپا
 کوہ کی آواز سنائی دی جو میرے لیے کسی دھماکے سے گم نہیں
 تھی۔ اس کے پاس میرا نمبر کیسے چھپا؟ میں نے خود سے
 سوال کیا۔
 "کون روپا کوہ؟" میں نے انجمن جتنے ہوئے
 پوچھا۔
 "ارے اتنی جلدی بھول گئے ہو۔" روپا کوہ نے
 زور دے لگے میں کہا۔ "یا جان بوجھ کر بھول رہے ہو؟"
 میں نے سختی سے ہونٹ پیچھے لیے۔ یہ بلا کہاں سے
 وارد ہوئی تھی میں نے سوچا، پھر کہا۔ "اوہ روپا۔۔۔ دیال
 سٹیک کی ہے۔"

"ارے تو تو بزدل نکلا ہے۔"
 "کیوں؟"
 "تجھے حملے کے لوگوں نے ڈرایا اور تو ہلکا نکلا۔"
 "تو کیا کرتا؟"
 "کچھ بھی کر سکتا تھا۔" روپا نے کہا۔ "کہہ دیتا کہ تو
 دیال سٹیک کا بھائی ہے۔"
 "اس سے کیا ہوتا؟" میں نے منہ بولا۔ "سہاہو"
 میری بات پر یقین کر لیتے۔ خیر تم نے کس لیے فون کیا ہے،
 تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟"

”جہاں ابابلی۔“ ”میں تم سے ملنا چاہتی ہوں بلکہ اس طرح کرو کہ آج رات میرے کمر آجائے۔“
میرے دماغ کی تپانیاں روشن ہوئیں اور میرے دل میں اس کے لیے غرت بھر گئی۔ میں کچھ گھبرا کر وہ مجھے کیوں بلاتا چاہ رہی ہے تاہم میں نے اپنی کیفیت پر یہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”روپا کو! میں معذرت چاہتا ہوں، میں نہیں آسکا اس لیے میرا انتقام رات کرنا۔“
”کیوں؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

جیسے کہ کریں۔ میں نے کہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے۔“

[illegible]

کار میں جس حد جس کی وجہ سے مجھے جسم کے
مساموں نے پینا اور گنا شروع کر دیا تھا چندی گھنٹوں میں اپنے
سے شرابور ہو گیا تھا۔ مجھے بہت محسوس ہو رہی تھی کہ میں
میں مجبور تھا۔ بھلاست مجھ پر تو انسان کو بہت کچھ برداشت
کرنا پڑتا ہے۔ سو میں بھی برداشت کر رہا تھا۔

ہاروے کا نام سننے ہی میرے وجود میں شہناہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی تھی یوں جیسے میرے وجود میں برق مچر گئی ہو۔
 ”جی۔۔۔ میں کنسٹرکشن کمپنی کے آفس سے ہی ہو کر
 مگر جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔۔۔ وہ کل مکمل
 تحفیہ لگا دیں گے۔ جی ٹیک ہے۔“
 ایک بار پھر مجھے تسنن و تسبیح پڑھ کر پوچھنے جانے کی
 آواز سنائی دی۔ قدرت میرے لیے قدم قدم پر راہیں کھول
 رہی تھی، میں ہاروے سے رابطے کے لیے پریشان ہوا جا رہا
 تھا لیکن قدرت نے یہاں آسانی پیدا کر دی تھی۔

کی بابت پوچھا تو میں نے بیٹری کے ڈیڑے ہونے کی اطلاع
 پیش کی۔ بہر کیف حاجی اسلم نے برائے نام انداز دیکھے گا تو جبر
 دیا۔ میں بھی گا کہوں کو چائے پیش کرنا رہا تھا۔
 میں رات آٹھ بجے تک ہونے پر کام کرتا رہا بل
 کے ساتھ مل کر برتن بھی دھوئے، پھر سب کام سے قورس
 ہونے کے بعد حاجی اسلم اور بل چلے گئے تو میں تھا کہ
 اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات کا کھانا میں نے حاجی اسلم
 اور بل کے ساتھ مل کر کھالیا تھا۔ تھکاوٹ کے باعث
 نیند بھی آ رہی تھی لیکن میں نے ابھی رات کی ڈیڑی
 تھی۔ ساتھ ہی میں مسٹر ہاروئے سے رابطہ کرنا چاہتا تھا
 چنانچہ میں نے موہن کا سیل فون نکال کر اسے آگے کر دیا۔
 چند ہی لمے گزرے تھے کہ اس کے سیل فون کی حیرت
 مچی۔ میں نے دیکھا اسکرین پر نمبر ایک مگر ہاتھ
 کیا تھا کہ یقیناً موہن ہی کا نمبر رہا ہوگا۔ ظاہر ہے اس کا
 فون اس کی کار سے اچانک غائب ہو گیا تھا، اس نے
 ریٹائر تو ہو ہی تھا۔ میں نے فون سننے کی بجائے
 کی اور کال ٹیبلٹ لسٹ کھول کر مسٹر ہاروئے کا نمبر
 اس کا نمبر "باس" کے نام سے دیکھا۔ اس کا نمبر
 فون میں محفوظ کرنے کے بعد میں نے موہن کا سیل فون
 ف کر کے کچے کے چمچے کرکھا اور مسٹر ہاروئے کا نمبر
 دوسری طرف منتقلی بھیجے گا تو میرے دل میں موہم
 بد جاگ اٹھی تھی۔ دوسری طرف مسلسل منتقلی
 ہر باروئے نے کال اسٹینڈ نہ کی۔ میں نے دوسری بار نمبر
 ڈائل کر دیا۔ اس مرتبہ بھی پہلے کی طرح ہوا۔ ابھی
 خود کو سمجھا یا کہ شاید وہ کبھی مصروف ہوں گے اس لیے
 فون نہیں اٹھا رہے ہوں گے یا ممکن ہے وہ انجان نمبر
 لکھ کر رہے ہوں۔

مشر ہارے۔ میں نے خوشی سے پھولے نہ
 ہائے ہوئے کہا۔ "میں بول رہا ہوں۔۔۔۔۔ موس۔"
 "موس۔" ہارے نے زہر لب دہرایا، میں نے
 حضور میں دیکھا کہ وہ میری آواز سن کر پھل ہی پڑا تھا۔
 "میں کبھی ہوشم؟ میں تمہاری وجہ سے بہت پریشان
 ہوں۔ چلو ابھی جا رہا ہوں۔ ہارے نے پھر جھکی ہے۔
 میں نے نہیں کہا کہ میں حاضر نہیں کیا، لیکن تم نے کانام ہی
 لیا ہے۔" "میں مشکل حالات سے گزر رہا ہوں مشر ہارے۔"
 "میں تمہارے حالات کے کشمکشوں نے مجھے مارنے
 کی کوشش کی ہے۔" "میں نہیں چھوڑی، وہ ابھی تک مجھ کے کتوں کی
 طرف اشارہ کر رہا ہے۔" "آپ سے ملاقات ہوگی
 تو اس بات کی تفصیل سے متاثر نہ ہوگا۔"
 "میں نے یہ بات

”کیا مطلب؟“

”میں نے جیک کے قاتل بلکہ قاتلہ کو جہنم
اصل کر دیا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”ہمم۔“ انہوں نے سنجیدہ انداز میں جھکری
کر لی۔ ”کیا ہر کب مجھ سے مل رہے ہو؟“

”میں آپ سے جلد سے جلد ملنا چاہتا ہوں۔“ میں
نے کہا۔ ”کچھ دن کے بعد تین تین ایک ہوگی کا افتتاح
کئے جا رہا ہے۔ اس بار میں اسے ترک پہنچانے کا موقع

ضرورت ہے۔ جس ہونٹ کا انکشاف تھ کر کہہ کر نے ہمارا ہے
میں نے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ وہ ہونٹ
ریٹے لے لیٹھیں کے پاس ہے۔
”اں مجھے معلوم ہے۔“ ہاروے کی گھبراہٹ واز سنا
دی۔ ”میں تمہیں ایڈریس پیش کر رہا ہوں، تم کل رات میں مجھ
سے ملو۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ مجھے تمہارا بہت مگر
تھی، جیسا کہ گزشتہ سے رابطہ ہو گیا وہ نہ جانا نے مجھے نہیں
چھوڑنا تھا۔“
”شکر ہے ہاروے صاحب۔“ میں نے ممنون لہجے
میں کہا۔ ”آپ ایڈریس پیش کر دیں، میں کل آپ سے ملنے
آؤں گا۔“

”یوں لودیا“ میں نے مختصر کہا۔
 ”تم ابھی تک پہنچے نہیں۔“ روڈ کار نے حکم آمیز لہجے
 میں دریافت کیا۔ میں نے اسے دل میں گلا دی۔ ”لوگوں کی
 پنہلی۔ ایسے پوچھ رہی ہے جسے میں اس کا ذرا قرعہ نظام
 ہوں۔“

”میں نہیں آ رہا روپاکوہ“
 ”کیوں؟“
 ”میں بہت بڑی ہوں۔“ میں نے بیان کیا۔
 ”سوچ لو دونو۔“ روپاکوہ مشکل براہ راست آئی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں۔۔۔۔۔“
 ”تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے کہ میں دیوانہ
 سمجھ کی چیز میں ملوث ہوں۔“ میں نے ترخت اس کی بات
 کو ٹھکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں۔۔۔۔۔“

ہاں، دوبارہ فون کرنے کی رحمت نہ کرنا میں اب کی بار تیار ہوں نہیں اٹھاؤں گا۔"

اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے کال کاٹ دی اور فون میز پر رکھ کر دوبارہ فون کو بڑبڑاتے ہوئے گاٹی دی۔ "ٹھوکی بھی۔ چائیں خود کو کیا سمجھتی ہے۔"

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دوبارہ کال کا بھرفون آ گیا۔ میں نے تعجب بھری نظروں سے اس کا نام دیکھا لیکن فون نہ اٹھایا، بالآخر فون ننگ ننگ کر بند ہو گیا۔

میں نے اسے دھکی دے تو دی تھی لیکن نہیں معلوم تھا وہ واقعی پولیس کو میرے بارے میں بتائے گی یا نہیں۔ روپا کو انکی عورتوں سے اچھائی کی توقع رکھنا بھی عیث ہے۔ اپنے مطلب کے لیے انکی عورتیں نفسیاتی طور پر پاگل ہو جاتی ہیں اور جو ان کے دل میں آتا ہے وہ کرنے سے گریز نہیں کرتیں، چاہے اس کے غلط نتیجے کا احساس بعد میں ہو۔ اس کے بعد روپا کو دوبارہ فون نہیں آیا تھا۔

گھر کی اذان ہوتے ہی میں نے وضو کر کے نماز پڑھی پھر حاجی اسلم کا انتظار کرنے لگا، اس کی آمد ٹھیک چھ بجے ہوئی تھی۔ خیر سے میری آنکھیں پوچھ بوری تھیں اس لیے میں حاجی اسلم کے کہنے پر سونے کے لیے چلا گیا۔ اپنا اور موہن کا سیل فون میں نے بیچے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ باروے کے پاس جانے سے پہلے ٹھوڑی دیر کے لیے خیر سے گرفتیش ہو جاؤں۔ مجھے پوری امید تھی کہ میں دوبارہ حاجی اسلم کے پاس واپس نہیں آؤں گا۔ میں جانے سے پہلے اس بارے میں حاجی اسلم کو بتا دوں گا تاکہ وہ کسی طرح کے شش و پنج میں مبتلا نہ رہیں۔

میری آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں گرفتیش ہو کر ہوئی میں آیا تو کابکوں کا رش کم تھا۔ ارشد بھی کام پر آ چکا تھا۔ میں نے حاجی اسلم کے پاس جا کر سلام کیا تو اس نے جواب دینے کے بعد انتظار کیا۔ "کیا کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی حاجی صاحب۔" میں نے جواب سہلے سے دیا۔

"کو بیٹے۔" وہ شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

"جی حاجی صاحب۔" میں نے لمبائی توقف کے بعد دوبارہ کہا۔ "میں یہ نوکری چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

حاجی صاحب میرے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

انتظار چو گئے۔ ایک کپ میں چائے ڈالتے ہوئے ان کا ہاتھ لکھ بھر کے لیے رک گیا۔ انہوں نے کپتلی ایک سائیکل پر رکھی اور جیت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے انتظار کیا۔ "میاں! کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟"

"نہیں حاجی صاحب۔" میں نے عاجزی سے کہا اور صراحت دی۔ "آپ تو بہت اچھے انسان ہیں۔ آپ نے مجھے نوکری دی، رہنے کے لیے جگہ دی میں آپ کا سب سے ممنون ہوں۔"

"پھر نوکری چھوڑنے کی کیا وجہ ہے؟"

"حاجی صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے ایک دوست مل گیا ہے جس نے میرے لیے ایک نئی جگہ میں چاہ اور رہنے کے لیے جگہ کا بندوبست کر دیا ہے۔" میں نے جھوٹی وضاحت دی۔ "اس لیے میں اس کے پاس جانا چاہ رہا تھا۔"

حاجی صاحب چند لمبے کچھ سوچتے رہے، پھر انہوں نے اذیت میں سر ہلا دیا۔ اگلے ہی پل ان کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرا آئے تھے۔ انہوں نے مجھے ہلکی سی بات ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے میاں! اللہ تعالیٰ کا مایاب کرے لیکن میں تمہیں ایک شرط پر جانے دوں گا۔"

آخر میں انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سسٹنسی پیدا کر دیا تھا۔

"جی حکم کیجیے۔" میں نے سعادت مندی سے کہا تو حاجی اسلم نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"شرط یہ ہے کہ تم مجھے کبھی کبھی ملنے آیا کرو گے اور تم نے جتنے دن یہاں کام کیا ہے میں تمہیں اس کی تحواہ دوں گا۔ بولو منظور ہے تو ٹھیک، ورنہ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔"

"جی۔" میں نے زبردست ہنستے ہوئے کہا۔ "حاجی صاحب۔ گوکہ میں نے آپ کے پاس صرف چند دن ہی کام کیا ہے، اگر آپ اسرار کرتے ہیں تو میں تحواہ لے لوں گا لیکن۔" میں نے لمبائی توقف اختیار کرتے ہوئے سانس لیا اور بات آگے بڑھائی۔ "لیکن میں آپ کی پہلی شرط کے بارے میں وعدہ نہیں کر سکتا، ہاں البتہ کوکیش ضرور کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" حاجی صاحب نے سہلے سے ہنستے ہوئے

دھت سے رخصت ہونے لگا تو حاجی صاحب نے ہاتھ دے دی۔ میں نے پیسے نہیں گنے تھے بلکہ ان میں سے کچھ روپیے تھے۔ حاجی صاحب، ارشد کے بعد میں ہوٹل سے نکل کر چوک کی طرف چلا گیا۔ مجھے اپنے چہرے پر حد تک ہلکے ہلکے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے بارے کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ وقت گزرتا تھا۔

میں نے ڈرائیور کو چوک پر بھیجا تو ڈرائیور نے بتایا کہ ڈرائیور نے مجھے کچھ گھر کی کالوں کی بات پوچھا۔ میں کوکیش کے نمبر پر کال کر کے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے کال ڈالی تو ڈرائیور نے کہا۔ "میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔" مسٹر صاحب۔ ان کو بتا دے کہ میں اس کے نمبر پر کال کر کے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے کال ڈالی تو ڈرائیور نے بتایا کہ ڈرائیور نے مجھے کچھ گھر کی کالوں کی بات پوچھا۔ میں کوکیش کے نمبر پر کال کر کے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے کال ڈالی تو ڈرائیور نے کہا۔ "میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔"

میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔ "میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔"

میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔ "میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔"

میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔ "میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔"

میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔ "میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔"

میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔ "میں نے اس سے انتظار پر میں نے اس سے کہا۔"

باروے نے اپنے پیچھے کھڑی عورت کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "مسٹر مورس! ان سے ملو، یہ میری مسز ہے اور میں۔" پھر وہ اپنی بیوی سے خطاب ہوئے۔ "یہ مورس ہے، جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا۔"

رہنا نے بھی مجھ سے معاملہ کیا تھا پھر ہم دونوں پر ہنسنے لگے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے باروے کو الٹ سے لے کر بے تک ساری باتیں بتا دی کہ مجھ پر کیا کیا ہوئی تھیں کہاں کہاں اور بد پر ہمارا ہا۔ باروے نے ساری باتیں سنی، اور شجیدگی سے کئی کئی۔ میں نے اس کے کلب میں آگ گئے پر بھی انہوں کا انتظار کیا تھا۔ اس دوران ان کی بیوی کی کام سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں چہلے خاموشی طاری رہی پھر باروے نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ "جی جیو ہوا تھا وہ چکا، میرے کلب کو آگ دینا تھا۔ میں ان کو لگتی تھی۔"

اس نے مجھے فون کر کے بتایا تھا۔ وہ بہت خوش تھا مجھے میرے کلب کو آگ لگا کر اس نے بہت بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہو۔ خیر وہ تمہارا ہی نہیں میرا بھی دشمن ہے اور جب تک میں اسے موت کے گھاٹ نہیں اتار لوں گا مجھے سکون نہیں ملے گا۔" ان کے کلب میں دروازے سے مشاہیر فراہم ہو آئی تھی۔ چہرے کے اظہار محسوس ہو گئے تھے۔ انکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک باہر پھر گہری خاموشی نے راج کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس لیے ایک پورچی ملازمہ ٹرے اٹھائے آئی۔ ٹرے میں چائے کے علاوہ بسکٹ بھی تھے۔ اس نے خاموشی سے ٹرے میز پر رکھی، دو کپوں میں چائے اٹھائی، ایک ایک کپ ہمارے سامنے میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔

"چائے پیو۔" باروے نے ایک کپ اٹھاتے ہوئے کہا تو میں نے بھی ہاتھ بڑھا کر کپ اٹھالیا۔

دوران چائے ہم دونوں رتن کمار کے حوالے سے ڈسکس کرتے رہے۔ باروے کا منظر یہ تھا کہ رتن کمار کو معلوم تھا کہ میں کتنی میں موجود ہوں اور اسے قصاص پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہوں، اس کے ہر کارے پر دقت چوک ہیں اور رتن کمار کی حفاظت کے لیے وہ ہر دھڑکی بازی لگا دیتے تھے، لیکن جب رتن کمار کوئی کی انتہائی غریب میں پہنچے تو اس کے ہر کارے چاروں اطراف میں پہلے پہل اس لیے اسے نارگن کرنے کے لیے ایک ایک پیلو کو بکھیر رکھتا تھا۔ یہ بات میرے بھی دماغ میں تھی اور میں نے

رتن کمار کے بارے میں اس لیے اسے نارگن کرنے کے لیے ایک ایک پیلو کو بکھیر رکھتا تھا۔ یہ بات میرے بھی دماغ میں تھی اور میں نے

دوسری خبر میرے لیے افسوس ناک تھی۔ شرافت صاحب کی بیٹی پر بیٹھے بٹھائے میری وجہ سے مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ پتا نہیں ان کا میرے بارے میں کیا توکل تھا؟ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے اختیار میز پر رکھا، صوفے کی پشت سے سر اٹھا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ دس منٹ ہی گزرے تھے کہ رینڈم چائے بنا کر لے آیا۔
 ”اے اس کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے کپ لیتے ہوئے ازراہ تکلف کہا۔

”اپنے لیے بنا رہا تھا تو سوچا تمہارے لیے بھی بنا لوں۔“ رینڈم صوفے پر بیٹھے ہوئے بولا۔ ساتھ ہی اس نے چائے کی چمکی لی۔
 ”شکریہ۔“

”جسٹس جب بھی کسی چیز کی ضرورت پڑے تو بتا دیا کرو۔“ رینڈم نے کہا۔ ”تم باس کے خاص مہمان ہو۔ باس نے خاص طور پر تمہاری خدمت کرنے اور تمہارا خیال رکھنے کی تاکید کی ہے۔ اگر باس کے حکم کی جیل میں مجھ سے ذرا سی بھی کوتاہی ہوگی تو باس مجھے الٹا لٹکا دے گا۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بریک گئی۔ میں بھی مسکرا دیا اور چائے کی چمکی لی۔ اس نے چائے بہترین بنائی تھی۔

”ہمم۔۔۔۔۔“ میں نے جواباً ہرکاری بھرنے پر ہی اکتفا کیا۔ میں نے چائے کی دوسری چمکی لی تو اچانک مجھے اپنا سر کھومتا اور آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے تارے ناچے ہوئے محسوس ہوئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے حواس میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہوں۔ اگلے ہی لمحوں میرے دماغ میں ایک جھٹکا ہوا۔ میری چائے میں نشہ آور دوائی ملائی گئی تھی۔ میرے ہاتھ سے کپ چھوٹ کر فرش پر چھانکے کی آواز کے ساتھ جا گرا۔ میں نے اپنا سر بار بار جھٹکا لیکن تاریکی دور نہ ہوئی اور پھر جس طرح کیمیرے کا شٹر بند ہوتا ہے اسی طرح میرے دماغ کی جی بھی بجھ گئی اور میں بے ہوش ہو کر صوفے پر لیٹا رہ گیا۔

☆☆☆

وہ ایک کوٹھڑی تھی جو ہر سامان سے عاری تھی۔ گھب اندھیرا ہونے کے باعث مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کوٹھڑی کتنی بڑی ہے۔ جب مجھے ہوش آیا تھا تو میں ٹھٹھے فرش پر موجود تھا۔ پہلے تو میں خالی الذہنی کی حالت میں پڑا رہا پھر جب میرے دماغ کے پردے پر گزرے ہوئے واقعات کسی فلم کی طرح چلے تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں رینڈم کے ساتھ

ڈراماٹک روم میں بیٹھا جاتے ہی رہا تھا کہ دوسرا گھونٹ لیتے ہی میرے دماغ میں تاریکیاں غلبہ پاتا شروع کر دیا تھا پھر میرے ہاتھ سے کپ چھوٹ کر فرش پر گر گیا اور میں سیدھے ہوش ہو گیا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا اور اپنی آنکھوں کو۔۔۔ اندھیرے سے مانوس کرنے کی کوشش میں جت گیا۔ کچھ دیر کے بعد میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس تو ہو گئیں لیکن مجھے واضح دکھائی نہیں دیا تھا۔

میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ جڑیں فیتہ سے میری کٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ دماغ میں مختلف سوالات گردش کرنے لگے کہ رینڈم نے مجھے کیوں بے ہوش کیا تھا؟ کیا وہ رتن کمار کا آدمی تھا؟ یا یہ کہ اسے پتا چل گیا تھا کہ میں پاکستانی ہوں اور پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے؟ اگر ایسا تھا تو پھر رینڈم غدار تھا۔ اس نے ہاروے کے ساتھ غداری کی تھی۔ اس کوٹھڑی میں بھی یقیناً اسی نے مجھے پہنچایا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کوٹھڑی اسی کوٹھی میں تھی یا رینڈم مجھے کہیں اور لے گیا تھا۔ میں اٹھا اور تاک ٹوپیے مارتا ہوا دروازہ تلاش کرنے لگا۔ دروازہ تلاش کرنے میں مجھے بہ مشکل تین منٹ ہی لگے تھے۔

میں نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے غصے سے ایک زوردار ٹھوکر دروازے پر رسید کر دی۔ میری ٹھوکر کا بھی دروازے پر کچھا اثر نہ ہوا۔

میں ایک بار پھر مشکل کا شکار ہو گیا تھا۔ اگر رینڈم مجھے رتن کمار کے ٹھکانے پر لے گیا تھا تو پھر میری موت یقینی تھی۔ رتن کمار مجھے کسی طرح بھی زندہ چھوڑنے کا روادار نہیں ہوگا۔ میری جیب میں میرا سیل فون بھی موجود نہیں تھا۔ اس صورت میں رینڈم میری جیب میں کیسے سیل فون رہنے دے سکتا تھا۔ رینڈم کے خلاف نفرت اور غصے کی ایک لہر میرے وجود میں سراپت کر گئی تھی۔ اگر مجھے ذرا سی بھی ہینک پڑ جاتی کہ رینڈم غداری پر اتر آئے گا تو میں اسے اس کے انجام تک پہنچانے میں ایک لمحوں کی بھی تاخیر نہ کرتا۔

میں نے کی بول سے جھانکا لیکن دوسری طرف گہرا اندھیرا تھا۔ اس لیے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ رات کا وقت تھا یا پھر گھر کی لائٹیں بند کی گئی تھیں۔ میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑا ہینڈل پر دوڑا تو تاریکیاں رہا تھا، جب کامیابی دہلی تو بالآخر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر فرش پر بیٹھ گیا تھا۔

خبر جرت کی بات یہ تھی کہ مجھے بائندھا نہیں کیا تھا۔ شاید رینڈم کا خیال تھا کہ میں حراست نہیں کر سکوں گا یا مجھے حراست کرنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ یہ میرا قیاس تھا اصل صورت حال تو کسی کے سامنے آنے پر ہی آشکار ہوگی کہ میں کسی کے قبضے میں تھا۔

میں انتظار کرتا رہا اور یہ انتظار طویل ثابت ہوتا چلا گیا۔ جب مجھے نیند ستانے لگی تو میں ٹھٹھے فرش پر لیٹ گیا۔ نیند فوسلی پر بھی آ جاتی ہے یہ تو پھر بھی ٹھنڈا فرش تھا۔ میں اپنی مری نیند سو گیا تھا کہ مجھے دروازہ کھلنے اور کسی کے آنے کی خبر تک نہ ہوگی۔ ہوش تو اس وقت آیا جب کسی نے میری پسلیوں میں زور سے ہری ٹھوکر ماری تھی۔ درد کی ایک شدید لہر میرے پردے وجود میں سراپت کر گئی اور میں ڈھکڑکھڑ سے بیدار ہو گیا۔ کمرے میں روشنی تھی۔ شاید بلی دھڑک رہی اس انداز میں لگا ہوا تھا کہ اس کے سامنے کمرے میں ان لوگوں کا سایہ مجھ پر پڑ رہا تھا۔ میں ان کی آنکھیں کھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان میں سے ایک نے ایک بار لہجہ بھری پسلیوں پر ہری ٹھوکر سید کر دی۔

ٹھوکر کا زور داری جس سے میرے منہ سے دلخراش آواز نکل گئی۔ میں پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر دھڑکا ہوا گیا۔ تکلیف کے باعث میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے تارے محسوس رہے تھے۔ وہ مجھے ٹھٹھے کا موقع ہی نہ دے رہے تھے۔ مجھی دوا دیوں نے مجھے منہ کے بل لٹایا اور دوسری سے میری مٹکھٹیں کھلیں۔ میں بری طرح بے ہوش ہو چکا تھا اور کسمسا کر رہ گیا۔ میں ان آدمیوں کو پہلی بار دیکھ رہا تھا لیکن ان کے چہرے دیکھ کر مجھے گہرا درد رتن کمار کے سامنے تھا۔ دونوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کیا اور چھیٹے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ پسلیوں میں ٹھوکر مارنے والا غلام خٹلاں ہمارے پیچھے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ ایک تہہ خانے میں لے جا کر مجھے بے دردی سے سر پر یوں دھکیل دیا جیسے میں انسان کی بجائے پلاسٹک کا پتلا ہوں۔ میں نے آنکھ کی کوشش کی لیکن میرے پیٹ میں پڑنے والے ایک آدمی کے کٹے ہوئے مجھے بے حال کر دیا تھا۔ اگلے ہی لمحوں دونوں نے مل کر میرے سر کو کمرے کے پائینوں سے بائندھا دیئے۔ پسلیوں میں کھٹکھٹیں آنکھوں میں اور میں بڑی مشکل سے ٹیسس عداوت کر رہا تھا۔ اوپر سے پیٹ میں پڑنے والے کٹے ہوئے کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کمرے میں پھر دونوں نے میری مٹکھٹیں کھلیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں کی طرف سے

میں نے حراست کی تھی لیکن وہ مجھے بے ہوش کر چکے تھے اس لیے حراست بھی بے کار تھی۔

”ایٹا موت کا انتظار کر۔“ جب میرے ہاتھ کسی کی پشت کی طرف کر کے باندھے چکے تو ایک آدمی طرح لے جے میں بولا۔ پھر وہ دونوں بزرگ تہہ خانے کی میز چیلوں کی طرف بڑھے۔

”میری بات سنو۔“ میں نے دونوں کو پکارا۔ ”پکھا تو چلاتے جاؤ، یہاں بہت گرمی ہے۔“

”پکھا نہیں چلا گا، گرمی برداشت کر۔“ دوسرے نے استہزاء لے لے جے میں کہا۔

”مجھ سے گرمی برداشت نہیں ہوگی۔“ میں نے چٹا کر کہا۔ ”پکھا چلاتے جاؤ۔“

لیکن وہ ان کی کرتے ہوئے سڑکوں پھاٹک کر چلے گئے اور دروازے کے زور سے بند ہونے کی آواز سے تہہ خانہ گونگ کر رہ گیا تھا۔ میں نے ان پر لٹ بٹکی اور سر اٹھا کر چھت کے چھکے کی طرف دیکھا۔ چھکے پر چالے سے لگ رہے تھے۔ جس سے پتا چلتا تھا کہ اس چھکے کو کافی عرصے سے چلایا ہی نہیں گیا یا چلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہوگی۔

میں ان دونوں سے بے چینی پر جھٹکا چلتا تھا کہ وہ کون ہیں اور میں کس کی قید میں ہوں لیکن کسی نے میری بات پر کان ہی نہیں دیا۔ شاید انہیں جرات دہلی تھی کہ میری کوئی بات نہیں سنی تاہم میں بے لے سانس کھینچ کر اپنی حالت کو درست کرنے لگا۔

سڑک چیلوں والا دروازہ بند ہو چکا تھا اس لیے باہر سے کوئی آواز مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے بازوؤں کا کس کر باندھے گئے تھے، ہاتھ کوشش کے میں خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا لیکن کوشش جاری کی تھی۔ میں تو یہی سبق پڑھا یا گیا تھا کہ آخری دم تک اپنی جدولی جنگ لڑنی چاہیے۔ قسمت کو کیا منظور ہوگی پتا نہیں ہوتا، میں بھی لڑ رہا تھا۔ مایوس وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں کسی چیز کی امید نہیں رہتی، لیکن مجھے امید تھی کہ میں نہ صرف آزاد ہو جاؤں گا بلکہ رتن کمار کو اس کے انجام تک بھی پہنچا دوں گا۔

میں سوچنے لگا کہ جب ہاروے کو میری گمشدگی کی اطلاع ملے گی تو وہ رینڈم سے میرے بارے میں ضرور دریافت کرے گا۔ اب رینڈم کیا تو مجھ کو نہیں کر رہا ہے اس کے بارے میں مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ غدار ہر گز پتہ نہ

فتح

مکرم مدیر
السلام علیکم!

ایک اور سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں، یہ سچ بیانی سبق بھری
ہے۔ اگر بزار میں سے کسی ایک نے بھی اس سچ بیانی سے راہ
پالی تو میں سمجھ لوں گا کہ میری محنت وصول ہوگئی۔

غلام قادر
(کراچی)

دوبارہ ہم نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ مگر سے جانے کے دو
ماہ بعد اس کا فون آیا کہ وہ کینیڈا میں ہے اور شوہر کے ساتھ
خوش ہے۔ اماں نے اس کے شوہر کے بارے میں معلوم کیا
تو اس نے بتایا کہ ان کا نام سردار عبدالرحیم ہے۔ اس پر اماں
نے کہا یہ وہی عبدالرحیم تو نہیں جس کا تعلق ظہیر سے ہے اور
جو بھی میرا بھی عاشق رہ چکا ہے۔ ہر بات کا جواب بہن نے
انہماک میں دیا تو اماں نے ایک خضبی آؤ بھر کر کہا۔ ”پانگل
ہی پاؤی ہوئی ہے باپ کی عمر کے بوڑھے سے دل لگا
چھٹی۔“

اس سے چھوٹی لیکن منابل نے اتر کے بعد بھرا
شروع کیا تو اماں نے اس پر کڑی نگرانی رکھی یہاں تک کہ
جب کوئی گاہک منابل کو ساتھ لے جانے کی بات کرتا تو
اماں کی جلی شرب ہوتی کہ وہ بھی ساتھ جائیں گی۔ اس
ہالے اماں نے کئی ملکوں کی سیر کر لی جس میں دہلی سے لے
کر قادیانہ، انگریزوں کی مشیل تھے لیکن تمام تر احتیاطوں
کے باوجود منابل کو وہاں لے کر آئے۔ ہوا اور کھانا تو بڑا
اچھا تھا مگر وہاں کے لوگوں نے منابل کو دیکھا تو اس کی

اسد سے نکاح نے میری زندگی بدل دی کیونکہ نکاح
سے پہلے تک میں طوائف تھی اور طوائف اس لیے تھی کہ یہ
ہمارا خاندانی پیشہ تھا۔ میری مانی اور خالائیں بھی اس پیشے
سے وابستہ تھیں۔ ان میں اور مجھ میں فرق اتنا تھا کہ ان میں
سے کوئی بھی اسکول نہیں جاتی تھیں۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں
تھیں۔ والدہ نے دونوں کو اسکول میں داخل کر دیا تھا۔
والدہ خود تو اسکول نہیں جاسکتی تھیں لیکن اپنی چالاکت کے
باوجود اس سے دور میں تعلیم کی اہمیت کو سمجھتی تھیں، ان کا
نظریہ اپنے کاروبار کے حوالے سے ہی تھا کہ بڑی لکھی
طوائف کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ دراصل امی کی نظریں
مشغول پر رہتی تھیں۔ ضیاء الحق کے دور نے ہم پر تمام
دروازے بند کر دیے تھے۔ اسی دور میں امی نے عظمیٰ سے
کام لیا اور شہر سے دور ڈھنسی میں کوٹھی لے لی اور وہاں غلیہ
کوٹھا بنایا تھا۔ مانی اور خال کو بھی ساتھ رکھا تھا۔ وہاں صرف
میں نے لوگ آئے تھے۔ بھر بھی امی لاکھوں میں کھیتی
تھیں۔ ہم سب میں بڑی لیکن ناز سے میٹرک کے بعد بھرا
کے ساتھ گیا تھا۔

ماہنامہ سکرگشت

طرائق ہم ہی اٹھائیں گے۔

مقابلے والے دن تک میری تیاری مکمل تھی۔ غصے کے علاوہ میں نے فراز کی ایک غزل کی بھی تیاری کی تھی۔ کیونکہ استاد جی کا اصرار تھا کہ مجھے غصے کے علاوہ کچھ تیار کرنا چاہیے۔ مقابلہ میں نام انگریزی کے حروف تہجی کے مطابق رکھا گیا تھا اس لیے میرا نام ذریندا آخری گروپ میں تھا۔ ہم سے پہلے مختلف اسکول کی طالبات آتی رہیں اور چار فن کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ میری سامنے لو کی آواز سے گروپ میں تھی اور اسے خود پر اس نے اپنا بہترین فن دکھایا لیکن مجھ کو کی باڈی لیکوئٹ تیار ہی تھی کہ وہ ان کو زیادہ اثر نہ کر سکی۔

مقابلہ میں بارہ طالبات شامل تھیں اور میرا انہر آفری
 سے حسن نام پہلے تھا۔ میرا نام جب اچھا سے پکارا گیا تو میں
 بچ بھئی اور اچھی نعت سے پہلے طالب لگا لی تو کوئی ہمتی ہوئی
 آج میں میدان ہو گئیں اور جب میں نے "نیکسوں پر کرم کیجیے"
 کی کیا تو تمام بچوں نے کڑے ہو کر مجھے داد دی۔ تالیوں
 کے ہال دیر تک گونجا رہا۔ ان میں سر ریڈیو پاکستان کے
 بچے بھی شامل تھے۔

جوں میں ریڈیو کے موسیقی کے پروگرام کے
 پوسر بھی شامل تھے پھر جب مقابلہ ختم ہوا تو مجھ سمیت
 کو بھیسوں چکا تھا کہ اول انعام کی حقدار میں ہی ٹھہرائی
 گی، اس کے ساتھ میں نے سوچا شروع کر دیا کہ پہلے
 م کے پانچ ہزار کہاں خرچ کروں گی مقابلہ ختم ہوئے تو
 بج کے اعلان ہوئے۔ توقع کے مطابق میں اول آئی تھی
 منہ تیسرے نمبر پر تھی۔ ہم دونوں کے فسر لائے گئے تو
 بھی ہمارے اسکول کے پاس آئی۔ ٹرائی اور انعامات
 کے ریڈیو کے پروگرام پروڈیوسر کو بلایا گیا۔ انہوں نے
 انعام اور چیک تو مجھے دیا پھر شیلڈ کے لیے دوبارہ اسکا پر
 زلاتو پروڈیوسر صاحب نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔
 "نہ موسیقی کی تعلیم حاصل کی ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلادیا پھر سوال کیا آجندہ کا کیا
اسم ہے تو میں فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکی پھر
قدح کے بعد میں نے کہا کہ ابھی تو میں ساتویں جماعت
میں ہی احوال تمام توجہ تعلیم پر ہے میرے ک کے بعد سوچوں
آجندہ کیا کروں گی۔
میں نے کہنے کو تو کہنا ہی نہیں دیا اور صاحب کے

اماں نے حسب عادت شرط رکھ دی کہ وہ بھی ساتھ جائیں گی۔ واڈو بیٹھنے نے منا ہی کے ساتھ اماں کا بھی وزیر الکوادیہ اور پھر اماں واڈو بیٹھنے اور منا ہی کے ساتھ امریکا روانہ ہو گئیں لیکن تیسرے روز اماں کا امریکا سے فون آیا کہ منا ہی ہو گئی ہے شاید کچھ کہہ کر واڈو بیٹھنے کے ساتھ کئی مہینے آٹھ مہینوں بعد اس کا فون آ گیا کہ اماں میں شکا کوکس ہوں اور اب واپس نہیں آؤں گی۔ منا ہی واپس نہ نہیں آئی لیکن بیٹے دو مہینے فون ضرور کرتی ہے اور بھی بھی اماں کے اکاؤنٹ میں ڈال رہی ڈالوا رہی ہے۔

زندگی میں دوستی کے لئے اچھا ہونا ضروری ہے۔
 ہمیں بہت سے کاموں کی ضرورت ہے۔ روایات کے مطابق انہوں نے
 میرے لئے بہت سے کاموں کا انتظام کر دیا تھا۔ میری شکل کی
 طرح آواز بھی بہت اچھی تھی۔ دھم سے زیادہ دھمکی نہیں
 تھی لیکن موسیقی کی میں جنوں کی حد تک دیوانی تھی اور استاد
 جی بھی میرے جنوں کو دیکھتے ہوئے مجھ پر پوری توجہ دیتے
 تھے۔

میں پھر مری کے بعد سیکڑی میں آئی تو ایک روز
پہل صبح نے مجھے بلایا اور کہا تمہاری کلاس میں
کرم بہت اچھا گئی جو اور اس کی سفارش پر میں
اسکول مقابلہ میں بھیج رہی ہوں۔ اسکول میں کوئی نہیں جانتا
تھا کہ میری رہائش کہاں ہے کیونکہ ماں نے ایڈریس میں چھپا
تھیں سو سارے کے بچنے کا دیا تھا۔ میں اسکول اس کارڈ میں
جاتی تھی جو ماں نے خریدی تھی۔ پھر اسکول مقابلے کی
اطلاع میں نے استاد کی کوئی تو انہوں نے مجھے دکان کی
کی دیر پہل کر دکانی شروع کر دی۔ یہ سب کچھ ماں کو اطلاع
دیے بغیر ہوا تھا یہاں تک کہ مقابلے کا دن آ گیا۔ میرے
ساتھ میٹرک کی دو لڑکی بھی ٹیم میں شامل تھی جو دو برس سے
ان مقابلوں میں شریک ہو رہی تھیں اور ایک برس پہلے مقابلے
میں تیسرا انعام جیت چکی تھی۔ پہل صبح نے میری کلاس
لیکچر زبہت کا انعام منظر کیا تھا۔ میں اجازت دی تھی کہ
تھوڑے سے کچھ پہلے اور اس کے بعد وہ بعد میں کر سکتی
تھی۔

اور اسکول کا یہ مقابلہ میڈیا اور اعلیٰ کے حوالے سے ہو گا۔ قائد ریاض کے پہلے ہی روز میڈم خیرت نے کہا۔ ”میں اس مقابلہ کی جگہ تو نہیں ہوں لیکن اگرچہ ہوتی تو جیسا غلام تمہارے نام ہی رکھتی۔“ انہوں نے اعلیٰ بات کا

جہاں کا اظہار بھی کر دیا۔ یعنی تم یہ کہہ رہی ہو کہ میں ہرگز
نہی کرنا آواز کو دبا کر رکھوں گی اور اللہ کی مخلوق کو اس سے
بے غور نہ رکھوں۔ مگر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے انہوں
نے فرمایا: ”میرے بھائی! آواز اللہ کا ایک عطیہ خاص ہے
اس لیے اس کی بجائے جہاں اسے پہنایا جا چاہے بالکل دے
دیا جائے۔ بھول کی خوشبودار مہربان پیدا کرتا ہے
میں خوشبودار نہیں سکتا اپنی خوشبودار اللہ کی مخلوق

میں نے کہا: "آپ شاید سمجھ کر رہے ہوں لیکن میرا دل اس کی طرف کھینچا گیا ہے۔"

[illegible]

ہر اسکول ہوگا۔" میں نے گل کہا۔ "میں نے گل کہا۔" میں نے گل کہا۔

کہا: "زندہ تیری تو لاشی شکل آئی۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ فرود جہاز بات کرے گا۔" انہوں نے کہا تو میں نے سوال کیا:

"آگ کو اُمید کیوں تھی۔"

انہوں نے کہا: ”جب تم نے نعت شریوں کی تو اس
کا اعلیٰ اضافہ کو دور یکارڈ ٹرنر کے لیے کہا تھا اور اس
کا ہاتھ آئے ہوئے لوگوں نے دور یکارڈ کر لی تھی۔“ اس
مذاہبہ سے سوچے ہم اسکول آئے لڑائی پر فیصلہ صاحبہ کے
خاموشی کی تھی انہوں نے اپنے دفتر میں نمایاں جگہ پر
آؤں کر دوائی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے ہزار کا
نورسٹون کی طرح لکھی اور صرفی

جنہیں میں سمجھتی تھی مگر جب انہوں نے یونان شروع کیا تو میری سمجھ میں آگیا کہ ان کے ذہن میں کیا ہے۔
 ”تو تم بھی بڑی بہنوں کے راستے پر چلے گا رادو کے ہوئے ہو۔“ انہوں نے کہا۔ ابھی دوسرے چکر لگنا تھا جتنی کہ کافی کمرے میں داخل ہوئیں، اماں نے انہیں تمام بات بتا دی۔

”اس میں رنجیدہ ہونے والی کیا بات ہے، یہ تو خوشی کی بات ہے، خوش ہو کر ہماری بچی کے موسیقی کا مقابلہ جیتا ہے اس کا مطلب ہے کہ مشہور ہو رہی ہے۔ مشہور لوگوں کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔“ اور اس کے ساتھ ہی دانی نے ملازم کو بلا کر پیسے دیئے اور اس سے کہا۔ ”مٹھائی لاؤ ہماری بیٹی نے مقابلہ جیتا ہے۔“ اس کے بعد استاد بھی آ گئے اور دانی نے مٹھائی کی آغا ز ان سے ہی کیا تھا اور ساتھ کہا۔ ”استاد جی یہ سب آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔“

”میرا کہیں یہ سب ذرینہ کی لکڑی اور محنت کا نتیجہ ہے۔“ استاد جی نے کہا تو اماں کا موڑ خراب ہو گیا اور وہ بڑھیں:

”میں نے اس کے لیے نہ جانے کیا کیا خواب دیکھے تھے مگر یہ تو کسی اور ہی راست پر چل چکی ہے۔“

ہالی نے کہا۔ "تو نے مجھ سے پہلے انہیں شہر لے کر دیں۔ ابھی یہ بچی ہے چھوڑ دو اس کی عمر ہے ابھی سے تو کیا اس سے مجھ کو کرائے گی۔"

اماں نے کہا۔ "طوائف کی بیٹی طوائف نہیں بنے گی تو کیا بنے گی۔"

”کچھ روز صبر کر لے جب یہ اس عمر کو پہنچے گی تو خود ہی مجرا کرنے لگے گی اس وقت کی ایک جھک کے ہزاروں دیوانے ہوں گے۔“ ثانی نے دلاسا دیا۔

میرا دل چاہا کہ میں اس وقت کہ دوں میں طواف
زاوی ضرور ہوں لیکن طواف کسی صورت میں بخیر کی گین
میں نے کچھ بھی کہنے سے احتراز کیا۔ اگلے روز اسکو لے کر
وہاں کا ماحول بالکل تبدیل تھا۔ یہ خبر پورے اسکول کو مل چکی
تھی کہ میں نے فرانی جیتی ہے۔ مجاہد زہت نے مجھ سے
رحمہ "تمہارے گھر والے تو خوش ہوں گے۔"

میں نے جواب دیا: "خوش کیوں نہ ہوئے سلطان! یہ آپ کی بات ہے اور پورے مغلے میں تسلیم ہوئی۔"

"دو روپے پر پروڈیوسر کا فون آیا تھا پھر چھ رہا تھا کہ درمیان کب تک آئے گی روپے پر۔"

میرے کچھ کہنے سے قس میڈم نے کہا۔

"آپ اس سے کہہ دیں کہ ایک بچے اسکول کی چھٹی ہوگی اس کے بعد ہی ہم آگئے ہیں۔"

"سکول بچے کو بلا رہا ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ سکول سے کہہ دیں کہ ابھی رک جا جب بچہ اس سے کہہ دے تو آئیں گے۔"

پرنسپل صاحبہ نے ہراس میں کہا تو میڈم نے بہت کے پاس کوئی جواب نہیں تھا پرنسپل صاحبہ نے سکھانہ لکھے میں کہا۔ "میں فون کر رہی ہوں کہ درمیان اور اس کی کلاس ٹیچر آدھے گھنٹے میں نکلتی ہیں۔"

پرنسپل صاحبہ کا حکم تھا اس لیے میں اور میڈم نے بہت خاموش رہے تھے اس کے فوراً بعد پرنسپل صاحبہ نے اپنے ڈرائیور کو بلوایا اور اس سے کہا ان کے ساتھ جاؤ اور جب یہ واپس آنا چاہیں انہیں واپس لے آنا۔ ہم روپے پر اسٹیشن پہنچے تو پروڈیوسر صاحبہ اور ان کی ٹیم ہماری منتظر تھی۔ استقبال پر ہماری آمد کی اطلاع تھی۔ ہم پروڈیوسر صاحبہ کے کمرے میں آئے جہاں چائے اور ناشتا کا انتظام تھا۔ میں نے چائے پر اکتفا کیا کیونکہ گھر سے میں برائے اور آگیا تھا۔ ناشتا کر کے آئی تھی اور مجھے بوک بالکل بھی نہیں تھی۔ ابھی میری چائے ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ پروڈیوسر صاحبہ کا ایک اسٹنٹ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اطلاع دی کہ اسٹوڈیو ریکارڈنگ کے لیے تیار ہے۔ ہم ان کے کمرے سے نکلے اور پروڈیوسر صاحبہ کی رہنمائی میں اسٹوڈیو کی طرف بڑھے تو میں نے بیڑ میں پر سوال کیا۔ "کس چیز کی ریکارڈنگ کرنی ہے۔"

پروڈیوسر صاحبہ نے کہا۔ "اس نعت کی جو تم نے مقابلہ میں گائی تھی۔"

اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہم سے ایک قدم پیچھے میڈم نے بہت تھیں انہوں نے بھی پروڈیوسر صاحبہ کا جواب سنا تھا اور انہوں نے سوال کیا۔ "اس روز مقابلہ کے دوران بھی تو آپ نے ریکارڈنگ کی تھی۔"

اس پر پروڈیوسر صاحبہ نے کہا۔ "دو ریکارڈنگ معیار کے مطابق نہیں گئی اس لیے ہم دوبارہ سے ریکارڈنگ کر رہے ہیں۔" تو میڈم نے بہت مطمئن ہو گئیں مگر پروڈیوسر صاحبہ نے انہیں مزید مطمئن کرنے والے اعزاز میں کہا۔

ریکارڈنگ ہو جانے دیں پھر میں آپ کو دونوں ریکارڈنگ سٹوڈیو کا فرق آپ کو خود نظر آجائے گا۔ میں چلتی دیکھ کر کل عید میلاد النبی کے پروگرام نہ ہوتے۔ ہم کل اس نعت کو بقیہ پروگراموں میں شکر کر دیں گے۔"

ہم اسٹوڈیو میں داخل ہوئے تو وہاں ہر شخص مستغرق آیا۔ پروڈیوسر صاحبہ کی ٹیم میں ایک خاتون بھی تھیں انہوں نے مجھے مانگ کے سامنے کھڑا کیا اور بتایا کہ مانگ سے مجھے اکتفا صلہ رکھنا ہے پھر انہوں نے بیڑ فون دیکھ کر میں وہ ممکن لوں۔ ساتھ میں انہوں نے مجھے بتایا کہ شیشہ کے پیچھے ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ایسا ہی تھا جو میں فلموں میں دیکھ چکی تھی۔ مجھے کیوں تو میں نے نعت شروع کی۔ الاپ شروع ہی کیا تھا کہ خاتون نے شیشے کے پیچھے سے انگوٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے داد دینی اور میں نعت پڑھتی چلی گئی۔ نعت ختم ہوئی تو پروڈیوسر صاحبہ کی پوری ٹیم نے تالیاں بجا کر داد دی۔ تالیاں بجانے والوں میں میری میڈم بھی شامل تھیں۔

ہم اسٹوڈیو سے ایک بار پھر پروڈیوسر صاحبہ کے کمرے میں آئے تو پروڈیوسر صاحبہ نے اپنے وعدہ کے مطابق دونوں ریکارڈنگ سٹا میں واقعی ہال کی ریکارڈنگ میں شور تھا جبکہ اسٹوڈیو کی ریکارڈنگ بہت واضح تھی۔ پروڈیوسر صاحبہ کے کمرے میں دوبارہ سے چائے اور ناشتا موجود تھا۔

"اب کوئی اور کام نہیں تو ہمیں اجازت ہے۔" میڈم نے بہت نے سوال کیا تو پروڈیوسر صاحبہ کی ٹیم کی خاتون نے کہا۔

"فی الحال تو نہیں لیکن ہم کل شام ایک بجے پروگرام کے بارے میں ڈسکس کر رہے تھے جس کا عنوان ہوگا "غزل اس نے چھیڑی" اس سلسلے میں شاید ہم زمین کو تکلیف دیں۔"

اس پر میں نے سوال کیا۔ "اس میں صرف غزلیں ہوں گی یا اور بھی کچھ ہوگا۔"

خاتون نے کہا۔ "بنیادی طور پر تو یہ غزلوں کا پروگرام ہے لیکن اس میں اور بھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

اس پر میڈم نے سوال کیا۔ "پروگرام ہفت روزہ ہوگا۔"

پروڈیوسر صاحبہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا۔ "اور اس کے علاوہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

مقرر کی ہے۔"

میڈم نے بہت نے سوال کیا۔ "معاوضہ کیا ہوگا؟"

یہ وہ سوال تھا جو میں کرنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن اب یہ سوال ہو چکا تھا تو میں جواب کی منتظر تھی۔ اس پر اب صاحبہ نے کہا۔ "اس کا انحصار ان کی اس نعت کی مالیت پر ہے میں نے تو اسے کلاس کے لیے سفارش کی ہے غزل پر ہے لیکن منبر نے دینی ہے۔ میں نے کل اس جس کی منظوری اسٹیشن منبر نے دینی ہے۔ میں نے کل اس لیے میں بات کی تھی اس پر انہوں نے کہا تھا کہ اتنی چھوٹی مالیت میں اس آرتھ کا درجہ دینا مشکل ہے لیکن جو ہمیں اس نعت کے شکر ہونے پر ہے وہی اہم ہوگا۔"

پاس اس نعت کے شکر ہونے پر ہے وہی اہم ہوگا۔"

اسٹنٹ منبر صاحبہ نے ویس دی تھی۔ "اس آرتھ کی واپس بلکہ اس کی اہلیت دیکھنا ضروری ہے۔" اس کے جواب میں اسٹیشن منبر صاحبہ نے کہا۔ "نعت ختم ہو جانے والی کا جو پاس آئے گا اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔"

اور میں اپنی جگہ مطمئن ہوئی لیکن میڈم کے سوال پر میں نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے چلتے چلتے ایک سوال پوچھا۔ "پاس کو کچھ کے لیے آپ کے معیار کیا ہے؟"

پروڈیوسر مسکرا دیے تھے ایک لمحہ سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔ "بہت سے ہیں ان میں سے ایک ٹیلی فون ہے جس کی زیادہ کالیں پسندیدی کی آئیں گی اس حساب سے ہر گز کریں گے۔"

ہم وہاں سے نکل کر دوبارہ پرنسپل صاحبہ کی کار میں بیٹھے پروڈیوسر صاحبہ کی خاتون اسٹنٹ ہمارے ساتھ تھیں۔ انہوں نے مجھے سے ایک پرچی سب کی آنکھ بچا کر مجھے تھامی تھی فوری طور پر میں نے بنوہ میں دکھ لیا۔ ہم اسکول کی پہلی ہوئے سے پہلے اسکول واپس آگئے تو پرنسپل صاحبہ نے فوری طور پر مجھے اور میڈم کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا وہاں کچھ کر میڈم نے سوال کیا۔ "اس پرچی میں کیا ہے۔"

جس پر میں نے جواب دیا۔ "میں نے ابھی دیکھی تھی۔" ویسے میں سمجھ رہی تھی کہ اس خاتون نے منب سے چہا کچھ دہرائی تھی۔

"میں نے اسے چھپیں پرچی دیتے ہوئے بیک ویو دیکھا کہ لڑکا۔"

میں نے انہوں نے پرنسپل صاحبہ کو ہادی پر دیا۔

صاحبہ نے پرچی پڑھی اور کہا۔ "اس میں تو صرف فون نمبر ہیں اور ان نمبروں کے ساتھ اسٹیشن منبر اور وہاں نمبر کے آگے پروگرام پروڈیوسر تحریر ہے۔"

اس پر میڈم نے بہت نے پوری تھیں ہادی۔

"اس طرح تو یہ پرچی بہت کام کی ہے ابھی تو چھٹی ہونے والی ہے اور کل اسکول کی پہلی ہے لیکن ابھی ہمارے پاس اتنا وقت ہے کہ میں تمام پتھر کو یہ نمبر دے دیتی ہوں کہ کال کریں پھر انہوں نے پتھر کو طلب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ یہ نمبر نوٹ کر لیں اور کل رات نو بجے کے بعد ان نمبروں پر فون کر کے زمین کی تعریف کرنی ہے کیونکہ زمین ابھی روپے سے وہی نعت ریکارڈ کر رہی ہے جس پر اس نے پہلا انعام اور پہلا شیلڈ جیتی تھی۔"

پرنسپل صاحبہ نے پتھر کو ہدایت دی تو میڈم نے بہت نے قہر دیا۔ "کل رات روپے پر عید میلاد النبی کے خصوصی پروگرام میں جو آٹھ بجے شروع ہوگا وہ نعت شکر ہوگی۔ یاد رکھیں پروگرام ختم ہونے کے بعد ہی فون کرنا ہے اور اگر ہو سکے تو اپنے رشتہ داروں اور جاننے والوں سے بھی شیئر کر لیں اور ان سے بھی نو بجے کے بعد فون کرنے کی درخواست کر دیں۔"

اسکول سے میں سیدھے گھر پہنچی مگر ماں نہیں تھیں اس لیے میں سیدھی ٹیلی کے پاس گئی۔ وہاں انہیں ریکارڈنگ کی پوری تھیں تھیں تھیں یہ بھی بتایا کہ وہ نعت عید میلاد النبی کی خصوصی شراکت میں آن لائن ہوگی ساتھ ہی ان فون نمبروں کے بارے میں بھی بتا دیا کہ یہ بھی کہ پرنسپل صاحبہ نے تمام پتھر کو نو بجے کے بعد فون کرنے کے لیے کہا ہے۔

مائی نے مجھے گلے سے لگایا اور ساتھ ہی کہا۔ "میں بھی آج بازار میں اپنے تمام جاننے والوں کو یہ نمبر دے دوں گی اور ان سے کہوں گی کہ یاد سے ان نمبروں پر کل رات فون کریں۔"

میں خوشی خوشی اپنے کمرے میں آگئی۔ مجھے کمرے میں آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مائی آگئیں اور آتے ہی انہوں نے سوال کیا۔ "تم اسکول کا ریکارڈنگ کے لیے چلی جاتی ہو۔" اسی نے سنا جب میں کہا تو میں نے ہنس رہی تھی۔

"ماں آؤ آپ کو میری گورنری سے اتنی عزت کیوں ہے۔"

دو جیسی "غزل اس نے جیڑی" میں تھی۔ اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہو گا جس کے لیے ہمیں آج سے ہی تہاری تیاری شروع کر دینا چاہیے۔ بلکہ فیض صاحب کی غزل سے شروع کر دینا چاہیے۔

میرے پاس تھیں۔ انہوں نے کہا: ”میں نے کون سی غزل“
 انہوں نے کہا: ”میں صاحب کی وہ مشہور غزل جو
 نور جہاں نے گائی ہے۔“ پھر ہم نے ریاض شروع کر دیا۔
 اگلے روز میں نے نوید پر اسکول جانے سے پہلے فون
 کیا۔ ایڈورڈ نے مجھ کو کہنے جانے کی بات کی لیکن اپنا مسئلہ بھی
 بتا دیا تو نوید نے کہا اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ میں تمہیں
 اسکول سے یکے کرکتی ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا
 اور اسے بتا دیا کہ اسکول میں انٹرویو کس وقت ہوتا ہے۔

ڈاؤن نے کہا کہ میں تمہارے جتنے جوتے وقت
 تمہارے اسکول پہنچ جاؤں گی۔ اس پر میں نے درخواست
 کی آپ بھی اس ملاقات میں شریک رہیں گی تو نادیہ بولی۔
 ”یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں نہ صرف اس
 ملاقات میں شریک رہوں گی بلکہ اس کا معاوضہ طے کروانے
 میں تمہاری معاون کا کردار ادا کروں گی کیونکہ اس کا تجربہ۔
 جھبہ نہیں ہے جبکہ میں اس کا بہت تجربہ شدہ ہوں۔“
 اسکول جا کر میں نے پرنسپل صاحبہ سے آدھے دن کی
 مجلس کی درخواست دی اور انہیں سچہ بھی بتا دی۔ انظرول میں
 ابھی کچھ منٹ باقی تھے کہ پرنسپل صاحبہ کے دفتر سے پیغام آیا
 کہ ڈاؤن نے ان کے دفتر میں موجود ہے۔ انظرول ہوا تو میں اپنا
 کلاس بچے کے ساتھ پرنسپل صاحبہ کے دفتر پہنچی۔

مجھے دیکھتے ہی جاوے گئے کہا۔ "میں پریشی سلاہہ کو بتا رہی تھی کہ رزرو پندرہ یو پاکستان کی اسے کلاس آرٹس ہوئی ہیں کیونکہ ان کے لیے اسے خون آنے کو دور یاد ہو گیا۔ میڈم زہرت نے التھو دیا۔" یہ سب آپ کی ممبرانی تھی۔ "اور تادیہ مگرانی تھی۔"

"پانچ برس سے میں ریلوے کی ملازمت میں ہوں اور اب اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ آواز سننے ہی چٹکان لگوں تو اس آواز میں جانتا ہوں۔ ڈرینڈ کو قلابہ میں سننے ہی میں نے چٹکان لگا دیا کہ اس میں جان ہے اور مجھے اس پندرہ روپے کے بچے سے اس لیے میں سختی ہوں کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔"

پہلی کی اجازت کے بعد میں نادر کے ساتھ باہر

تو تمہاری ہے لیکن کوشش کرنا کہ زیادہ مفلحانہ کرنا مجھے
 زیادہ بولنے دینا خاص طور پر جب معاوضہ کی بات ہو۔
 ہادی نے کہا۔

”وہابی مجھے تو اس کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔“
 ”یہ مسکرا دی اور کہنا شروع کیا۔“ میں چھپیں فیروز
 صاحب کا تعارف کروا دوں۔“ یہ کہنے کے بعد اس نے مختصر
 میں وفد دیا اور مختصر وقفہ کے بعد ڈانینے دوبارہ کہنا شروع
 کیا۔“ فیروز صاحب کو موسیقی کی بہت زیادہ سمجھ ہے، اس
 اشتہاری کئی میں جاہ سے پہلے وہ ریڈیو میں ہی ہوتے
 تھے بلکہ موسیقی کے پروگرام کے پروڈیوسر تھے۔ میری جاہ
 کا ابتدائی ایک سال ان کے ساتھ ہی گزارا تھا بلکہ میں نے
 ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔“

ہماری گفتگو اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ اس ایئر ہارنگ کے دفتر پہنچ گئے۔ راستے سے ہادی نے فون کر کے بتایا کہ ہم کچھ دیر میں آپ کے دفتر میں پہنچ رہے ہیں اور میں بھیجے گی کہ ہادی نے کسے فون کیا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو فیروز صاحب دفتر کے باہر موجود تھے۔ میں نے انہیں دیکھا لیکن پہچان نہ سکی اس وقت تک جب ہادی... کار پارک کر کے آئی اور اس فیروز کہہ کر کھانسی کیا۔ دفتر کا اظہار ہو رہا تھا اور ہم فیروز صاحب کی قیادت میں آگے بڑھنے لگے۔

ہم آگے بڑھ رہے تھے کہ میں نے فیروز صاحب کی آواز سنی وہ کہہ رہے تھے: "ناہی۔ یہ بچی تو میرے تصور سے بھی کم عمر ہے۔" میں خاموشی سے چپٹی رہی۔

فیروز صاحب کا دفتر کوڑو کے بالکل سامنے تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ داخل ہوتے وقت برابر والے کمرے پر ایک ڈی کی تختی لگی ہوئی دیکھ لی تھی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں اور ڈیوہی ان کے سامنے بیٹھے۔ ”یہ دو اشتہار ہیں جن کے لیے میں نے بلایا ہے۔ کہا تھا کہ آپ کو تکلیف دی جائے۔“ فیروز صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا لیکن ان کے گلے کی خیر نہ تھی مجھے چٹکا رہا تھا۔ ”ایک اشتہار تو ڈیوہی جن کو ڈر کا ہے اور دوسرا ایک مشہور سافٹ ورک کا ہے۔ وہ جو کیزوں کی دھلائی کا اشتہار ہے وہ ایک نیا ڈر کا ہے جو اس وقت پاکستان میں لاچ نہیں ہوا ہے لیکن اسے ایک ٹی بیسٹ کنفی لایچ کر کے اس کے لیے ہمیں اُمید ہے کہ وہ ڈر

کامیاب ہو گا۔ جہاں تک سٹافٹ ڈرک کی بات ہے وہ

پہلے ہی میں نے یہ سچا ہوا کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو
 ایک پاکستانی مارکیٹ میں ایک مقام
 اور دوسرے کے ساتھ ہی انہوں نے
 کا ایک باری شاہ کو ملا اور ان سے کہنا
 کہ اس کے لئے آپیں مگر باری شاہ گئے
 کہ یہاں پر وہ کہیں کہ یہاں دفتر میں دفتری
 کیوں نہ ہم سامنے کے صوفوں پر
 اس کے ساتھ انہوں
 اس کے سامنے رکھے صوفوں پر
 وہاں موجود نوٹس پر بیٹھ
 کہ وہاں کیوں
 کہ وہاں کے صوفے پر آجاء۔ "انہوں
 کی جانب اشارہ کیا اور
 اب میرے اور ٹائیپ کے
 بات چیت کر لی۔

وہاں ایک صاحب کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب جو کچھ ہوگا اس کا مجھے
 اس کا مطلب یہ ہوگا۔ میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی
 ایک فی سائیکل پر چڑھی ہوئی ڈر چیم نے کسی شہرہ بریں کی
 برسنڈ میں ایک عمارت میں کئی اب تم پر یو پاکستان کی
 لڑکیاں آؤں اور وہاں ہمیں اب ساروں کی مدد نہیں یعنی
 ان کاں اور اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کچھ میں ایک
 اور اس کے ساتھ ہی میں نے انتظار شروع کر دیا کہ
 ایک اور صاحب کہاں سے گفتگو کا آغاز کریں گے میں اسی
 کے بعد وہ ایک بر دیک ہوئی اور ایک صاحب فیروز
 صاحب کے "آج" کہنے کے بعد داخل ہوئے۔ ان کی
 گفتگو کے ہاں مفید تھے۔ اور پھر کا ہونے کے باوجود
 وہاں سے بہت جلد ہی ان کی توڑ ہو گئی تھی پہلی ہی نظر
 سے لے کر اسی شخص نظر آئے تھے جن پر ہاتھ دیا جاسکتا تھا
 انہوں نے داخل ہونے کے بعد ایک طائرانہ نظر ہم پر ڈالی
 اور اس صاحب نے ہمارا تعارف شروع کر دیا۔ "نادیہ کو تو
 بہت جانتے ہیں لڑکیاں روم ہے جس کی تقریریں کرتے
 مطلب کا زبان میں ملتی ہے۔"

فیروز صاحب نے میرا تحارف کر دیا تو میں نے
 لکھا "ادب" کہہ کر اپنی جانب متوجہ کیا اس پر ان

”میرا نام عبدالجبار جعفری ہے لیکن دوست مجھے باری شاد کہہ کر بلاتے ہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں نے آپ کی وہ نعمت کی تحسین جو میرا ملا دینا پھر ہوئی تھی اسے سن کر میں نے فیروز صاحب سے آپ کی سزا دینا کی اور میں نے ناری سے بھی اس سلسلہ میں بات کی تھی۔ ناری نے ہی بتایا تھا کہ اب تم ریلوے کی اسے کھانسی آبلٹ کی خدمت میں آگئے ہو۔“

سنائیں جو آپ ریکارڈ کر سکتے ہیں اور جس کے لیے ہمیں ان کی آواز کی ضرورت ہے۔

”مس۔۔۔ ان کی نعمت کن کر کے کیا تھا کہ انہیں موسیقی سے بنیادی رموز سے اچھی طرح آگاہی ہے اس لیے انہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی اس غرض کو سمجھنے کے لیے۔ بلکہ میں کہوں تو کوئی بھی دن نکال کر آجائو تم اسے سمجھنے میں دونوں کام سر کیا کر رہے گے۔“ باری شام نے کہا۔

نادیہ نے گفتگو میں جھکی بار حصہ لیا، اس نے کہا: "یہ تو بعد کی باتیں ہیں کہ کس روز ریکارڈنگ کے لیے آتا ہے اور کتنی دیر میں ریکارڈنگ ہو جائے گی۔"

تھا اور کہا۔ ”تم کیا چاہتی ہو پہلے کس موضوع پر بات ہونی چاہیے۔“

تاویہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور کہا۔ "سب سے پہلے اس پر ہات کرنا چاہیے مگر کہہ دینے کہ روز فارغ ہوں گی کیوں کہ آج بھی میں انہیں اسکول سے انٹرول میں ملانی ہوں اور اس پر بھی کہ اسے آپ معاف نہ کیا دیں گے کہ کمرشل کے لیے اور یہ بھی بتا دیں کہ وہ لوگوں کمرشل ایک ہی روز دیکھا رہے ہوں گے یا انکے الگ الگ دن آنا ہوگا۔ پھر یہ بھی زمین میں رکھنا ہوگا کہ ریڈیو پاکستان کا ہفتہ وار پروگرام بھی یہ کمرش کی جس کا عنوان ہوگا۔ "غزل اس نے چمپڑائی۔" اور جس کی پروڈیوسر میں ہوں۔"

نارپ کی بات سے احوال میں عجیبہ کی چھا گئی جس کے فوری بعد فیروز صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے ایک کمرش کے لیے تو نارپ کو دوبارہ سے پونے کا موقع مل گیا۔ "اس سے معلوم کرنے کی بجائے آپ بتائیں کہ آپ کا بجٹ کیا ہے؟"

فیروز صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "آپ

میں نے کہا۔ ”آپ آئے ہیں تو میں چل رہی ہوں
تو مجھے پسند نہیں ہے البتہ چائے پی لوں گی۔“ اور میں
دوٹ والے کے ساتھ وہاں چلی پڑی۔ اس کے دفتر
کا کراس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر چوبیس اور
صاحب پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ایم ڈی صاحب
نے پی پی پی کے وزیر کو مخاطب کیا۔ ”آپ اسے سنکر نہیں
رہا تو احساس ہونا چاہیے کہ فکرا کتنا حساس ہوتا

”ابھی تو سو پارہ بجے ہیں وقت سے پہلے آپ
بچے جا رہے ہیں۔“

اسی وقت باری شاہ کمرے میں داخل ہوا اس کے
ایک لڑائی والا بھتی تھا۔ لڑائی میں مختلف کھانے کی
چٹائی ہوئی تھیں میں نے اور تادیہ نے چاٹ کی جانب
مائل تو فریور صاحب نے کہا۔ ”خاتون کتنی بھی بڑی
جائے اس سے چاٹ محفوظ نہیں رہ سکتی۔“

میں نے اس کے بعد چاٹ کے بعد جانے پر

انسانی نفسیات کی پیچیدگی
سے اپنے قلم کی نوک سے

گیور کونایت مہارت
لجھانے والی قلم کار

قارئین کے لیے خوش خبری

مشہور و معروف، سینئر مصنفہ کے قلم کا شاہکار قسط وار ناول
جلد ہی پاکیزہ کے صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو نہایت مہارت
سے اپنے قلم کی نوک سے سلجھانے والی قلم کار

کی ایک اور
شہکار تحریر

سیراج

اُن کو جوان نسل کے وہ ذہنی مسائل جو شاید ابھی تک زیر بحث نہیں لائے گئے

سیراج

مگر پہنچے تو حسب توقع جانی بھی مگر ہمیں میں نے
جاتے ہی جانی کو لپٹا یا اور چپک اٹھیں دینے کے ساتھ پوری
تفصیل سنائی۔

”میں بڑا کا چپک دیکھ کر اماں کی نفرت میں کی تو
آجائے گی“ میں نے کہا تو جانی نے مجھے منع کیا۔
”میلے ہم تمہارا اکاؤنٹ کھولائیں گے پھر یہ چپک
اس میں جمع کروا کر تمہاری ماں کو اطلاع دیں گے اس وقت
تک تمہاری ماں یہ سمجھ جائے گی کہ تمہاری قیادت میں
”مگر جانی بغیر شافی کارڈ کے اکاؤنٹ کسے کھل سکتا
ہے۔“

جانی نے بھی پھر کہا۔ ”لوڑی ہم پاکستان میں رہتے ہیں
یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے براؤننگ کا منیجر میرا جانا والا ہے
بلکہ مرید سے کیونکہ اس میں نے بہت سے اکاؤنٹ دیے
ہیں بلکہ یوں کہو کہ بازار کے تمام اکاؤنٹ اسی کی براؤننگ میں
ہیں اور وہ مجھے جانتا ہے۔ میں نے تو ایسے اکاؤنٹ بھی
کھولائے ہیں کہ کوئی شخص ملک میں نہیں ہے پھر بھی ان کے
اکاؤنٹ کھل گئے۔ جبکہ قانونی طور پر اکاؤنٹ کھولانے
والے کا ایک منبر کے سامنے موجودگی ضروری ہے۔“

میں نے کہا۔ ”وہ میرے اکاؤنٹ کو بھی ایک اور
طوائف کا اکاؤنٹ نہ سمجھے گا۔“
جانی مسکرا دیں۔ ”تو اس کی فکر نہ کر۔“
”دیکھ لیں جانی میں اس مرامت دیجیے گا۔“
میں نے کہا تو جانی مسکرا دیں۔ ”اپنی جانی پر اعتماد نہیں
ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ پر تو میں اپنی ذات سے زیادہ
اعتماد کرتی ہوں۔“
اس کے بعد جانی نے مجھے اطمینان دلانے والے
اعزاز میں کہا۔ ”جہاں تک تمہاری ماں کا مسئلہ ہے وہ اللہ
نے چاہا تو اگلے ماہ تک ختم ہو جائے گا۔“

اس پر میں نے کہا۔ ”اگلے ماہ تک کیا ہو جائے گا۔“
جانی نے کہا۔ ”تمہاری ماں سب کچھ بھول جائے
گی۔“

”میں آپ کے تجربے کو چننے نہیں کر رہی لیکن یہ میری
سمجھ سے باہر ہے کہ اگلے ماہ تک اماں کس طرح سب کچھ
بھول جائیں گی۔“

جانی نے کہا۔ ”کہہ رہی ہوں کہ تجربے کو چننے نہیں کر رہی
میں نے تمہاری بات کو سمجھا دیا۔“

کہ تمہاری گزراں نے دو دن سے مجھ سے ملنے شروع
کر دیا۔ اگلے چند روزوں کو کوئی اسے پسند کر سکتا اور پھر
تمہاری خالہ اپنی بیٹی کی تھوڑی سی رقم ادا کر کے اسے
اور تمہاری ماں کے سر سے اولاد کی فرمائندہ داری کا بھوت اتر
جائے گا اور یہی وہ موقع ہوگا کہ میں اسے تمہاری جانب
کروں گی مگر تمہیں بھی ایک کام کرنا ہوگا اسے استاد جی سے
اپنی غفلتوں کا انتخاب کرنا ہوگا جس کے بعد تمہاری قیادت میں
کی آنکھوں میں بڑھ جائے گی۔“

سہ پہر میں استاد جی آئے تو انہوں نے فیض کی غزل
کا ریاض شروع کر دیا تو میں نے جانی کا حکم ان تک پہنچا
دیا۔ ”یہ تو بہت بہتر بات ہے میرے پاس غزلوں کی کیسٹ
ہیں انہیں آج رات میں سن کر ان میں سے کچھ بہتر غزلیں
نکال لوں گا اور کل سے ہم اس پر بھی کام کریں گے۔“ استاد
جی نے کہا۔

مگر ہوائے کہ اسکلوں سے خیر آگئی کہ آٹھویں کے امتحان
اگلے ماہ کی ابتداء میں ہوں گے۔ میں نے جانی کو ان کے
تیار کیا کہ تمہیں اپنا پروگرام ہفتہ بھر بلکہ شاید دو ہفتہ ملو کر
ہوگا۔

وہ ناراض تو ہوئی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح حجاب
لیا جس میں سب سے شر پر فقر یہ تھا کہ میں ہر برس کلاس میں
فرسٹ پوزیشن لیتی ہوں اس بار ایسا نہیں ہوا تو میری تعلیم
یہ ختم کر دے دی جائے گی۔

سام سنگ کا فون اب میرے پاس تھا۔ میں نے
ضروری کام اس پر کیے اور پہلے امریکا والی سکن کو جواب سزا
داؤد کی رابطہ کیا وہ میری آواز سن کر بہت خوش ہوئی اور کہا۔
”شکر ہے میرے میک سے کسی نے تو رابطہ کیا۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری کینیڈا بات ہوئی ہے؟“
جواب ملا کہ بات کرنے کی بات کرنی ہوئی تو وہ بار
کینیڈا ہو آئی ہوں بلکہ وہ بھی یہاں آئی تھی ابھی دو دن پہلے
ہی یہاں سے گئی ہے۔ اس کے بعد میں نے اسکول کے
مقابلہ سے استہدائی لکھوں کے بارے میں بھی بتایا اور یہ بھی
بتایا کہ جینہ کو خالہ نے مجھ سے میں ہشانا شروع کر دیا ہے۔

دوسری جانب قہقہہ لگا گیا۔ پھر کہا کہ خالہ اپنا وقت ضائع
کر رہی ہیں لیکن اس کو کو پسند کرے گا اور اگر پسند کر بھی لیا
تو چھ بڑا سے زیادہ خالہ کو پسند نہیں گئے بلکہ تم ایک کام کرو
جینہ کو یہ خبر دے دو کہ میں اس کو پسند کر رہی ہوں کہ وہ اس کا
کچھ نہ کرے۔“

جانی۔ ”امیر ایسا ہو جائے تو میرے سر سے ایک بہت بڑا
مذاب حق ہو سکتا ہے۔“ اس کے بعد ہماری گفتگو ختم ہوئی۔
مذاب میں خالہ کے پرانے گھر اس وقت گئی جبکہ خالہ گھر
اگلے روز میں خالہ کے سر سے اولاد کی فرمائندہ داری کا بھوت اتر
جائے گا اور یہی وہ موقع ہوگا کہ میں اسے تمہاری جانب
کروں گی مگر تمہیں بھی ایک کام کرنا ہوگا اسے استاد جی سے
اپنی غفلتوں کا انتخاب کرنا ہوگا جس کے بعد تمہاری قیادت میں
کی آنکھوں میں بڑھ جائے گی۔“

اس پر میں نے کہا ہماری سوچ میں غرق ضرور ہے
لیکن ہم گزراں تو ہیں اور ویسے بھی کئی ماہ ہو گئے تھے تم لوگوں
سے کس شب کیے ہوئے تو آج میں نے یہاں آنے کا
فیصلہ کر لیا پھر مطلب کی بات پر آگئی اور وہ بیٹا مچھلایا جس
کے لیے مجھ سے کہا گیا تھا۔

جینہ نے کہا۔ ”میں نے نہیں فون کرنا ہے، یوں بھی
اب میرا سودا ہو گیا ہے۔ اگلے ماہ کے پہلے چھوٹی میری تھو
اتروانی کی رسم ہے اور ایسے موقع پر میں اپنی بے عزتی نہیں
کرنا سکتی۔“

وہاں سے واپس آئی تو جانی اور استاد جی میرے منتظر
تھے۔ جانی اکاؤنٹ کھولانے کا فارم لے آئی تھی اور استاد
جی کیسٹ لیے میرے منتظر تھے۔ میں نے پہلے فارم پر دستخط
کے تو جانی نے بتایا کہ چپک منبر نے کہا ہے کہ شافی کارڈ کا
مسئلہ نہیں ہوگا۔ بعد میں کچھ ہوا تو وہ کچھ یاد آجائے گا۔

میں نے جانی سے کہا جینہ بتا رہی تھی کہ اس کا سودا
ہو گیا ہے اور اگلے ماہ کے پہلے چھوٹو کو اس کی تھو اتروانی کا
نقشہ ہوگا۔

”ماں خود تو ہوا ہے لیکن اتنی رقم میں کد نہ ہوتا تب
بھی بہتر تھا۔“ جانی نے کہا۔
میں نے پوچھا کہ ایسی بھی کیا بات ہوگی تو انہوں نے
بتایا کہ بازار میں اب تک اتنی رقم کا سودا نہیں ہوا۔ یوں
کچھ لو کہ جتنی رقم کا چپک تم دو کرکٹس کا لائی ہو اس کے
آدھے پر تمہاری خالہ نے اپنی بیٹی کا سودا کیا ہے اور تمہاری
ماں بھائی کی اس تعجب داری و فرمائندہ داری پر خوش ہے۔ اپنی
اولاد کی ناخبرگانی پر ماتم کر رہی ہے۔

اس دوران میرے امتحان ہوئے اور ہر بار کی طرح
میں پھر کلاس میں اول آئی۔ ساتھ ہی میں نے وہ دونوں
کرکٹس ریکارڈ کروائے پھر امتحان کے فوری بعد کو یہ کا
کرکٹس ریکارڈ کروائے۔

اس پہلی کرکٹ کی ریکارڈنگ میں مجھے باری شاہ کے اعزاز
سے بھی کم وقت میں ریکارڈ کروادی اور اس کی اصل وجہ یہ
تھی کہ باری شاہ نے ریکارڈ شدہ کیسٹ ناویہ کو دے دی تھی
اور میں نے پوری شام استاد جی کے ساتھ اس کا ریاض کیا تھا
اور اگلے روز جمعہ کو میں نے کرکٹ کی ریکارڈ کروادی تھی۔
اس کے اگلے روز ناویہ کے پروگرام کی ریکارڈنگ کروائی
تھی۔ جب ناویہ کا پروگرام ختم ہوا تو اس کے اگلے روز فیروز
صاحب نے مجھے فون کیا۔ انہوں نے کہا۔ ”رات میں
”غزل اس نے چھیڑی“ سنا اور مجھے بہت پسند آیا۔ میرے
ذہن میں خیال آیا کہ اس پروگرام میں شعر ہونے والی
غزلوں کا ہم کیسٹ بھی ریلیز کر سکتے ہیں بلکہ میں نے کراچی
کی ایک کنبی سے پتہ کر لیا ہے جو غزلوں کے کیسٹ ریلیز
کرتی ہے بلکہ میں نے ناویہ سے بھی بات کر لی ہے کہ وہ اس
پروگرام میں ریکارڈ ہونے والی غزلیں نشر ہونے کے بعد
نہیں دے دے۔“

میں نے ان کی بات سنی اور کہا۔ ”معاذ پھر سے
معاذ پر انک جائے گا اس لیے فی الحال میں کچھ نہیں کہہ
سکتی۔“

اس پر فیروز صاحب نے کہا۔ ”کوئی زیادہ مسئلہ نہیں
ہوگا کیونکہ ابتداء کی بات میں کر چکا ہوں۔“
میں نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”آپ نے تو پانچ جوار ملے کیے
ہوں گے۔“ اور اس بار فیروز صاحب نے ہنسا شروع
کر دیا۔

آٹھویں جماعت میں بھی میں نے ٹاپ کیا اور نویں
میں آگئی تو ہر ایک نے ڈراما شروع کر دیا۔ ”اب یہ قول
آنا بھول جاؤ کیونکہ بورڈ کا امتحان ہوگا۔“

مگر مجھے خود پر یقین تھا اور میرا جواب ہر بار ایک ہی
ہوتا تھا۔ ”بورڈ کا امتحان ہے تو کیا ہوا آئے گا تو ہی کورس
میں سے جو ہم نے پڑھا ہے۔“ اور ڈرامے والے اپنا سامانہ
لے کر وہ جاتے تھے۔

ایک ضروری کام تھا اس سلسلے میں میڈم نذیرت کی
طرف آئی ہوئی تھی۔ مشورے کے بعد مگر پہنچی تو وہ ہانپنا
تھا۔ میں اپنے کمرے کی جانب بڑھنے سے پہلے لاؤنچ میں
آئی تو وہاں موجود ہر ایک کے چہرے پر افسردگی تھی۔ خالہ
بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور لپٹا کر
دھڑائی مار کر دنا شروع کر دیا اور میں پریشان ہو گئی۔ سوال

ملا محمود فاروقی

1585-1652ء

ملا محمود بن محمد بن شاہ جو پندری۔ ہندوستان کے ایک عظیم عالم اور متفکر۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور اس کے بعد استاد الملک محمد افضل جو پندری سے حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں منطق اور فلسفے کی تکمیل کی۔ جب ان کی شہرت شاہجہان بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے انہیں آگرے میں طلب کیا اور اپنے وزیر امیر محمد اللہ خان کو حکم دیا کہ ان کے شہر چمپے پر ان کا معیار استقبال کیا جائے۔ بالآخر انہیں درباری مقام میں شامل کر لیا گیا اور سرمدی کے منصب سے نوازا گیا۔ وہ مصاحب کی حیثیت سے سفر میں شہنشاہ کے ساتھ رہے۔ لاہور کے شاہی دورہ کے موقع پر ملا شاہ میر بدخشاہ نے انہیں سختی سے لہجہ کی کہ وہ دنیا داری میں بہت زیادہ الجھ گئے ہیں اور بادشاہ کی ملازمت ترک کرنے کی ہدایت کی۔ اس بات سے متاثر ہو کر ملا موصوف نے شاہی ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے گاؤں واپس جا کر تدریس کا کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہجہان کے دوسرے بیٹے اور اس وقت کے بنگال کے حاکم شاہ شجاع نے، جو ان سے فلسفے اور منطق کی کتابیں پڑھتا رہا تھا، انہیں دھاکا بلا لیا۔ فلسفے اور علم البلاغہ پر ایک عظیم سند کی حیثیت سے انہیں بلند عالم مانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے مت سے کبھی کوئی ایسا لکھ نہیں کہا جسے بعد میں واپس لیتا پڑا ہو، اور نہ کبھی کسی حلفیہ بیان کی تردید کی۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ان کا شہر قدیم شیشی فتحپور میں کیا ہے۔ جو پندرہویں صدی میں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے۔ ملا صاحب کی تصانیف یہ ہیں۔ 1۔ انیس اہل ارتقا۔ 2۔ الفرائد فی شرح النوادر۔ 3۔ انوار المصنوع۔ 4۔ حاشیہ علی الآداب الباقی۔ 5۔ مرسلہ: نوازش علی و کراچی۔

کوئی غیر عورت آئے اور ہمارے بارے میں کچھ جان لیں۔ میں نے دل میں زوردار کہہ دیا۔ مجھے ملاں کی اس کردہی کا اچھی طرح علم تھا۔ ملاں نے پھر سوال کیا۔

”دوسری شرط کیا ہے؟“
”میں نے ایک اور جھوٹ گڑھا۔“ ان کا کہنا ہے کہ وہ ملاں کی ٹیٹوں کے لیے پندرہ سو لیں گی لیکن دو مضامین لکھیں پانچ سو لیں اور کم از کم تین مضامین پانچ سو لیں گی۔“
”تم خیرا بی بیٹ سلیکٹ کرو۔“ ملاں نے اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی کہا۔ ”میں یہ اجازت اس لیے دے رہی ہوں کہ تم میٹرک کے بعد گھر بیٹھو گی اور میرا پر فیصلہ نہیں تسلیم کرنا ہوگا۔“

”میں نے سوال کر دیا۔“ ملاں یہ سب آپ نے اپنی دلوں بیٹوں پر تو اس طرح کی پابندی عائد نہیں کی تھی پھر مجھ پر یہ خاص مہمانی کیوں؟“
”میں نے گھور کر مجھے دیکھا۔“ ان دونوں نے جو کہنا ہے کہ میں اس کے بعد شہر چمپا ہوئی ہوں۔“
”میں نے شہر شروع کر دیا اور فسی کے دوران ہی میں نے کہا۔“ ملاں بتاتے تو آپ پہلی بیٹی کے بعد ہی ہوئی تھیں لیکن دوسری نے بھی وہ چکر دیا کہ آپ آج تک نہ بھول سکیں۔“

”میں نے ایک خسر نہیں آ سکی۔“ زبان چلاتی ہے اس کی سزا یہ ہے کہ کل سے تیرا اسکول بند۔“ ملاں کا فقرہ مکمل ہوا تھا کہ تالی وہاں آ گئیں۔
”یہ کہنا رکھو کہ گھر سے پر کیوں اتار دی ہے۔“
”میں نے پھر کچھ کہے ڈراٹنگ روم سے چلی گئیں تو وہی نے کہنا شروع کیا۔“ اس کی بات کا پرست ماننا۔ یہ جہیز کا خسر پر اتار دی تھی۔“

”میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس کے بعد کی کہانی بہت آسان ہو گئی تھی۔“ سچ اسکول جاتی اور وہاں سے واپس آ کر ٹیٹوں کے بہانے میڈم نہرت کے گھر چلی جاتی۔ میڈم نہرت روز اول سے میری راز دار تھیں۔ ساتویں عادت تک وہ میری کلاں بچہ نہیں لیکن اب وہ ہمیں انگلیں پڑھاتی تھیں۔ میڈم نہرت کا فلیٹ دو کمرے کے پاس تھا جو ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ٹیٹوں کے بہانے ریڈیو پر گرام کرنے میں دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ میری ملاقات ہر ہفتہ وہاں سے ہوتی تھی میں نے اس سے معلوم کیا کہ دونوں کمرشل کو آکر انہوں نے میرے گھر رکھے ہیں اور بہت سچی

”اسپا کر کیا ہے۔“ میں نے سوال کیا تو اوپر سے آواز آئی۔
”اس میں تمہارا بھی شیئر ہے۔“
”میں نے کہا۔“ میرا کیا شیئر ہے۔“
”تم نے ہی جہیز کو میرا نہیں دیا تھا، میرا شیئر میری اس سے بات ہوتی رہی اور میں نے ڈاکو کو اس پر دھاری کر لیا کہ وہ اسپریشن پر بلا لیں۔“ ابھی ہماری گفتگو مکمل ہوئی تھی کہ ملاں ڈراٹنگ روم میں آ گئیں۔

”میں نے کہا۔“ میں نے پھر انتظار کے لائن و سسٹم کر دی تو ملاں نے حیرت لہجہ میں کہا۔ ”جواب کیوں نہیں دیتی کس سے چپکے چپکے بات کر رہی تھی۔“ تو میں نے جھوٹا سہارا لینے میں دیر نہیں کی۔
”کلاس بچہ کا فون تھا۔“ میں نے کہا اور ملاں کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے انہیں میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ اور انہوں نے اپنا لہجہ حیرت کرتے ہوئے کہا۔ ”لو کی اپنی تعلیم پر توجہ دے یہ آواز کے جادو جگا کر کر دے۔“

”میں نے موقع فطرت جان کر کہا۔“ ملاں آٹھویں تک تو بات سچ رہی تھی میں کلاس میں چپ کرتی رہی لیکن نوویں میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔“
”میں نے کہا۔“ کیوں پہیلیاں بھجوا رہی ہے کل کر بات کیوں نہیں کرنا۔“
”میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے کا فیصلہ کر لیا اور کہا۔“ صاف بات یہ ہے ملاں کہ اب مجھے انگریزی اور فیس میں ٹیٹوں کی ضرورت ہے۔“
”میں نے کہا۔“ اور کتنے پیسے لے گا۔“
”میں نے ان کی نیم رضا مندی کو سمجھتے ہوئے ایک جھوٹ گڑھا۔“ ملاں میں نے اسی سلسلے میں کلاس بچہ سے بات کی تھی۔“

”میں نے سوال کیا۔“ کیا کہا اس نے۔“
”میں نے جواب میں ایک اور جھوٹ گڑھا۔“ انہوں نے اپنی دوشراٹنگ دھکی دی۔
”اور وہ شراٹنگ کیا؟“ ملاں کا سوال تھا تو میں نے جھوٹ کی بیٹ ٹوک کر کہہ کر کہا۔ ”پہلی شرط میڈم نہرت کی اجازت ہے۔“ میں نے کہا۔
”میں نے کہا۔“ میں نے پھر کچھ کہے۔“

”خالد نے اور زور سے روتا شروع کر دیا اس نے مجھے ہانی سامنے سے آتی ہوئی نظر آئیں۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھا اور میری آنکھوں میں ابھرتے ہوئے سوال بھی سمجھ گئی۔“ ارے یہ بد نصیب روئے نہیں تو کیا کرے جہیز گھر سے فراہم ہو گئی۔“
”میں نے تیرے تیرے جہیز کے دن تقریب تھی۔“ میں نے سوالیہ انداز میں کہا تو خالد نے مجھے گلے لگا کر کہا۔
”جہیز اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔“ خالد نے کہا۔

”اور میں نے دل میں کہا کہ شکر ہے وہ اس دلدل میں گرنے سے بچ گئی لیکن زبان سے کچھ اور نکلا تھا۔“ خالد آپ کو کب معلوم ہوا۔“ تو خالد نے اپنا موبائل میرے ہاتھ میں دے دیا۔
”میں نے یہ کہہ کر کئی تھی کہ ملاں ایک دن رہ گیا ہے میں آخری شاٹنگ کر کے آتی ہوں تو میں نے تمہاری والدہ کو فون کیا کہ اپنا ڈرائیور بھیج دو اور اس نے تمہارا ڈرائیور جو تمہیں اسکول لے کر جاتا ہے اور لاتا ہے اسے بھیج دیا اس کے ایک گھنٹے کے اندر یہ سچ آیا ہے۔“ انہوں نے سچ کی جانب اشارہ کیا جسے میں پہلے ہی پڑھ چکی تھی کہ ملاں میں جا رہا ہوں میٹرک کے لیے۔ میرا چچا نہ کرنا اور نہ ہی پیس میں رپورٹ دینا کرنا کیونکہ آدھے گھنٹے بعد میں خلافت سے امریکا چلی جاؤں گی۔ تم چاہو بھی تو مجھ تک نہیں پہنچ سکتیں۔“ خالد نے کہا۔

”مگر میرا ڈرائیور تو مجھے لے کر آیا ہے۔“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔
”وہ تمہارا ڈرائیور نہیں ہے وہ اس کا ڈرائیور ہے جسے میرا نے بلوایا تھا نہیں لے جانے کے لیے۔“ نانی نے کہا۔
”دیکھ گڈا بات ہے میں نے نہ پہلے ڈرائیور کی شکل دیکھی تھی اور نہ مجھے فطرت کی تھی کہ میں ڈرائیور کی شکل دیکھ سکتی۔“ میں اپنے گھر سے پہنچی تو میرا موبائل بج رہا تھا۔
”میں نے موبائل اٹھایا تو اس کی اسکرین پر مسز ڈاکو کا نام چمک رہا تھا۔ میں اپنے موبائل کے گڑاٹنگ روم میں آ گئی اور دم آواز میں کہا۔“ یہ نانا کو کیوں فون کیا ہے؟“
”دوسری جانب سے آواز آئی۔“ یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ جہیز اور اگلار میرے پاس آچکے ہیں ملکہ اگلار ڈاکو نے ملازم کی رکھ رکھاؤ۔“

Grenada گرينیڈا

دھندوار 122 اس (غرب الہند) کے جنوب میں کیریبین کا ایک جزیرہ اور پارلیمانی مملکت۔ رقبہ: 133 مربع میل یا 338 مربع کلومیٹر۔ آبادی: (تقریباً 53 فیصد، جھوٹ 42 فیصد، سفید قوم ایک فیصد، دیگر 4 فیصد)۔ دارالحکومت: سینٹ جارجز۔ زبان: انگریزی۔ مذہب: مسیحی۔ سک: ایسٹ کیریبین ڈالر۔ مقصد دو ایوانوں ایوان نمائندگان (15 ارکان) اور سینٹ (13 ارکان) پر مشتمل ہے۔ تقریباً سارا علاقہ کھیتی باڑی ہے۔ معیشت کا اہم ذرائع زرعت پر ہے۔ دارالحکومت اور کیریبین اہم برآمدی اشیاء ہیں۔ ملکی ضرورت کے لیے چاول اور ملکی کاشت کی جاتی ہے۔ ساحل پر ٹیکس اور تیل کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔

گرینیڈا کے اصل باشندے آرواک انڈین تھے جنہیں کولمبس کے یہاں آنے (1498ء) کے فوراً بعد آدم خور انڈینوں (کرب) نے یہاں سے مار ڈالا۔ 1609ء میں یہاں انگریزوں نے قدم جانے کی کوشش کی، لیکن فرانسیسیوں نے ان کی یہ کوشش ناکام بنادی۔ 1650ء سے 1762ء تک یہ علاقہ فرانسیسیوں کے زیرِ تسلط رہا۔ اس کے بعد انگریزوں کے زیرِ تسلط آگیا اور تقریباً دو سو سال تک انہی کے قبضے میں رہا، سوائے ایک مختصر عرصے کے (1779-83ء) جب امریکی انقلاب کے دوران، فرانسیسیوں نے انگریزوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ 1833ء میں یہاں غلامی منسوخ قرار دے دی گئی۔ 1974ء میں انگریزوں نے اسے آزاد کر دیا اور یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔

مرسلہ: زمین فیاض، کراچی

بین نہیں کیا بلکہ کہا کہ زمیندار اسکول سے آنے کے فوری بعد یونٹ میں چلائے تو تہجاری خاندان نے کہا کہ یہ تو تم نہیں جانتی کہ وہ خاندان سے کہاں جاتی ہے اس پر میں نے بتایا کہ انوار کوڑوں پر وہ کمرہ ہوتی ہے اور رات میں بھی باہر نہیں جاتی تہجاری خاندان کا ایک عیادت بھی کرتی تھی کہ میڈم ہم ماں بیٹی کی انگڑیاں بھی پہنتی تھیں کہ میڈم زہبت لڑے میں چائے اور لوازمات لے آئیں۔ اماں نے کہا: "آپ نے تو خاصہ تلف کر ڈالا۔"

میں تلف کی کیا بات ہے، دوسرے یہ کہ آج زمین نے وہاں کا کھانا بھی نہیں کھایا اس میں اس کا بھی حصہ ہے۔ اماں نے کہا: "تہجاری نانی بتا رہی تھیں کہ تم کچھ کھانے بغیر نکل گئی تھیں۔"

"وہ اماں پچھتی رہے ہوئی تھی کیونکہ آج کل اسکول میں ایکسٹرا کلاس میں پڑھ رہی ہیں پھر مجھے یہ بھی ذہن میں تھا کہ کہیں مجھے ٹیوشن سے رہنم ہو جائے۔ یہاں پہلی تو میڈم کھانے سے فارغ ہو چکی تھیں بلکہ برتن دھو رہی تھیں۔"

اماں بکھر کر چلی گئیں۔ میں راستہ میں بھی کہ مغرب کی اذانیں ہو گئیں مگر کچھ توجہ کے مطابق اماں کو نہیں ٹھہری تھیں۔ غریب وہ مغرب کی اذانوں سے پہلے وہاں پہنچ جاتی تھیں جہاں سے ہم بیسوں کا گھر چلتا تھا گھر نانی گھر بھین۔ میں یہ بھی نانی کے پاس پہنچی اور ان سے گلے لگ گئی اور انہیں وہ بچہ بچہ بتایا جو اماں کے ساتھ میری بھینک ہوئی تھی۔

"وہ جو تہجاری والدہ نے اپنی اور خالہ کی باتیں بتائیں ہیں اس کی ایک گواہ تو میں ہی ہوں۔ تہجاری خالہ اپنی بیٹی کی تلفی ماننے کے لیے بتا رہی تھیں بلکہ تمام الزام تہجاری بہن پر ڈال رہی تھیں اور ساتھ ہی تہجاری سے ہارے میں بھی جانے کیا کیا بکواس کرتی رہی تھی بلکہ وہ تو اس حد تک چلی گئی تھی کہ "بہت ہو گیا اب اسے اسکول سے اٹھاؤ اس تہجاری ماں نے اعتراض کیا کہ ذریعہ ہر کلاس میں آؤں آئی رہی ہے اب جبکہ وہ میٹرک کے قریب آگئی ہے تو میں کیا اسے قلعے سے محروم رکھ سکتی ہوں۔ اس پر تہجاری خالہ نے کہا ہر اتوار رات اس کا پرگرام آتا ہے۔ جس پر تہجاری ماں نے کہا اتوار کو تو وہ دن ان کے گھر میں رہتی ہے بلکہ ہفتہ اتوار کو بھی وہ کہیں نہیں جاتی کیونکہ اس کے اسکول کی

میڈم نے اپنی مہمان کو رخصت کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ میں تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں میں اپنی سکانوں کا ایک چھوڑ کر گئی تھی اور کتا لپٹ کر کچھ نہ لپٹ کر شروع کیا جیسے ابھی میں پڑھ رہی تھی۔ کتا بھی کھانے ہوئے میں نے سوال کیا۔ "میڈم یہ مہمان کون ہیں پہلے انہیں کچھ نہیں دیکھا۔"

میڈم نے کہا: "یہ میری بھانجی ہے شادی کے بعد کچھ نیا شفت ہوئی ہے لیکن یہ مجھ سے نہیں تم سے ملے آئی تھی۔"

میں نے کہا: "مجھ سے ملے آئی تھی تو کیا میں نہیں۔"

میڈم مسکرا دی اور کہا: "جو نظام وہ دیتا چاہتی تھی مجھے دے گئی ہے۔" میڈم نے کہا اور اس وقت قہقہے کی شکل ہوئی اور میڈم نے اٹھنا چاہا تو میں نے انہیں روک دیا۔

"میں دیکھ لیتی ہوں کہ کون ہے۔" میں نے غصہ کا دروازہ کھولا تو سامنے توقع کے مطابق اماں موجود تھیں۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ "اماں آپ۔"

اماں کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آگئی اور انہوں نے کہا: "ذریعہ تم نہیں ہو؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی جیسے انہیں توقع نہ ہو کہ میں وہاں موجود ہوں گی۔ میں اماں کو لے کر اس کمرے میں آئی جہاں میری سکانیں اور میڈم زہبت موجود تھیں۔ میں نے ان دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا تو میڈم نے کہا: "آپ کچھ عرصہ نہیں ملے جاتے ہیں۔"

اماں نے انہیں روکا کہ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ مگر میڈم انہیں نظر انداز کرتے ہوئے چن کی طرف بڑھ گئیں تو میں نے اماں سے سوال کیا۔ "اماں خیریت تو ہے۔"

اماں نے کہا: "خیریت ہے۔ یہ بھی اور نہیں بھی۔" اور میں اماں کی بات سن کر حیرت سے انہیں دیکھنے لگی اور کہا: "میں بھی نہیں کہ خیریت ہے یہ بھی اور نہیں بھی۔"

ہوئے مگر اس کے بعد کسی نے رابطہ نہیں کیا۔ رابطہ تو بہت سے لوگوں نے کیا لیکن جب انہیں تہارے معاوضہ کے بارے میں معلوم ہوتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں اب تہجاری تمام توقعات اس کیسٹ سے وابستہ ہوتی چاہے جو فیروز صاحب کوشش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں تک مجھے معلوم ہے آخری مراحل میں ہے۔ "باویہ نے کہا تو میں مسکرا دی اور کہا: "مگر معاملہ پھر معاوضہ پر اٹک جائے گا۔"

باویہ بولی: "جیسے تم نے ایڈورڈ کو تک سنبھالی میں معاملات طے کروائے تھے ویسے ہی یہاں بھی منوالینا۔"

باویہ نے کہا تو میں نے جواب دیا: "مجھے یہ بات معلوم کر کے بتاؤ کہ اب تک جو کیسٹ اس کہنی نے ریفریز کیے ہیں اس کا معاوضہ کیا ادا کرتی رہی ہے۔"

باویہ مسکرا دی: "تہجاری کہنے سے پہلے ہی میں اس سلسلے میں معلومات جمع کر چکی ہوں مگر یہی جو معاوضہ ادا کرتی رہی ہے جو میں ہندوں میں ہے۔" باویہ نے کہا: "مجھے اس سے غرض نہیں کہ کہنی کس کس کو کتنا کتنا معاوضہ ادا کرتی رہی ہے۔ میری دلچسپی صرف اس میں ہے کہ وہ آواز کے لیے کتنا رقم ادا کرتے رہے ہیں۔"

باویہ نے کہا: "اس کے لیے تو فیروز صاحب سے ملنا پڑے گا۔"

"تو فیروز سنو اس سے بہتر ہے کہ تم باری شاہ سے ملو۔ یہ بھی کچھ نہ کہو تو اس شخص میں معلوم ہوگا۔"

باویہ کے پاس سے میں میڈم زہبت کے یہاں پہنچی تو مزاح پر ہی میں نے اماں کی گاڑی دیکھی۔ میڈم کے قہقہے کے ذرائع سے ایک جو میں روڈ کی طرف سے آتا تھا اور دوسری سڑکیاں لگی کی جانب سے آتی تھیں۔ میں جاتے ہوئے مزاح والی سڑکیاں استعمال کرتی تھی اور کچھ دیر قہقہے پر رک کر گاڑی والی سڑکیاں استعمال کرتی تھی۔ اس کے لیے میں میڈم زہبت کی کار کو ذرا پیچھے بھی استعمال کر لیتی تھی جس کی میڈم نے بخوشی اجازت دے رکھی تھی۔ باویہ کے پاس سے واپس پر میں نے بیٹھ کی طرف لگی والی سڑکیاں استعمال کیں اور تیزی سے تھوڑے فاصلے پر میڈم کے قہقہے تک پہنچی۔ مجھے قہقہے کی نسل بھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میڈم اپنے قہقہے کے دروازے پر موجود تھیں اور کسی آواز سے انہیں متنبہ نہ کیا۔

اماں نے کہا: "تہجاری خالہ دو روز سے مجھے بتا رہی تھیں کہ تم نے اسے روکا ہے۔"

لے جاتا جا ہوں تو وہ انکار کر دیتی ہے کہ میری پڑھائی کا حرج ہوگا۔ پہلے کارڈ لکھا ہوگا پروگرام چل رہا ہوگا۔ مگر تمہاری خالہ کسی دلیل سے مطمئن نہیں ہوئی بلکہ اس نے کہا یہ جو دو اشتہار آ رہے ہیں وہ ملائی پاؤڈر کے اور کوک نما شروپ کے یہ بھی اسی نے گائے ہیں اس پر میں نے کہا۔ اشتہار کے لیے ہتھوں لگ جاتے ہیں جب جب جا کر اشتہار بناتا ہے۔ اس پر میری بیٹی نے مجھے دو سائیں کہ میں شرمندہ سی ہوئی۔

اگلے دن جب میں مس نزہت کے پاس گئی تو انہوں نے کہا۔ "ایک سوال کروں ناراض تو نہیں ہوگی۔" میں نے جس کر کہا۔ "ناراض ہونے والا سوال کیا تو چاراض بھی ہو سکتی ہوں۔"

"سوال میرا نہیں بلکہ میرے چھوٹے بھائی اسد کا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کا کوئی بھائی بھی ہے۔" مس نزہت نے کہا۔ "ہم ایک عملی بیٹی ہیں والد اور والدہ کے علاوہ مجھ سے بڑا بھائی بھی ہے جو میڈیکل کالج کے فخریٰ افسر ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا سوال تھا بھائی کا۔" مس نزہت کے ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ آئی تھی تمہاری انہوں نے کہا شروع کیا۔ "اسد تمہاری آواز کے بہت بڑے فین ہیں اسنے بڑے کہ اتوار کی شب وہ سب کچھ بھول کر تمہارا پروگرام سنتے ہیں بلکہ اسے شپ بھی کرتے ہیں۔"

"اب جلدی سے سوال بھی بتا دیں۔" مس نزہت نے ہنسنا شروع کر دیا پھر کہا۔ "اسد نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ ان کی عمر میں اس قدر پروہ یہ اسلامی ہے یا اپنی بد صورتی چھپانے کا بہانہ ہے۔"

"آپ نے کیا جواب دیا۔" مس نزہت کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ انہوں نے کہا۔ "میں نے ان کے دوسرے سوال کے جواب میں بہت کچھ کہا تھا کہ روزینہ اتنی خوب صورت ہے کہ تم قصور نہیں کر سکتے۔"

اسد نے کہا۔ "تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں اس کا دیدار نصیب ہوا۔"

میں نے کہا۔ "میں نے ہنسنا شروع کر دیا اور ہنسنے

غلط تو نہیں۔"

مس نزہت نے زور سے توجہ لگا یا تھا پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "اسد کا ارادہ ہے کہ وہ خود نوٹیں لکھنا شروع کرے اور تم کہہ رہی ہو کہ ان کے دماغ میں خلل ہے۔" میں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا اور کہا۔ "میں نے پہلی نظر کی حجت کے بارے میں تو پڑھا ہے لیکن پھر دیکھے صرف آواز پر عاشق ہونا جانے کی پہلی مثال سامنے آئی ہے۔"

مس نزہت نے کہا۔ "بچے ابھی تمہاری عمر کی کیا ہے آہستہ آہستہ بہت سے انکشافات ہو جائیں گے۔" میں نے دو دنوں کے غلطکار ہنسنا شروع کر دیا۔

"آپ کے والد کا بڑا پس کیا ہے؟" میں نے سوال کیا تو مس نزہت نے جواب دیا۔

"والد صاحب کا بہت بڑا بزنس ہے وہ کیسٹ تیار کرتے ہیں اور پورے پاکستان بلکہ ملک سے باہر بھی ان کے ڈسٹری بیوٹر ہیں۔" ہمارے گھر بیٹنے سے پہلے وہ پاکستان نادیہ کی دو کاپیاں آچکی تھیں۔ مگر گھر میں داخل ہوئی تو قریب کے مطابق گھر میں خاموشی تھی۔ میں نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر خبر پوچھ لی کہ یہی ہی تیل پر تھپنے والے کال ریسیور کی۔ "خیر تو بے دو کاپیاں کر لیں چھوڑو سنٹ میں۔"

نادیہ نے کہا۔ "میں جلد سے جلد تم تک دوں اور خیر بیاں پہنچانا چاہا رہی تھی مگر تم نے کال ریسیور کی۔" میں نے کہا۔ "اب تو ریسیور کی ہے اب جلدی سے بتا دو۔"

"باری شاہ تو بہت کام کا آدمی ثابت ہوا۔" نادیہ نے بتایا تو میں نے سوال کیا۔

"تفصیل سے بتاؤ میرا اندازہ ہے کہ تم نے باری شاہ سے ملاقات کی ہے۔" میں نے کہا۔

نادیہ نے ہنسنا شروع کر دیا۔ "چودہ برس کی عمر میں تم اپنی عمر سے کم از کم تین برس بڑی ہو۔" اور پھر مختصر سے وقت کے بعد کہا شروع کیا۔ "تمہارا اندازہ سو فیصد درست ہے میں نے باری شاہ سے ملاقات ہی نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ اس کی بہن کے گھر پر ڈرنج بھی کیا تھا اور ساتھ ہی تمہاری کیسٹ کے بارے میں بھی بات چیت ہوئی تھی ایک اور بات باری شاہ کی ایک بھائی تمہارے اسکول میں پڑھتی ہے۔ وہ تم سے ایک کلاس پیچھے ہے لیکن اس نے بتایا کہ تم اس کی عمر نہیں بلکہ اسکول کی عمر یا ہرگز کی آئی نہیں ہو۔"

جانے والی لڑکیوں پر میری اصلیت ظاہر ہوئی تو وہ مجھے منہ لگا بھی پسند نہیں کریں گے۔" یہ سب چھوڑو یہ بتاؤ کہ کیسٹ کے بارے میں کیا بات ہوئی۔

"کیسٹ کے معاملے سے ہماری بہت دیر تک بات ہوئی اور سارا اندازہ صحیح تھا کہ باری شاہ اس جواب لے سے بہت متنبہ ثابت ہو سکتا ہے بلکہ میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ باری شاہ اس سلسلے میں بہت زیادہ کام کر چکا ہے بلکہ وہ تو کہہ رہا تھا کہ ممکن ہے پندرہ روز میں وہ تمہاری میٹنگ اس کیسٹ لپٹی کے مکان سے بھی کروا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگلے ماہ میرے امتحان شروع ہو رہے ہیں اس لیے میں پوری طرح سے اپنی تعلیم پر توجہ دوں گی۔" امتحانوں سے فارغ ہو کر میں تمہارا پروگرام بھی کروں گی۔

"یہ تو بڑا دلی ہوگی۔" نادیہ نے کہا۔ میں نے کہا۔ "ہر شے سے بڑھ کر میری تعلیمی کیریئر اہم ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم سے امتحانوں میں صرف پاس نہیں ہوں بلکہ میرے مارکس اتنے اچھے ہوں کہ میٹرک میں پوزیشن حاصل کرنا آسان ہو۔"

امتحانوں سے پندرہ دن پہلے اسکول میں تعطیل کر دی گئی اور میں مکمل طور پر کتابوں میں گھومتی۔ اسکول کی چھٹیاں تھیں لیکن ٹیوشن سے چھٹی میں انور پڑھیں کر سکتی تھی۔

امتحان شروع ہوئے تو میں نے دل سے ہنسنے دیے۔ ہنسنے بہت اچھے ہوئے اور ہم کتاب کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر ایک کے بعد میڈیم نزہت مجھ سے پرچہ چل کروائی تھیں اور اپنے اطمینان کا اظہار کرتی تھیں۔ پھر بڑے ماہ بعد نتیجہ آیا۔

پہلے مرحلے میں صرف یہ سامنے آیا کہ کس نے کتنے پرچوں میں کامیابی حاصل کی تھیں پھر مارکس شیٹ کا انتظار شروع ہو گیا۔ مارکس شیٹ آنی تو پہلے صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور مارکس شیٹ میرے حوالے کی۔ مارکس میری توقعات سے بھی بہتر تھے۔ میں نے گھر پر مارکس شیٹ دکھائی اور فوراً بعد نادیہ کو فون کیا اور اسے اپنے مارکس کے بارے میں تفصیل بتائی تو اس نے کہا۔ "تم نے ابھی سے فیصلہ کرنا ہے کہ میٹرک کے بعد کس کالج میں داخلہ لوگی۔"

میں نے جواب میں کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ میٹرک میں میرے اچھے نمبر آئے تو کسی بھی کالج میں داخلہ لے سکتی ہوں۔"

"جو مارکس تمہارے نوٹس میں ہیں اس کے مطابق تم

میں مسکرا دی ایک یہ لڑکی ہے جس کا گھر ہے کوئی رشتہ نہیں اور ایک میری سگی ماں ہے جس نے صرف مارکس شیٹ پر ایک نظر ڈالی اور اسے روی کاغذ یا گزشتہ کل کا اخبار کچھ کر خود سے دور کر دیا صرف اپنی انکی جس بنیوں نے مجھے شاپا بھی دی اور گئے سے بھی لگایا۔ اماں کی تو بس وہی پرانی رٹ تھی۔ "میٹرک کرو اس کے بعد آگے بڑھنے کی بات نہ کرنا۔" اس پر میں خاموش رہی مگر اپنی خاموشی نہ دہریں۔

"جی تو زبان سے اچھا فقرہ بھی کہہ دیا کرو۔" نانی نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی مگر اماں کو پیش آ گیا اور انہوں نے کہا۔

"اچھی بات تو اس وقت میرے منہ سے نکلے گی جب کان کوئی اچھا فقرہ سنیں گے۔" اس کے بعد اماں اور نانی کے درمیان پرانی بحث چھڑ گئی اور میں نے سنے ہوئے فقرے دوبارہ دہرنے کے لیے وہاں سے اٹھ گئی۔ اسکول میں میری کامیابی پر خوشی کا اظہار ہر پہل سمیت ہر گھر نے کیا ان میں میڈیم نزہت سب سے آگے تھیں انہوں نے میری کامیابی پر ایک چھوٹا جشن بھی منایا جس میں دیگر بچہ رز کے ساتھ پہلے صاحب بھی شریک ہوئیں۔

میٹرک میں آتے ہی میں نے تعلیم پر پہلے سے زیادہ توجہ دینی شروع کی اب اسکول کی ہر چیز بھی پہلے سے زیادہ مہربان تھی ان سب کو اُمید تھی کہ بورڈ میں پوزیشن لے کر اسکول کا نام روشن کروں گی۔ ہر شے بہتر تھی لیکن اماں کی منتظر ہوتی چارہ تھی کہ مجھے کتنی بہن کریمے میں بٹھا دیا جائے لیکن میں نے ان کی باتوں کو نظر انداز کیا اس دوران ایک بار نادیہ کا فون آیا اور اس نے سوال کیا۔ "دوبارہ سے پروگرام کب شروع کر رہی ہو؟"

میں نے جواب میں کہا۔ "پروگرام بھی شروع کر دوں گی پہلے باری شاہ سے ملنا پسند کروں گی ویسے بھی میری میٹرک کی پڑھائی شروع ہو گئی ہے اور بڑے پڑھوں کا کہنا ہے کہ یہ ملنا صراط ہے جو اس سے کامیابی سے گزریا اس کے اگلے راستے بہتر ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر یہ گہری ذمہ داری ہے۔ مجھے صرف پاس نہیں کرنا بلکہ ایسے پاس کرنا ہے کہ ان سب کو مطمئن بھی کرنا ہے جو مجھ سے پوزیشن لینے کی اُمید لگاتے ہوئے ہیں تاکہ میرے اسکول کا نام ہر خاص و عام کی زبان پر آئے اور ان کی زبان میں خاموش ہو جائیں جو یہ کہتے تھیں کہ اسکول میں

محمد احمد مہدی سیو ڈانی

(1809-1885ء)

محمد احمد مہدی سیو ڈانی کے والد کا نام عبداللہ، والدہ کا نام آمنہ تھا۔ وطن، شمالی سوڈان کا شہر وقتولا تھا۔ مہدی نے سات برس کی عمر میں اپنی والدہ سے قرآن حفظ کیا اور پھر خوطم کے مدرسہ خوجلی میں اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے بعد والد کی ہدایت پر فرقہ گمانیہ کے بزرگ حضرت علی قاس کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ ایک عرصہ کے بعد مہدی کو اپنے مدرسہ سے اس بنا پر اختلاف ہو گیا کہ سوڈان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور انگریزوں نے مذہبی مدارس بند کر دیے تھے۔ ان حالات میں مہدی سیو ڈانی نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو صرف خراب و منہر کی تربیت نہیں جتنا چاہیے۔ مہدی ان میں شامل کرانگریز کے خلاف کام کرنا چاہیے۔ مگر ان کے مرشد خانقاہ سے باہر نکلنے کے مخالف تھے۔ یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ مہدی نے مرشد سے اختلاف میں کر لیا۔ عرصہ ایک سال میں قیام کیا۔ منواؤں کی جماعت پیدا کر لی بیعت لیتے وقت انگریز کے خلاف جہاد کی شراعت سے قطعاً چار چنانچہ پچاس ہزار مریدوں کو مہدی نے سچ کیا اور علم بغاوت لہرایا۔ مختلف محاذوں پر مہدی نے انگریز کے خلاف تیرہ جنگیں لڑیں اور ہر لڑائی میں انگریز کی فوج کو ہزیمت ناک شکست ہوئی۔ 1880ء میں مہدی سیو ڈانی کا شرکت غیر سوڈان کا حکمران بننا

کیا اور 22 جون 1885ء کو یہ عظیم انسان دنیا سے رخصت ہو گیا۔ چالیس ہزار مسلمان اس کے جنازہ میں شامل ہوئے۔ مہدی کی وفات کے بعد انگریزوں نے اپنی فکٹ کا بدلا لینے کے لیے سوڈان پر بھرپور فوج کشی کی۔ ان فکٹ کا اثر شور لارڈ بکچر تھا۔ خلیفہ عبداللہ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر مسلمان اندرونی خلفشار اور جامع از ہر کے علماء کے فتویٰ لکری وجہ سے ہار ہو گئے۔ جامع از ہر کے علماء نے مہدی سیو ڈانی کی تحریک آزادی کو خلاف اسلام اور مہدی کو کافر قرار دے دیا۔ انگریزوں نے اس فتویٰ کو گھر گھر پہنچایا اور زرخیز مولویوں کے ذریعے مہدی کی تحریک کو ناکام بنا دیا۔ 1890ء میں لارڈ بکچر سوڈان پر دوبارہ قابض ہوا تو اس نے مہدی کی قبر کھدو کر اس کی لاش نکالی، ہر کانہ، اور سری نکاش کر لی۔ اور اس کے منبر کے کونوں کی گول باری سے تباہ کر دیا۔ مہدی کا سر جزل گورڈن کے بیچے کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ سر پر انتقام لے سکے۔ مہدی نے اپنے دور حکومت میں اسلامی شہنشاہی کیس کو اولیت دی تھی۔ باجماعت نماز ادا نہ کرنے والوں کو کوڑے مارے جاتے، بلا شرعی خبر کے روزہ نہ رکھنے والوں کو قید کر دیا جاتا تھا۔ عورتوں کا بازاروں میں پھرنا ممنوع تھا۔ شادی بیاہ کی رسمیں منادو ترین ہوتی تھیں۔ تین سو سوڈانی مسکے زائد جہیز دینا مکمل کر دیا تھا اور حق مہر کی شرح تیس سوڈانی مسکے مقرر کر دی تھی۔ قرآن مجید حفظ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری تھا۔ بڑی بڑی جاگیریں ضبط کر لی تھیں۔ غربا کو بیت المال سے دکان تک ملنے تھے۔

تعلیم میں رکاوٹ نہ ہو۔
 نہیں ہوتی تو میرے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے کہ پرچے میرے بہت اچھے ہوتے پھر نتیجہ بھی آگیا اور میری بورڈ میں دوسری پوزیشن آگئی۔ اسکول میں ہر طرف خوشی پھیل گئی میرا ہر جاننے والا خوش تھا سوائے اماں کے جن کی ضد عروج پر آچکی تھی کہ مجھے سختی پہن کر مجھ سے بیٹھنا چاہیے اور میں مستقل انکار ہی کرتی۔ میری سب سے بڑی ہانکی اور بدکار نانی تھیں۔ ایک دو اماں اور نانی کی زوردار جھڑپ ہوئی یہ وہ دن تھا جب ماں سے میں نے آگے پر ہٹنے کی بات کی تھی اور اماں نے کہا تھا۔ "آخر تو چاہتی کیا ہے۔"
 میں نے کہا۔ "میں ایم اے کرنا چاہتی ہوں۔"
 اماں نے تیز آواز میں کہا۔ "یعنی تو بھی اپنے آبائی پیشے سے انکار ہی ہے۔"
 میں نے کہا۔ "ایک بار نہیں ہزار بار انکار کرتی ہوں۔"
 اماں بھڑک گئیں۔ "میں اب میری تعلیم کے لیے ایک پیسہ نہیں دوں گی۔"
 اماں نے یہ کہا تو نانی سے ضبط نہیں ہوا۔ "اب میری بات بھی غور سے سن لے۔" یہ کہتے ہوئے نانی نے واضح کر دیا۔ "اب اسے میرے بیٹوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"
 اماں نے چونک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو نانی نے وضاحت کر دی۔ "اے تمہارے بیٹوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"
 اسے پسند کر بیٹھی ہو کر کا وہ بھی نہیں پسند کرے گا۔" اور میں نے جواب میں کہا۔ "تم نہ آؤ میں بھائی کے ساتھ آ جاؤں گی۔"
 اسد کے آنے کا سن کر میرے دل میں کچھ عجیب سا ہونے لگا تھا۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا۔ وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کسی لڑکی کا آئینہ مل ہو سکتا ہے۔ میری دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور میرے ذہن نے سرگوشی کی۔ "تم تو اسے پسند کر بیٹھی ہو کر کا وہ بھی نہیں پسند کرے گا۔" اور میں نے جواب میں کہا۔ "تم نہ آؤ میں بھائی کے ساتھ آ جاؤں گی۔"

مجھے اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا اس لیے پورا سال کتابوں سے غرض نہیں ہٹا میں صرف ایک روز نادیہ کے کہنے پر باری شاہ سے ملی اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ اگر نادیہ نے تمام ریکارڈنگ ان کے حوالے کر دی تو جس روز وہ ریکارڈنگ دیں گی اس کے پندرہ روز میں کیسٹ بھی آجائے گی تو میں نے کہا۔ "معاذ معاوضہ کا ہے۔"
 باری شاہ نے کہا۔ "اس سلسلے میں تمہیں اس کمپنی کے مالکان سے ملنا ہوگا ویسے میری اطلاع ہے کہ وہ مقتول رقم دیتے ہیں۔"
 میں نے کہا۔ "میں تیار ہوں دن آپ ملے کر لیجیے گا اور نادیہ کو بتائیے گا میں مقررہ وقت پر پہنچ جاؤں گی۔"
 اگلے روز نادیہ کا فون آیا کہ جمعہ کے روز بعد نماز جمعہ میں ان سے ملنا ہے۔ میں نے نادیہ سے کہا۔ "تم مجھے پک کر لیتا اور وہاں میرے ساتھ ہی رہنا۔"
 نادیہ نے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتی تھی۔"
 میں نے مسکرا کر کہا۔ "چلو تمہاری دلی مراد پوری ہو گئی۔" پھر مقررہ دن نادیہ نے مجھے پک کیا اور راستہ سے ہم نے باری شاہ کو پک کیا جس نے کار میں بیٹھے ہی موبائل پر کسی کو گاردی آدمی کی اطلاع دی۔ ہم وہاں پہنچے تو کمپنی کے مالک صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور ہمیں لے کر اپنے دفتر کی جانب بڑھے۔



سبق

مکرمی مدبر
السلام علیکم!

حالیہ سیلاب کے دوران اس سچ بیانی نے جنم لیا۔ مجھے جو سبق ملا ہے اسے میں نے کاغذ پر اتار دیا ہے تاکہ سرگزشت کے قارئین بھی سبق حاصل کریں۔

سیدہ شاہدہ شاہ
(جہلم)

اس نے اپنا نام کنیز بتایا تھا اور وہ میرے ساتھ سو بہ سندھ کے علاقے خیر پور سے آئی تھی۔ جب میں اپنا ایم ایس ہاؤس جہلم کے ڈاکٹر کی عیم کے ساتھ سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں گئی تھی۔ یہ سیلاب جون 2022ء تا اگست 2022ء تک پاکستان بھر میں جاہلیاں مچاتا رہا تھا۔ لوگوں کے گھر فصلیں، مال مویشی غرض یہ کہ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ خیر پور کے لوگ اس علاقہ کے تھے اور جو باقی رہ گئے ان میں سے بھی بہت سے بچے

اسد کے چہرے پر حیرت کے آ جا رہے تھے۔ ”آپ بتائیں کہ آپ کا تعلق کس خاندان سے ہے۔“ اسد نے کہا۔ ”زور میں ایک طوائف زادہ ہے۔“ مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن جب آپ کو ہمارے بیک گراؤڈ کے بارے میں علم ہوگا تو آپ جتنی طور پر مجھے بلکہ ہماری فیملی کو مسترد کریں گی۔“ اس کی بات میں نزہت نے مکمل کی۔ ”ہمارے والد غشیات کے ایک بہت بڑے ڈیڑھے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”اور وہ دفتر اور کیسٹ کا کاروبار وہ کیا ہے؟“

اسد فحش دیا تھا۔ ”ابا دو برس جیل میں گزارنے کے بعد شریف ہو گئے اور انہوں نے یہ کاروبار شروع کیا اور پانچ برس میں ترقی کرتے ہوئے آج ملک کے سب سے بڑے کیسٹ کے پروڈیوسر اور ڈسٹری بیوٹر ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایک آخری سوال۔“ ڈوٹول، لیکن بھائی پوری طرح سے میری جانب متوجہ ہوئے تھے۔ ”کیا آپ کی فیملی ایک طوائف زادہ کی کوہو کے طور پر قبول کرے گی۔“ ”میں نے بہت سے کہا۔“ تم صرف طوائف زادہ ہی پچھو کہ اپنے پیدا ہونے کے بارے میں اختیار نہیں ہوتا۔“ میں ان سے بات کر کے ملتی تو نانی جو دروازے کے ساتھ کھڑی ہوئی ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ ”جب تمام باتیں ہو چکی ہیں تو کل ہی نکاح کرلو اور وہیں سے اسے اپنے گھر لے جانا۔“ نانی نے تجویز دی تو اسد نے کہا۔

”کل نکاح کر لیں مگر کہاں؟“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے میڈم نزہت کو اپنا عقیدت دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ میری خوش نصیبی ہوگی کہ میری بیٹی میرے گھر سے رخصت ہوگی۔“ میں نزہت بولیں۔ اگلے روز جمعہ کی نماز کے بعد میرا اسد کا نکاح ہوا اور وہیں سے رخصت ہو کر میں عیم کے گھر آ گئی۔ آج اس بات کو سات برس ہو چکے ہیں۔ اسد نورویش ہو گئے ہیں اور میں اردو میں ایم اے کرنے کے بعد کانٹا میں پھرتا ہوں۔ اماں نے شروع میں خوب شور مچایا لیکن

اسکندر اعظم انتہائی کم عمری میں بے شمار مالک اور سرکار تھیں لیکن آپ نے یہ نہیں بتا ہوا کہ اس نے اپنی کوئی مستقل سلطنت بھی قائم کی تھی۔ اس نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ جب وہ بستر مرگ پر تھا تو کسی نے اس سے پوچھا۔ ”اے عظیم انسان سلطنت کس کے سپرد کرنے کا ارادہ ہے۔“ ”اس نے جواب دیا۔“ اپنے سے زیادہ طاقت ور گئے۔“ اور ہوا بھی یہی۔ اس کی موت کے بعد اس کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ یہ ایک بڑے انسان کی بہت بڑی غلطی تھی۔

مرسلہ: تابید و قار حسن، شادی پور

آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مجھ میں ایسی کون سی خالی ہے کہ اسد مجھے مسترد کر دے گا جبکہ وہ میری آواز کا فین بھی ہے۔ میں نے ذہن کی سرکشی کے جواب میں سوچا تو ایک اور سرکشی ہوئی۔ ”جب اس کے علم میں آئے گا کہ تو ایک طوائف زادہ ہے تو وہ تجھے دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔“ ذہن نے ایک سرکشی کی اور میں نے سرخ رنگ کا جوڑا تبدیل کر کے کالی لیکن لیکن لی اور پھر آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی کہ اسے میں چوکیدار نے آکر بتایا کہ آپ کی مس اور ان کے بھائی آئے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آتی ہوں۔“ اور میں اپنی روائتی چادر لے بغیر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی اسد نے کہا۔ ”آخر کار آپ کا دیدار نصیب ہو گیا۔“

اور میں شرما سی گئی لیکن اس کے فوری بعد اس نے کہا۔ ”علانیہ کہتا ہوں کہ جتنی تعریفیں باقی نے آپ کی تھی آپ اس سے زیادہ جہن ہیں۔“ اور میں اپنی تعریف سن کر حیرت مانی لیکن بھر میں نے خود پر قابو پایا اور سوال کیا۔ ”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”جی اسد نے لکھی بات کہہ دی کہ میں حیرت زدہ رہ گئی۔ اس نے کہا۔ ”میں آپ کو کٹر کیسٹ حیات بتانا چاہتا ہوں۔“ میں اس بات پر خود کو قابو نہ کر سکی۔ ”جب آپ کو میرے حالات پتہ چلیں گے تو آپ مجھے مسترد کر دیں گے۔“

ساتھ وڈیوں کی اترن پہن کر ان کا جھوٹا اور بچا کچھا کھانا

فلام ابن فلام ہماری اپنے سیاسی آقاؤں کے منہ
 اتر کر ایک چمکنے کی راہیں ہمار کرتے رہے اور اپنے لیے دن
 رات محنت کی کدال سے روتی دکھلاش کرتے رہے۔
 کثیر کے ماں باپ، گھر بار، کچھ سیلاب کی نظر
 ہو گیا تھا۔ وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ بے
 یار و مددگار اور غم و غم و غم کی کھار تھی۔ اپنے میں اسے کئی
 تے اللہ ڈوایا جا کر ان کی تائید، چنانچہ وہ کچھ پوچھتی پوچھتی اللہ
 ڈوایا جا کر ان کی تسبیح و تعریف حویلی میں آن پہنچی جہاں اس
 جیسے اور بھی کئی چاند گرہن موجود تھے۔ یہ کہاں تھے اللہ ڈوایا
 جا کر ان کی تسبیح تھی۔ کچھ جاننے کیوں کثیر سے ہمدردی
 سی ہوئی چنانچہ کثیر نے اسے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔
 کثیر نے کچھ عرصہ میں اس کی کفالت کی تھی۔
 اس کے بعد اس نے اس کی کفالت کی تھی۔
 جانتی تھی۔ دیگر چاند گرہنوں کی طرح اس نے بھی صاف

ہماری ٹیم کے سامنے ہی ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر اور انجینئر
تجربہ کار اور ہائے ہوئے اسپیشلسٹ تھے۔ فخر پر میں
سیلاب سے متاثرہ علاقوں کے دورے کا وہ آخری روز تھا۔
اگلے روز ہماری واپسی تھی۔ آج میں ان متاثرہ علاقوں میں آئے
ہوئے تقریباً دو ہفتے سے زائد کا عرصہ بیت چلا تھا۔
جس روز میں واپس آنا تھا اس سے ایک رات پہلے
اس علاقے کے ایک بااثر شخص نے ہمارے اعزاز میں
مشائے کا بندوبست کیا تھا۔ جس میں ہمارے پی ایم اے
ہاؤس، قیلم کے تمام ڈاکٹر، ٹیم کے ساتھ ساتھ دیگر اہم
شخصیات کو بھی بلایا تھا۔ اس بااثر شخص کا نام اللہ دیا
جا کر انی تھا مگر سائیں جا کر انی کے نام سے مشہور تھا اس
کے گھر یار گزین لوگ بھی تھے۔ یہ وہ چاند گزین تھے جن کے
گھر یار، مال مویشی اور سامان وغیرہ سیلاب کی تباہ کاریوں کی
نظر ہو چکے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے مال
باب، مکان بھائی، عزیز و اقارب سب کچھ سیلاب کے ریلوں
میں بہہ گئے تھے۔ جانے وہ زندہ بھی تھے یا نہ زور پانی کے
ریلوں نے انہیں سالم کو پہنچا رکھا تھا۔ اور اب وہ بھری
ری و ناخ، بالکل مری ہوئی حالت میں تھے۔ ان
کی تباہی دیکھنے والوں میں میری بھی تھی۔ اس کے بعد ہمارے
باب سیلاب کی نظر ہو چکے تھے۔ وہ اسے مال باب کی انگوٹھی

ہم اپنے ساتھ ادویات کی بہت بڑی مقدار اور طبی آلات بھی لے کر گئے تھے۔ تاکہ بڑی امراض کا علاج اور لوگوں کے لیے فری مینڈیکلر کیمپ لگا سکیں۔ ان کو ادویات دے سکیں۔ ہم صوبہ سندھ کے مختلف اضلاع شکر، خیرپور، میرپور خاص، دھاکا، پور، کوٹلی، جنکب آباد، کھٹوار، کندھ کوٹ اور دہوکہ حاشہ و اضلاع اور مان کے گاؤں قبولیت سے ہوتے ہوئے تقریباً پانچ سو پندرہ محکمہ گئے تھے۔ ہم ہر مہترہ و گاؤں میں ایک ایک دواؤں و دواں فراہم کرتے۔ آشیانہ خیر خواہی اور دیگر

کھا کر۔ جو بڑے چھروں سے لکڑیاں پانی کی رائے سے
 دن رات خدمت کرتے ہوئے زندگی کا سفر طے کرتے اور
 پھر ایک دن منوں مٹی تلے چپ چاپ قیامت تک کے لیے
 بندی بن جاتے۔

کثیر بھی ایک ایسے ہی ہاری ماں باپ کی اکلوتی بیٹی
 تھی۔ مگر کے نام پر ایک چھوٹا سا جونیڑی نما گھر تھا۔ ہاں اس
 کا باپ صبح صبح منہ صبح سے اپنے ڈیرے کے ڈیرے پر چلا
 جاتا اور مالٹاٹے کے نام پر اسے سوگی روٹی اور بغیر دودھ کے
 گڑ والا تھوہ دے کر ڈیرے کی حویلی میں چلی جاتی۔ جب
 تک وہ چھوٹی تھی۔ اس وقت تک ماں اسے اپنے ساتھ حویلی
 میں لے جایا کرتی تھی کہ کسی سی جان کا گھر میں دیکھ بھال
 کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ سن بلوغت کو پہنچتے پہنچتے وہ گھریلو
 کام کاج میں ملحق ہو چکی تھی۔ گاؤں کے ہاری تو دیسے بھی
 وہاں کے ڈیروں، جاگیرداروں اور مساکین لوگوں کی رعایا ہوا
 کرتے ہیں۔ رعایا بھی ایسی جو نسل در نسل رہتی اور جسمانی طور
 پر ان کی غلامی غلام ہوا کرتی ہے۔ ایسے گاؤں ایسی جھوک
 میں آتی ہے یہ ڈیرے اور مساکین اسکو نہیں جتنے اور کھلنے
 دیتے ہیں کہ مراد ان کی رعایا پڑ لکھ کر پاشور ہو جائے اور ان
 کی غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادانہ طور پر گزارنے کے قابل
 ہو جائے۔ کثیر بھی دیگر ہاریوں کی بہو، بیٹیوں کی طرح دنیاوی
 اور دینی تعلیم سے کوسوں دور رہی۔ البتہ گھر کے کام کاج میں
 خوبی مہارت حاصل کر لی۔ ایک روز اس گاؤں کے ڈیرے کا
 ادھر سے گزر ہوا۔ کثیر کوئی حور شاہن نہ تھی۔ بس سانولے
 سلونے رنگ کی وجاہی شکل و صورت والی تھی۔ مگر وہ ڈیرہ
 باوجود چچا سمجھن کا سن ہونے کے انتہائی عیاش شمع تھا۔ اس
 کی نظر کثیر پر پڑی تو اس کی رال ٹپک پڑی۔ وہ اسے گہری
 نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں حویلی چلا گیا اور کثیر کی ماں اور
 باپ کو بلا کر یہ حکم صادر کر دیا کہ آگے دن سے کثیر بھی حویلی میں
 کام کاج کے لیے آ کر اسے چہ چستا نچا لگے دن سے کثیر بھی
 کام کاج پر حویلی جانے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ والدین کی بہت سی
 عادات و خصائص اولاد کو ورثے میں ملتے ہیں۔ میڈیکل اس
 دور کے اولاد میں منتقلی کو ”جین“ کی کمرہ سازی گردانتی
 ہے۔ مگر میں بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سارے بچے اپنے
 والدین کی عادات اور خصائص سے عکسreflect ہوتے ہیں۔
 شاید یہی لوگوں کے لیے ”شیطان کے گم نامہ“ بھی
 کہیں۔ اس کے باوجود کثیر کی والدین نے اپنا ہر
 نیکو عمل ان ڈیروں کے ذاتی و جسمانی طور پر غلام تھے۔

ان کا دین و دھرم بھی تھا کہ یہ وہ ڈیرے، یہ سانولے
 مال کے حتی کہ ان کی آل اولاد کے بھی مالک تھے۔ ان کی ماں
 سے سرتابی کرنا ہے ادبی کے ڈیرے میں آتا ہے۔ کثیر بھی
 کہ اگر کوئی مساکین یا ڈیرہ والے کہ جس سال مساکین
 عورت کو اپنی خلوت میں طلب کرتا تو اس گھر کے سردار کی خوشی
 بغیر کوئی اعتراض کیے اپنی عورتوں کو ان کی خلوت میں آکر کھڑے
 کے لیے بھیج دیتے تھے۔ کثیر کے والدین بھی ایسے ہی ہاری
 تھے۔ جنہیں اپنی جوان بیٹی کو اپنے مالکوں کی خلوت میں بھیج
 پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ وہ غلام این غلام تھے۔ مالکوں کے حکم
 سے سرتابی ان کی سرشت میں ہی نہ تھی۔ مگر کثیر کے سین میں
 نجانے کیسے اور کہاں سے یہ جرات درآئی تھی کہ ایک مالک کے
 شراب کے نشے میں دھت اس چچا اس بچپن سالہ ڈیرے نے
 اسے اپنی خلوت میں طلب کر کے اس سے دست دراز کرنا
 چاہی تو کثیر ہلک اٹھی۔ وہ ڈیرے کے منہ پر زور دیا اور چھوڑ
 مار کی مگر سخت الفاظ کے نشروں سے اس کو بولہبان کرتے
 ہوئے باہر نکل آئی۔ اس ڈیرے کی یادداشتی میں کثیر عیادت
 کا علم بلند کرنے والی غالب پہلی لڑکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے
 اسے کسی درندے کی طرح دو بوج لینا یا ہاکر ٹھٹھے کی زبانی کے
 باعث لڑکھڑا کر گھریا۔ کثیر دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اسے
 اعزاز و تھا کہ ڈیرہ اس کے ماں باپ کے ڈیرے سے دوبارہ
 اپنی خلوت میں محبت کے لے گا اور نسل در نسل غلامی کی انتہی
 زنجیروں میں جکڑے ہوئے والدین اسے زبردستی اس
 ڈیرے کی خلوت میں دھکیل دیں گے چستا نچے اس نے فیصلہ
 کر لیا تھا کہ اگر اس کے والدین نے زبردستی اسے ڈیرے کی
 خلوت گاہ میں بھیجا تو وہ یا اس ڈیرے کی جان لے لے گیا
 اپنی جان دے دے گی۔ مگر اپنی عزت و ناموس کا سودا نہیں
 کرے گی۔ ذاتی غلامی کی اس سختی میں جہاں عزت و ناموس
 ڈیروں کی ملکیت بھی جاتی ہے، وہاں ایک آن پڑھ جال اور
 گنوار لڑکی کا یوں ڈٹ جانا شاید اس سختی کا ایک انہود اور پہلا
 واقعہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کو کثیر کی یہ پاکیزہ حرکت اس قدر پسند آئی
 کہ خون خرابے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اسی رات طوفان نور کی
 طرح آسمان سے یوں چھا جو، پانی برسا کہ مالو آسمان میں
 چھید ہو گئے ہیں۔ ہر طرف مل جل گیا۔ پہاڑی علاقوں پر
 رات بھر اتنی بڑی ہوا کہ ہر طرف چھا گیا۔ اشیاء کی
 طرف آواز سارے دریا باپا بھر کے لہروں سے پھرتی
 آئے اور بھیستی بیٹیوں اور آبادیوں کو نکلنے لگے۔ نالے، بھٹیک،

عمداں سب کی سب اٹل پڑیں۔ ہر طرف سیلاب کے منہ زور
 ریلے انسانوں، مال مویشیوں اور ڈھوروں کو اپنے ساتھ
 بہاتے ہوئے انتہائی منزلوں، اچانک راستوں کی طرف بہہ
 نکلے۔ بہت سے لوگ، مال مویشی، سیلابی پانی کی گہرائیوں
 نے سالم سوچے نگل لیے۔ مکانات گر گئے۔ ساز و سامان پانی
 کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا اچانک کہاں سے کہاں چلا گیا۔ کثیر کی
 بہتی کا نام دیکھنا بھی مٹ گیا۔ ڈیرے مساکین کی حویلی یوں
 زمین ہوس ہوئی کہ وہ زمین خدا اپنے ہال بچوں، مال مویشیوں
 اور ساز و سامان کے ساتھ حویلی کے لیے میں دفن ہو گیا۔ ہر
 طرف ہا ہا کار چلائی۔ کثیر کے ماں باپ بھی جھونپڑی نما گھر
 سے باہر نہ نکل سکے اور پانی کا تیز دھندرا ان تینوں کو جھونپڑی
 بہت دیکھتا ہوا اپنے ساتھ بہانے گیا۔ خوش قسمتی سے اس
 سیلابی ریلے میں کثیر کے قریب سے ایک بڑا سا کھڑکی کا تختہ
 بہہ رہا تھا اس نے اسے مضبوطی سے تھام لیا اور اس کی مدد سے
 وہ تیرنے لگی۔ اس ہی کی طرح اور بھی بہت سے لوگ تھے جو
 مختلف اشیاء کے سہارے تیرتے رہے تھے، قیامت کی اس
 گھڑی میں ایسا ایک افواج پاکستان کشتیوں اور کشتی کا پھروں کی
 مدد سے آن پہنچا۔ یہ افواج پاکستان ان کے لیے رحمت کے
 فرشتے بن کر آئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان لوگوں کو اپنی
 کشتیوں اور کشتی کا پھروں کی مدد سے سیلابی ریلوں سے نکال کر
 محفوظ مقامات پر پہنچانا شروع کر دیا۔ انہی کی زبانی پتا چلا تھا
 کہ یہ قیامت صرف ان کی سختی میں ہی نہیں آئی بلکہ پورے
 پاکستان میں یہ شعل طوفان نور آیا تھا۔ یہ عظیمہ بات تھی کہ کئی
 علاقے کم متاثر ہوئے اور کچھ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ صوبہ
 سندھ اور صوبہ بلوچستان تو بہت ہی زیادہ قیامت خیز سیلاب
 سے متاثر ہوئے تھے۔ حکومتی ٹولے اپنی اپنی محفوظ پناہ گاہوں
 میں دیکے باندھے رہ گئے تھے کہ وہ مصیبت کی اس
 گھڑی میں اپنی عوام کو کچا نہیں چھوڑیں گے۔ مگر کئی طوفان پر
 سوائے ایک آدمی حکومتی نمائندے کے کسی نے بھی ان سیلاب
 سے متاثرہ علاقوں اور لوگوں کے پاس آنے کی ذمت گوارا
 نہیں کی تھی۔ صرف افواج پاکستان تھی اور ملک بھر سے آنے
 والی غلامی محبتیں جو بلا امتیاز سیلاب میں گھرے ہوئے لوگوں کو
 محفوظ مقامات پر پہنچا رہی تھیں۔ ان کے لیے کھانے پینے کا
 بندوبست کر رہی تھیں۔ انہیں کپڑے اور ہر قسم کی ضروریات
 زندگی کی اشیاء فراہم کر رہی تھیں۔ ان کے گھروں کی دوبارہ تعمیر
 کے لیے بھی امدادیں بھیج رہی تھیں۔ یہی وہ عوامی طور پر ان کے
 رہنے کے لیے یہ سیلابی بربادی تھی۔

گھڑیوں کے ساتھ اس علاقے کے باشندوں نے مساکین اللہ
 ڈوایا جا کھرائی کی اس حویلی میں پہنچا دیا گیا اور وہ حب سے
 وہیں مقیم تھی۔

کثیر اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو چکی تھی مگر مجھے ہر اہورا
 رات اٹھتی تھی۔ والدین بھی بچے بھی ہوں اپنی اولاد کے لیے ایک
 گھنیرا سایہ، ایک محفوظ سامان ہوا کرتے ہیں۔ خصوصاً
 بیٹیوں کے لیے تو وہ ایک ایسا مضبوط اور توانا محافظ ہوا کرتے
 ہیں جن کی موجودگی میں ایک بیٹی بیٹھا اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی
 ہے۔ ایک بیٹی کے لیے باہل کا گھر وہ اپنی نگہ ہوا کرتا ہے۔
 جس کے اندر وہ ایک محفوظ محسوس کرتی ہے مگر اس بچاری کے
 لیے نہ ماں باپ کا سامان رہا تھا اور نہ ہی گھر کی چار دیواری
 کا کوئی ٹکڑا۔ وہ بے سامان ہو کر گھر کے کوئی قطعے سے بے
 دخل ہو چکی تھی اور بھر پوری دنیا میں مصائب کی چیلنجاتی ہوئی
 دھوپ میں یوں بے سہارا ہو گئی تھی کہ ماں باپ کا خیر اسامیہ
 بھی اس کے سر نہیں رہا تھا۔ انکی لاوارث جوان لڑکیوں کو
 ہر کوئی ٹوٹ کا مال سمجھ لیا کرتا ہے۔ وہ اللہ ڈوایا جا کھرائی کے
 گھر کتنے دن رہ سکتی تھی۔ آخر ایک نہ ایک دن تو اسے یہاں
 سے جانا ہی ہوگا مگر کہاں؟ اس لفظ ”کہاں“ نے میرے اعد
 ایک خوف کی لہری پیدا کر دی۔ میں نے تصور کی اٹھ سے
 دیکھا کہ کثیر اللہ ڈوایا جا کھرائی کے گھر سے نکل کر پناہ کی
 حاش میں راہروا دھر بھٹک رہی ہے۔ اچانک بہت سے
 بھیڑیے جو انسانی قالب میں ہیں۔ اپنے ذات گوشتے اس
 کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور وہ اونچی آواز میں چیخ
 کر ”بھاؤ بھاؤ“ کہتے ہوئے بھاگ رہی ہے مگر اس کے
 چلانے کی آواز ان انسان نما بھیڑیوں کے شیطانی قہقروں
 میں دب کر رہ جاتی ہے۔ آخر کار وہ بھاگتے بھاگتے ٹھک ہار
 کر زمین پر گر پڑتی ہے اور وہ انسانی قالب میں چھپے ہوئے
 بھیڑیے اس پر چل پڑتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خوف سے
 مجھے جھرجھری آگئی اور میں ہوش کی دنیا میں آگئی۔ مجھے یوں
 لگا کہ اگر اس مظلوم لڑکی کو جس کے ماں باپ سیلاب کے
 پانیوں میں ڈوب کر مر گئے۔ جس کا گھر سیلاب سے تباہ ہو گیا
 ہے۔ اگر اسے یوں لاوارث اور تھکا چھوڑ دیا گیا تو بہت ممکن
 ہے کہ اس کا وہی حشر ہو جو میں نے ابھی تصور کی اٹھ سے
 دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک چھوٹا اور لکھا خیال
 آیا۔ میرے اندر سے جیسے ایک تحریک سی آئی کہ لڑکی بھری
 پری دنیا میں تھا اور لاوارث رہ گئی ہے۔ اس کا گھر برباد

گل خبیہ (Holly Hock)

ایک قسم کا پھول جس کا اصل وطن چین ہے۔ امریکا اور برطانیہ میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گل خبیہ کی عام قسم کے پھول کی رنگین پتھریاں ایک ہی جگہ میں ہوتی ہیں۔ لیکن ترقی یافتہ اقسام کے پھولوں کا رنگ سفید، زرد، کھائی یا ارغوانی ہوتا ہے۔ بعض اقسام کے پھول سیاہ رنگ کے بھی ہوتے ہیں۔ گل خبیہ کے پودے کی کاشت پنجاب کے ذریعے کی جاتی ہے۔ پرانے پودوں کی شاخوں کی لکڑی لگانے سے بھی نئے پودے حاصل کیے جاتے ہیں۔ کھاد کی دستی زمین میں گل خبیہ کا پودا خوب پختہ ہوتا ہے۔ پودے کا قد عموماً 4 سے 8 فٹ تک، جز غیر اضافی Tap root اور بڑے نرم ہوتے ہیں۔ جوں اور تنے کی سطح ہاریک ہوتی ہے۔ پھول خوشبو کے بجائے تلخہ تلخہ ہوتے ہیں، ضرور مادہ صول پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پتھریاں باقاعدہ دائرے کی شکل میں مرتب ہوتی ہیں۔ رنگین پتھریوں کے اندر کئی حاملہ ہوتے ہیں جن کے نیچے سرے قطب طوط پر ایک قس کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ کئی پتھریاں آئیں میں مل کر پھول کے مادہ کے حصے کی تشکیل کرتے ہیں۔ گل خبیہ سے پھل اور پتے سے چٹا ہوتا ہے۔ جس کے اندر کئی چٹے ہوتے ہیں۔

مرسلہ: فراز یاسین، چٹوٹ

سے آئی ہوئی لڑائی ختم نہیں کی کا مگر رہی جس۔ جن میں جہلم کی نامور لڑائی ختم نہیں کی کا مگر رہی جس۔ جن میں جہلم سے پہلے اپنے شوہر کو فون کر کے وہاں کی "اپ ڈیشن" لے لیا کرتی تھی۔ ساتھ ہی کینسر کے بارے میں بھی پوچھ لیا کرتی تھی۔ مجھے اپنے شوہر سے کینسر کے بارے میں یہ جان کر انتہائی خوشگوار حیرت ہوئی تھی کہ مگر اگر اسے دینی اور دنیاوی تعلیم دینے والی بھڑکی خست اور توہم کی بدولت بہت تیزی سے دو سیکسٹی چلی جا رہی تھی۔ نماز تو تقریباً وہ ساری کی ساری یاد کر چکی تھی۔ اب نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بھڑکی سے سیکھ رہی تھی۔ دوسری بات جو میرے شوہر نے بتائی وہ یہ تھی کہ وہ

کون سے ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ وہ سو پہ سندرہ کے ایک ایسے پوسا منہ ملائے سے آئی تھی جہاں دینی اور دنیاوی تعلیم کا نام و نشان تک نہ تھا اس لیے میں نے سوچا تھا کہ اس کے لیے گھر میں کی ایسی خاتون بھڑکی بندوبست کروں گی جو اسے دینی تعلیمات کے ساتھ سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھادے۔

ابھی ہمیں خبر پور سے آئے ہوئے بمشکل بارہ دن ہی ہوئے ہوں کہ مہر کی اپنی ایم اے ہاؤس سے ڈاکٹری کی ٹیم نے ایک بار پھر سلاب نزدکان کی مدد کرنے اور وہاں پر فری میڈیکل کیمپ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے بھی اس ٹیم میں شمولیت کی دعوت دی گئی اور میں نے یہ مدد خوشی یہ دعوت قبول کر لی۔ اس بار امدادی سامان پہلے سے زیادہ مالیت کا تھا۔ ہم چونکہ پچھلی دفعہ وہاں جا چکے تھے اس لیے ہمیں اعزاء تھا کہ وہاں کے متاثرین کے لیے کون کون سی اشیائے ضروریات اور وہاں کے مریضوں کے لیے کون کون سی ادویات کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ یہ جتنا سوچ رہا تھا اسی خاطر میں امدادی سامان اور میڈیکل سامان زیادہ مقدار میں لے لی تھیں۔ اس بار ہمارا امدادی سامان دس ٹرکوں پر مشتمل تھا۔ میں نے کینسر سے جاننے کا پوچھا تو اس نے انکار کر دیا میں نے بھی کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور مقررہ دن میں اپنی ڈاکٹری کی ٹیم کے ساتھ مشترکہ علاقوں کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہم اس بار بھی بذریعہ سڑک روانہ ہوئے تھے۔

اگلے دن دوپہر بارہ بجے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ وہاں کے ڈاکٹر نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اپنے علاقے کے دیگر بڑے کی کوئی میں لے گئے۔ جہاں ہمارے قیام و طعام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم چونکہ ایک طویل سفر طے کر کے آئے تھے اس لیے اس روز ہم نے فریٹس ہو کر کھانا کھایا اور محل آرام کیا۔ اگلے دن ہماری معمول کی مصر شروع ہو گئیں۔ پہلے کی طرح اس بار بھی ہم ڈاکٹری کی ٹیم کے کچھ ڈاکٹر مشترکہ علاقوں میں جا کر امدادی سامان وغیرہ تقسیم کرتے اور باقی قری میڈیکل کیمپ لگاتے۔ پچھلی بار ہمیں احساس ہوا تھا کہ شیر خوار بچوں کے لیے دودھ اور خفائی

انگشٹن کی شدید ضرورت تھی چنانچہ اس بار ہم اپنے ساتھ اچھی کوانٹیٹی کے دودھ کے ڈبے اور خفائی انگشٹن کی ایک بڑی مقدار ساتھ لے کر گئے تھے۔

اس بار ہمارا یہ دورہ دو ہفتے کا تھا۔ دو ہفتے ہم سب

تقریباً 26 گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد ہم جہلم پہنچے تھے۔ کیونکہ ہمارا یہ سفر باقی روز تھا۔ تھکاوٹ سے ماحال تھا اس لیے واپس اپنی ایم اے ہاؤس پہنچ کر کتنا دانی کی رپورٹ حکام بالاکوٹی اور اپنے گھروں کو مل گئی۔ میں نے فون کر کے اپنے شوہر کو بتا دیا تھا کہ میرے ساتھ کینسر کی ہوگی۔ کینسر کے بارے میں میں نے اپنے شوہر کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے شوہر کو سب کچھ سے کہہ کر ایک کمرائیز کے لیے سیٹ کروا دی گئی تھی۔

یوں بستر پر گر کر سوئے کچھ دس بجے کے سوسے مغرب کے وقت اٹھے۔ فریٹس ہو کر میں نے مغرب کی نماز پڑھی اور کھانا کھانے کے بعد ہم اسٹری روم میں آ گئے۔ جبکہ کینسر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اسٹری روم میں صرف میں اور میرے شوہر تھے۔ میں نے اپنے شوہر کو بتایا کہ کینسر کے حوالے سے ہمیں اپنی تمام فیملی کو بھی بتانا ہوگا اور اپنے بچوں اور بھائیوں کو بھی اعتماد میں لیتا ہوگا۔ اس کے لیے بے غلط پایا کہ ایک فیملی فنکشن منعقد کر کے تمام خاندان کے لوگوں کو مدعو کیا جائے اور اس فنکشن میں تمام خاندان والوں کو کینسر کے بارے میں تفصیل سے بتا کر انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ اب اسے ہمارے گھر کا ایک فرد ہی سمجھا جائے۔ یہ فیصلہ کر کے ایک تاریخ اور دن مقرر کر لیا گیا۔ اگلے دن تمام خاندان والوں کو تاریخ اور دن بتا دیا گیا کہ فلاں تاریخ اور فلاں دن ہمارے گھر میں ایک فیملی فنکشن ہے جس میں سب خاندان والوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ ہمارا وہ چٹا چورہ اوپن لڈی میں تھا اس نے بعد فیملی آنے کی ہائی بھری مگر جو چٹا کویت میں تھا۔ اس کو بھی ملنا مشکل تھی چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ فیملی فنکشن میں اسے اور اس کی بیوی کو بذریعہ ویڈیو کال شامل کر لیا جائے گا۔ مقررہ دن فنکشن شروع ہوا۔ جس میں ہم نے باضابطہ طور پر کینسر کا تعارف کرواتے ہوئے خاندان والوں کو بتایا کہ یہ لڑکی اب ہمارے گھر میں ایک فیملی ممبر کی طرح رہے گی۔ یوں کینسر ہمارے پورے خاندان میں ہمارے فیملی ممبر کی حیثیت سے تعارف ہو گئی۔ تعارفی تقریب کے بعد کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یوں کھانا کھاتے کھاتے رات کے دس بجے گئے۔

مہمانوں کے جاتے جاتے رات کے گیارہ بجے گئے۔ اس کے بعد ہم اپنی ذاتی خواب گاہ میں سوئے۔ اگلے دن صبح اٹھ کر ہم نے کینسر کے بارے میں بات چیت کی

پاس سے ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوگا۔ میرے دوستوں نے سالہ بیٹے ہیں جو شادی شدہ ہیں اور اپنی اپنی ملازمت کے سلسلے میں جہلم سے باہر ہوتے ہیں۔ ایک راولپنڈی میں ہوتا ہے۔ ایک عرصہ دراز سے کویت میں سیتل ہے۔ دونوں اپنی اپنی تعلیم کے ساتھ خوش ہیں۔ جبکہ ہم دونوں میاں بیوی اپنے اپنے سوشل سٹاپ میں مصروف ہیں۔ ماشاء اللہ اتنا بڑا اثنا ذاتی گھر ہے۔ گھر میں تین تین جینز وقت ملازمین ہیں۔ ہمیں اگر کہیں میننگ میں جانا ہو یا غلطی کاموں کے سلسلے میں لگانا ہو تو ہمیں ملازماؤں کو چھٹی دینی پڑتی ہے اور گھر کو مقفل کر دیتا ہے۔ کینسر میرے ساتھ چلے پر راضی ہو جائے تو ہم دونوں کے بہت سے مسائل بخوبی حل ہو جائیں۔ اسے خالص گھریلو ماحول مل جاتا۔ گھر کی چار دیواری کا تحفظ حاصل ہو جاتا۔ ہمارے گھر میں ہمارے فیملی ممبر کی طرح رہتی۔ ہماری عدم موجودگی میں بھی ایک گھر کے فرد کی طرح نہ صرف ملازماؤں سے کام کاج کروائی بلکہ ہمارا گھر بھی کھلا رہتا اور اسے مقفل بھی نہ کرنا پڑتا۔ یہی سوچ کر میں نے اس سے کہا کہ اگر اس کا کوئی عزیز و اقارب اس دنیا میں نہیں ہے تو کیا وہ میرے ساتھ جہلم جا کر رہنا پسند کرے گی۔ اس نے غلامی اور بغیر کسی شل و جھت کے میرے ساتھ جانے کی ہائی بھری۔

کھانا ختم ہوا تو میں نے اپنے کوئیک ڈاکٹر اور اللہ ڈوایا جا کر کرائی سے بات کی کہ کینسر کو اپنے ساتھ جہلم لے جانا چاہتی ہوں۔

اللہ ڈوایا جا کر کرائی نے نہ صرف کینسر کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی بلکہ میرے اس جذبے کی تعریف بھی کی کہ میں ایک لاوارث اور تجارہ جاننے والی لڑکی کو "ایڈاپٹ" کر رہی ہوں۔ البتہ میرے "کوئیک ڈاکٹر" نے بظاہر تو کہہ نہ کہا، تاہم تھائی میں مجھے سمجھاتے ہوئے کہا کہ میں کینسر کے حوالے سے کوئی جذباتی فیصلہ نہ کروں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کل کلاں کو کوئی مسئلہ وغیرہ نہ کھڑا ہو جائے مگر میں اپنے فیصلے پر پٹی رہی۔

اگلے دن جب ہم واپسی کے لیے رشتہ سفر ہمارے رہے تو کینسر میرے ساتھ تھی۔ سامان نام کی اس کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ ان لوگوں کا سارا سامان جن میں کپڑے وغیرہ تھے۔ سیلاب کی نظر ہو چکے تھے۔ بہر حال میں نے سوچا تھا کہ جہلم پہنچ کر میں اسے چار ڈیوے کر دوں گا۔ ملازماؤں کا جہلم پہنچنے پر اسے چار ڈیوے کر دوں گا۔

تھی۔ جو رشتہ دار قریب قریب رہتے تھے۔ وہاں تو وہ میرے شوہر کو ہاتھ کر اٹھایا جاتی تھی مگر جو رشتہ دار دور رہتے تھے۔ وہاں وہ میرے شوہر کے ساتھ جلی جاتی تھی۔ ہماری فیملی کی جوان لڑکیوں نے تو اس کی خوب گڑھی جھنجھٹی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ جان کر ادھر سن کر خوشی ہوئی کہ بالآخر اس کا دل جہلم میں اور خاص کر ہمارے دور ہمارے خاندان والوں کے ساتھ ٹھک گیا تھا۔

دو ہفتوں کے بعد ہماری واپسی ہوئی تو میں کثیر کے لیے کافی سارے تحائف لے کر آئی جنہیں لے کر وہ بہت خوش ہوئی۔

اب کثیر کا زیادہ تر وقت میری معیت میں ساتھ ہی گزارتا تھا۔ ڈاکٹر کی میٹنگ ہو۔ ملائی ٹیلیفون کی میٹنگ ہو۔ غرض یہ کہ جہاں جہاں بھی میری میٹنگ ہوتی وہ میرے ساتھ جلی جاتی۔ میں بھی یہ سوچ کر ساتھ لے جاتی کہ میرے ساتھ جب یہ ان ہائی فائی میٹنگ میں جایا کرے گی تو وہاں اسے لوگوں سے اٹھنے بیٹھنے اور سوسائٹی میں ملنے ملانے کے آداب آجایا کریں گے۔ میں جہاں بھی جاتی اسے اپنی چھوٹی بہن کی طرح کر دیتی تھی۔ اس کے چھٹی پڑوں کی مدد پر تراش تراش ہوتا تھا۔ آج کی یہ کثیر صوبہ سندھ کے شہر خیرپور سے دور ایک پسماندہ گاؤں کی وہ لڑکی ہے جو بالکل اچھا، مہربان اور سچے دلے لباس میں ہمہ وقت رشتہ دار تھی اور جس کو سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے اور ڈھنگ سے بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں آتا تھا۔

کثیر میرے ساتھ اس حد تک مانوس ہو چکی تھی کہ سامنے کی طرح ہمہ وقت میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ باوجود اس کے کہ ہماری عمروں میں بیس سال کا فرق تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ مختلف پہلوں کی محبت تھی۔ "بانی بانی" کہتے اس کی زبان نہ سمجھتی تھی۔ ہمارے تمام رشتہ داروں، ملنے والوں اور تمام ڈاکٹر کے ساتھ میری وساطت سے اچھی خاصی بے تکلفی اور ملکہ ملکہ پیدا کر لی تھی۔ میں خوش تھی کہ اس کے دل سے والدین کی وفات اور مگر کی جاتی کام آکر لکھا نہیں تو بڑی حد تک بھول چکا ہے۔

یہ غالباً ستمبر 2022ء کا پہلا ہفتہ تھا۔ جب ایک پار پھر ان کے رشتہ دار جہلم کے ڈاکٹر نے تیسری دفعہ صوبہ سندھ کے سیلاب سے متاثرین کی امداد اور فری میڈیکل کیمپ کا کام لیا۔

مالیت کا امدادی سامان، کھانے پینے کی اشیاء اور مختلف بیماریاں امراض کی ادویات لے کر مقررہ دن دن دکانوں کے سامنے اس بار بھی کثیر کو ساتھ جاتے کے لیے کہا تو اس نے حسب سابق انکار کر دیا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر ناپاہہ امرا نہ کیا کہ صوبہ سندھ کے پسماندہ گاؤں سے اس کی کیا یادیں تھیں ہوتی ہیں۔ بے شک وہ اس کی جائے پیدائش تھی۔ تاہم اس علاقے میں اس کے ماں باپ اس سے ہمیشہ ہیٹھ کے لیے جدا ہو گئے تھے۔ وہاں سیلاب نے اس کا گھر اس کا گاؤں صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ اس لیے وہاں جاتے سے اس کے ذہن ہرے ہو جاتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ وہاں میں جانا چاہتی ہے چنانچہ میں ڈاکٹر کی ٹیم کے ساتھ اٹھ کر ملنے جلی جاتی۔

جلی بار جب ہم سندھ کے پسماندہ علاقوں میں جہاں لوگوں کے گاؤں کے گاؤں سیلاب کے سزاور دوروں کی نظر ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کے گھر بے گھر بن گئے تھے تو وہاں کے متاثرین نے بتایا تھا کہ حکومت نے ان لوگوں کے لیے کچھ کیمپس لاکھڑے کر دیے ہیں امداد کا اعلان کیا تھا جن کے گھر سیلاب سے تباہ ہو گئے تھے تاکہ وہ اپنے گھر دوبارہ تعمیر کر سکیں۔ چنانچہ ایک روز وہاں کے علاقوں کے ہاؤس لوگ ان کے پاس ان لوگوں کی فہرست لے کر آئے جن کے گھر تباہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے متاثرین کو کہا کہ اپنے اپنے ناموں کے سامنے آگئے کچھ کیمپس شہر میں گرویں یا پھر گاؤں میں انہوں نے دوپے وصول کر لیے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ دیکھ دی کہ اگر انہوں نے کسی کو یہ بتایا کہ ان کو پیسے نہیں ملے تو وہ انہیں اور ان کے خاندان کو گول کر دیں گے۔ یہ سفاکی، بربریت اور خود غرضی کی انتہا تھی کہ سیلاب سے تباہ و برباد ہو جانے والوں کے لیے آئی ہوئی امدادی رقم بھی ان تک نہیں پہنچ پادی تھی چنانچہ اس بار ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ امدادی سامان کے ساتھ ساتھ ان کو نقد رقم بھی دیں گے تاکہ وہ اپنے گھر دوبارہ تعمیر کر سکیں۔ ہم نے کچھ پار کی ان سے پوچھا تھا کہ ان کو ان کے گھر کی تعمیر کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہے۔ ان کے گھر کون سے ایکڑوں پر محیط عمارت تھے جو کروڑوں روپے میں تیار ہوتے۔ سب نے اوسطاً دو لاکھ اور اڑھائی لاکھ روپے کے حساب سے اندازاً رقم بتادی۔

چنانچہ ہم نے واپس آکر اپنی مدد آپ کے تحت اور کچھ غیر حضرات کے تعاون سے اپنی رقم جمع کر لی تھی۔ جن سے کم از کم ایک سو گھر تعمیر ہو سکتے تھے۔ ہم نے جہلم کی دیگر علاقوں میں بھی امداد کی ضرورت کو سامنے رکھا۔

انہوں نے بھی اپنے اپنے طور پر متاثرین سیلاب کے گھروں کی تعمیر کے لیے کام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ میں ان لوگوں کو خود اپنی گھرانی میں گھر تعمیر کر کر دے رہی تھیں۔ مگر ہماری طرح جن علاقائی تنظیموں کے پاس وقت نہیں تھا، انہوں نے متاثرین سیلاب کو نقد رقم دے دی تھی تاکہ وہ خود اپنے گھر تعمیر کر سکیں۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا کہ ہم وہاں کے علاقوں اور لوگوں سے واقف تھے کہ کون سا علاقہ سیلاب سے متاثر ہوا ہے اور کون سے لوگ بے گھر ہو چکے ہیں۔ اس لیے ہم وہاں کے ڈاکٹر کی معرفت ان علاقوں کے ہاؤس فراہم کرنے سے متاثر ہوئے۔ ہم سیلاب سے متاثرہ لوگوں کی بحالی، ان کی امداد، ان کے لیے فری میڈیکل کیمپ کی ضروریات میں یوں محنت ہوئے کہ کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہا۔ اس دوران صرف دو یا تین بار میں اپنے شوہر سے رابطہ کر پائی۔

سولہویں دن جب ہم جہلم کے لیے واپس روانہ ہوئے تو صبح ہی میرے شوہر کی کال آئی اور انہوں نے بتایا کہ کثیر وہاں سے گھر سے غائب ہے۔ میں نے یہ سن کر اس کے غائب ہونے کے لیے زیادہ اہمیت نہ دی کہ وہ سکا ہے کہ تھائی سے گھر آکر وہاں سے کسی عزیز و اقارب کے ہاں چلی گئی ہو۔ مگر پھر خیال آیا کہ وہ جہاں بھی جاتی کم از کم وہاں سے میرے شوہر یا مجھے اطلاع کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور پریشانی لاحق ہوئی کہ وہ صوبہ سندھ کے ایک دور افتادہ اور پسماندہ علاقے کی رہنے والی تھی۔ وہاں سے ہنگاموں میں دور و پنجاب کے اس بارون شہر جہلم کے راستوں اور گلیوں سے واقف یہ سیدھی سادھی لڑکی کتنی کسی وجہ سے گھر سے نکلی ہو تو راستہ ہی نہ بھول گئی ہو۔ وہ اردو بھی اپنی روانی سے نہیں بول سکتی تھی۔ وہ جہلم کے راستہ پوچھ سکتی تھی۔ وہ جہاں جان لڑکی تھی۔ ایک گھنٹے ہوئے ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ اسے زمانے کے شیب و فراز کا بھی پتا نہ تھا۔ وہ زمانے کے شیب و فراز سے نا آشنا لڑکی تھانے کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ یہ سوچ سوچ کر میں بے حد پریشان ہو گئی۔ دل چاہا کہ میں اپنے شوہر کو کہوں کہ وہ پولیس میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر وادیں۔ پھر سوچا پہلے مجھے خود جا کر حالات کا جائزہ لینا چاہیے چنانچہ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ تمام عزیز و اقارب اور ملنے جملنے والوں کے

موجودگی میں تھانے سے گھر آکر ہمارے کسی عزیز رشتہ دار کے گھر چلی گئی ہو۔ چونکہ میرے شوہر بھی اپنے علاقائی ورگامی کاموں کے سلسلے میں صبح کے کچھ شام کو لوٹتے تھے۔ اس وجہ سے کثیر انہیں مطلع نہ کر سکی ہو۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ کئی احوال وہ پولیس میں رپورٹ درج نہ کر سکیں۔ یہ وہ ساری تاویلیں اور غلطی تھیں جس میں آپ کو اور اپنے شوہر کو دے رہی تھی۔ مگر میری چھٹی حس بتاتی ہے کہ ان تمام تاویلوں سے مطمئن نہیں ہو پاری تھی۔ مجھے بار بار یوں لگ رہا تھا کہ کوئی ان ہوتی ہو چکی ہے۔ میرا خیال چاہر ہا تھا کہ میں ڈاکٹر جہلم پہنچ جاؤں اور خود صورت حال کا جائزہ لوں۔ میں نے کثیر کے غائب ہونے کے بارے میں ابھی اپنے کوکب ڈاکٹر سے کہا تھا کہ کوئی بات نہیں کی تھی۔

سندھ کے سیلاب سے متاثرہ علاقوں سے جہلم تک کا ہائی روڈ (بذریعہ سڑک) سفر خاصہ لمبی تھا۔ ہم لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں تھے۔ اس لیے راتے میں کھانے پینے اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے رکتے چلے آ رہے تھے۔ چھ پر ایک ایک لمحے کی دیر گراں کر رہی تھی۔ آخر اللہ کرے کہ ہم تقریباً چوبیس گھنٹوں میں جہلم پہنچے۔ تمام رکی کارروائیوں سے فارغ ہو کر جب میں گھر پہنچی تو شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ اتنے لمبے سفر کے بعد میرا جسم تھکا ہوا ہے ٹوٹ رہا تھا۔ کئی چاہتا تھا کہ بستر پر گر پڑوں اور تن تک سوئی رہوں۔ مگر کثیر کی پراسرار کشش کے باعث مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے شوہر گھر پر ہی موجود تھے۔ میں فریش ہونے کے بعد ڈرائنگ روم میں آئی تو میرے شوہر حیران پریشان بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میرے انتظار پر انہوں نے جو کچھ بتایا اسے سن کر میرے پاؤں سے تھلے زمین نکل گئی۔ انہوں نے بتایا کہ تین چار روز پہلے کثیر نے سرسری سائنس بتایا تھا کہ وہ ہمارے رشتے داروں کے گھر ایک دور روز کے لیے جایا جاتی ہے۔ میں چونکہ امدادی کاموں کے سلسلے میں صوبہ سندھ میں تھی اور میرے شوہر اپنے علاقائی ضروریات کے باعث صبح کے کچھ شام بلکدات گئے لوٹتے تھے اس لیے وہ دوسرے روز ہمارے فرحانی رشتہ داروں کے ہاں چھوڑ آئے۔ چونکہ کثیر نے ایک دور روز رہنے کے لیے کہا تھا اس لیے میرے شوہر اسے چھوڑ کر اسے کام سے نکل گئے۔ پھر وہ پولیس مصروف ہوئے کہ انہیں یاد تھی نہ ہا کہ ایک دور روز بعد سے واپس لانا ہے۔ تقریباً چار روز بعد انہیں یاد آیا کہ کثیر کو واپس لانا ہے تو وہ اپنے رشتہ دار کے گھر گئے تو وہاں ان پر یہ انکشاف ہوا کہ

177

یادش بخیر

ابوالفتح بھائی
(کراچی)

وہ میری آواز پیدا کرتا ہوا ایک دو قدم اور آگے
 بڑھا۔ "اور میرے قدموں کی آہٹ سے یہ جانتی تھیں کہ"
 ڈرتا ہوا آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ لڑکی کے



اس واقعے کو جیتے دو ماہ بیت چلے ہیں۔ میرے فکر ہونے والی اس دوستی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔
سراغ لگانا بھی نہیں چاہتا، نہ یقین کا، نہ شک کرنے کی فکر کا، کہو کہ کیا وہ کامیاب ہیں مجھے، زندگی یاد ہے گا اور
کون جانے کہ کتنی کی مجھے ساری کئی جہوں کی کمانی کی طرح اس
نام کی فرضی ہوا اور کیا وہ جو یہ سب دیکھ رہے والی ہی نہ
ہو گی کہ وہ اس کے لیے جو کچھ کرے گی وہ سب کرے گی۔

اور میرے شوہر کے جانے کے ایک گھنٹے بعد ہی بجلی گئی۔
 انھوں نے میرے شوہر کو یہ بجلی بتایا کہ اسے کچھ عیسوں کی
 ضرورت تھی۔ وہ سخت دلچسپ لڑکھنڈ تھے۔ وہ اسے گھرانے کے فرد کی
 حیثیت سے جانتے تھے۔ خود ہم نے یہی کہا کہ کرائس متعارف
 کر لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کے کہنے پر ہمیں بڑا روم دے
 دے دیے۔ انھوں نے میرے شوہر کو بتایا کہ انہوں نے یہ
 سوچ کر کثیر کو پیسے دیے تھے کہ انہیں پتا تھا کہ میں اداوی
 کاموں کے سلسلے میں دوسرے صوبوں میں ہوں اور میرے
 شوہر بھی مصروف رہتے ہیں اس لیے کسی وجہ سے کثیر کو
 عیسوں کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ اس کے بعد میرے شوہر
 جہاں جہاں بھی پتا کرنے لگے۔ وہاں سے یہی پتا چلا کہ وہ
 ہمارے ہر رشتہ دار اور اہل کار سے مختلف خطے بیانے کر کے
 اس دن ان میں شہر بڑا دور پہلے کر گئی ہے۔ اچانک میرے
 زانسن میں یہ خیال ابھرا کہ مجھے اپنے گھر کی بھی خبر سنی
 چاہیے۔ چنانچہ میں اپنے شوہر کو ساتھ لے کر گرائی خواہ کا میں
 گئی اور تجوری مٹھی تو خالی تجوری میرا من چڑھا رہی تھی۔
 تجوری میں میرے زہرات، انفر پانچ لاکھ روپے کی رقم،
 لاکھوں کے پرائز بانڈز اور دوسری قیمتی چیزیں غالب
 تھیں۔ ڈرائیونگ ٹیبل اور میزوں کی دواڑوں میں میری
 دروازہ کے استمال کی جیلری پڑی رہتی تھی، وہ بھی غالب
 تھی۔ مجھے چکر۔ آگیا اور میں بند پڑنے لگی۔ کثیر میری
 اور میرے شوہر کی عدم موجودگی میں ہمارے گھر کی تمام قیمتی
 چیزوں کا مطالعہ کر گئی تھی۔ لاکھوں روپے کی مالیت کی تو صرف
 جیلری ہی تھی۔ نقد رقم پرائز بانڈز اس کے علاوہ تھے۔
 پولیس میں رپورٹ درج کروائی گئی۔ پولیس آئی اور دیکھی
 سی کارروائی کر کے بجلی گئی۔ ہم اپنے طور پر بھی کوشش کرتے
 رہے۔ مگر کثیر کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اداوی کاموں کے سلسلے
 میں ہمارے صوبے سندھ میں پانچ لوگوں سے کافی رونا دہا
 ہو چکے تھے۔ ہم نے ان لوگوں سے بھی رابطہ کیا۔ اللہ دوا
 جا کھرائی کو بھی فون کیا۔ مگر کثیر سے بھی کوئی مثبت اور حوصلہ
 افزا جواب نہ ملا۔ بس صرف اتنا ہی پتا چل۔ کہ۔ سیلاب سے
 متاثرین کے بہرہ پر میں بہت سے جرائم پیشہ مرد اور عورتیں
 بھی ان متاثرہ علاقوں میں آ گئے۔ انہیں کراچی اور سکوتی
 لہجے سے ان کے لیے آسمان دکھانے تھے۔ مگر فلاں نہیں
 اور حق میرا ان کے لیے تو ناپ چم۔۔۔ چنانچہ وہ ناپ
 کثیر کے پاس جا پہنچا لیجئے اور پھر وہاں آنے والی فلاں

وہ تو میرے شوہر کے جانے کے ایک گھنٹے بعد ہی چلی گئی۔
 انہوں نے میرے شوہر کو یہ بھی بتایا کہ اسے کچھ عیسویوں کی
 ضرورت تھی۔ وہ دشت وارچنگ کینز کو ہمارے گھرانے کے فرد کی
 حیثیت سے جانتے تھے۔ خود ہم نے یہی کہہ کر انہیں متعارف
 کرایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے کہنے پر میں ہزار روپے
 دے دیے۔ انہوں نے میرے شوہر کو بتایا کہ انہوں نے یہ
 سوچ کر کینز کو پیسے دیے تھے کہ انہیں پتا تھا کہ میں امدادی
 کاموں کے سلسلے میں دوسرے صوبوں میں ہوں اور میرے
 شوہر بھی مصروف رہتے ہیں اس لیے کسی وجہ سے کینز کو
 عیسویوں کی ضرورت پڑ گئی ہوگی۔ اس کے بعد میرے شوہر
 جہاں جہاں بھی پتا کرنے گئے۔ وہاں سے یہی پتا چلا کہ وہ
 ہمارے ہر رشتہ دار، واقف کار سے مختلف جیلے بہانے کر کے
 دس دس، بیس بیس ہزار روپے لے گئی ہے۔ اب تک میرے
 ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ مجھے اپنے گھر کی بھی خبر کئی
 چاہیے۔ چنانچہ میں اپنے شوہر کو ساتھ لے کر اپنی خواہش میں
 گئی اور تجوری محولی تو خالی تجوری میرا منہ چڑھا رہی تھی۔
 تجوری میں میرے زہر ات، تقریباً پانچ لاکھ روپے کی رقم،
 لاکھوں کے پرائز بانڈز اور دوسری کئی قیمتیں چیزیں غائب
 تھیں۔ ڈورینگ ٹیکس اور میزوں کی دروازوں میں میری
 روڈمر کے استعمال کی چوہری پڑی رہتی تھی۔ وہ بھی غائب
 تھی۔ مجھے پتہ... آگیا اور میں بیڈ پر ڈھسے ہی گئی۔ کینز میری
 اور میرے شوہر کی عدم موجودگی میں ہمارے گھر کی تمام قیمتی
 چیزیں کاٹھیا کر گئی تھی۔ لاکھوں روپے کی مالیت کی تو صرف
 چوہری ہی تھی۔ نقد رقم اور پرائز بانڈز اس کے علاوہ تھے۔
 پولیس میں رپورٹ درج کروائی گئی۔ پولیس آئی اور میری
 سی کارروائی کر کے چلی گئی۔ ہم اپنے طور پر بھی کوشش کرتے
 رہے۔ مگر کینز کا کوئی سراغ نہ ملا۔ امدادی کاموں کے سلسلے
 میں ہمارے صوبہ سندھ میں پانچ لاکھوں سے کافی روایا
 ہو چکے تھے۔ ہم نے ان لوگوں سے بھی رابطہ کیا۔ اللہ ڈوایا
 چاکھرائی کو بھی فون کیا۔ مگر کہیں سے بھی کوئی مثبت اور حوصلہ
 افزا جواب نہ ملا۔ بس صرف اتنا ہی پتا چل سکا۔ سیلاب سے
 متاثرین کے بہرہ میں بہت سے جرائم پیشہ مرد اور عورتیں
 بھی ان متاثرہ علاقوں میں آ گئے۔ افواج پاکستان اور حکومتی
 نمائندے ان کے لیے آسماں فکار نہ تھے۔ مگر فحاشی تنظیمیں
 اور خفیہ حضرات ان کے لیے تر توالہ تھے۔ چنانچہ وہ پناہ
 گزینوں کے روپ میں اللہ ڈوایا چاکھرائی اور اس جیسے دیگر
 خفیہ خیموں میں پناہ ڈال رہے تھے۔

تھیکسوں کو اپنی جھوٹی چچی کہانیاں سنا کر ان کے دلوں میں
 ہمدردی کے جذبات پیدا کر کے، ان کا جذباتی احتمال
 کر کے ہمدردی کی آغوش انہیں لوٹ لیتے۔ جو کچھ مجھے سارا
 لوح اور بیوقوف لوگ ہوتے۔ انہیں اپنے ماں باپ، گھر بار،
 بہن بھائیوں، سب کے بارے میں یہ بتا کر کہ وہ سارے
 سیلاب میں بہہ گئے ہیں اور وہ بالکل تنہا رہ گئے ہیں کی کہانی
 سنا کر انہیں ششے میں اتار لیتے۔ تاکہ ہم جیسے لوگ انہیں اپنے
 گھر تک رسائی دے دیں۔ اور پھر وہ موقع پا کر وہاں کے گھر
 کا مکمل صفایا کر دیں اور ان کو یہ ممکن نہ ہو تو وہ اس گھر کے مکمل
 بھیدی بن جائیں اور اپنے گروہ کے لوگوں کی مدد سے وہاں
 ڈاکا ڈال دیں۔
 اب مجھے یاد آیا کہ وہ میرے ساتھ کیوں آنے کے
 لیے تیار ہو گئی تھی۔ یقیناً اس کی ساری کہانی جھوٹی تھی۔ وہ کسی
 پیشہ ور مجرموں کے گروہ کی لڑکی تھی جو اللہ ڈوایا چاکھرائی کے
 گھر میں دیگر پناہ گزینوں کے ساتھ مقیم تھی۔ اس کے گروہ
 کے ساتھیوں کو اور اسے بھی پتا تھا کہ سیلاب سے متاثرہ
 علاقوں میں ملک بھر سے فلاحی اور خیر تنظیمیں لوگ آئے
 ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ مختلف بہروپ میں مختلف پناہ گزینوں
 کے گھروں میں موجود تھے۔ جب میں نے کینز کو ساتھ لے
 جانے کے حوالے سے اپنے ساتھیوں کو بتایا تھا۔ تو بہت سے
 میرے گولیگ ڈاکٹروں نے مجھے منع بھی کیا تھا مگر مجھ پر تو
 انسانیت کے درد کا بھوت سوار تھا۔ مجھے تو ایک بے سہارا
 جانے والی لڑکی کو سہارا دینے کی ذمہ داری تھی۔ جس کی سزا
 مجھے یوں ملی کہ میں اپنا سب کچھ لانا بیٹھی۔ لاکھوں روپے کے
 زیورات، پرائز بانڈز، نقد رقم اور سب سے بڑھ کر اپنا بھرپور
 اپنا اعتماد بھی گنوا بیٹھی۔ میں اب شاید اس حد تک محتاط
 ہو جاؤں گی کہ کسی مستحق اور ضرورت مند کے کام آنے سے
 پہلے میں سو بار سوچوں گی۔
 اس واقعے کو سنے دو ماہ بیت چلے ہیں۔ میرے گھر
 میں ہونے والی اس ڈھنگ کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔
 میں سراغ لگانا بھی نہیں چاہتی، نہ ڈھنگی کا، نہ ڈھنگی کرنے
 والی کینز کا، کیونکہ کینز کا کیا سبب مجھے باز نہ کی یاد ہے گا اور
 پھر کون جانے کہ کینز کی مجھے سنائی گئی جھوٹی کہانی کی طرح اس
 کا کام بھی فرضی ہو اور کیا پتا وہ صوبہ سندھ کی رہنے والی بھی نہ
 ہو، کیونکہ یوں ویڈیو لیکچر سے جرم کرنے والے جرائم پیشہ
 لوگ بھی اپنا نام، اپنا لہجہ، اپنی آواز کر سکتے ہیں۔

پیشہ منجز

محترم مدیر اعلیٰ
 السلام علیکم!

گو کہ یہ واقعہ کافی پرانا ہے لیکن ایسا ہے کہ قارئین اس سے
 سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ گو کہ واقعہ معمولی سا ہے لیکن دل
 کی آنکھوں میں بڑھیں گے تو آنکھ بہہ اٹھ گئی۔
 ابو الفتح ہمایوں
 (کراچی)

حد نظر تک پہلے ہوئے خوش گندم کے دہیز اور شاندار
 بستر پر وہ نازک سی خوبصورت لڑکی یوں اطمینان سے سو
 استراحت تھی گویا ریشم و اطلس سے سجے آرام دہ بستر پر دنیا
 کے تمام خوف سے بے نیاز ہو کر غینہ کی وادی میں کم ہوئی
 ہو۔ فرید خان دم بخود دیکھنے کیٹ کے ایک کنارے پر کھڑا
 یہ ناخوش یقین منظر حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا آگے
 بڑھا۔ اور آگے۔ اور آگے ذہن میں سوال تھا۔ آخر یہ
 لڑکی میرے کیمت میں یوں بے خبر کیوں سو رہی ہے؟ کیا
 اسے دنیا کا کوئی ڈر نہیں؟
 وہ بیروں کی آواز پیدا کرتا ہوا ایک دو قدم اور آگے
 بڑھا۔ اور میرے قدموں کی آہٹ سے یہ جاگتی کیوں نہیں؟
 ڈرتا بھجکتا آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ لڑکی کے



قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے زور سے ہر کوڑھین پر مارا لیکن لڑکی اب بھی نہیں جاگی تو فرید خان چونک گیا اور جھٹکے سے بچے پانچے اسے اچانک بجلی کا جھٹکا لگا ہوا یا پھونکنے ڈنک مارا۔ لڑکی اس عالم بے ہوشی سے منہ موڑ چکی تھی۔

فرید خان اچانک واپس مڑا۔ اس کی حالت اسی میں تھی کہ موقد واردات سے فرار ہو جائے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا، وہ رک گیا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

ہوں۔ اس کے غمیرنے شاید سرزدش کی کہ لڑکی کو اس حال میں چھوڑ کر کہا جاتے ہو؟ وہ لاش کے قریب آیا اور غور سے اس کا جائزہ لینے لڑکی کے جسم پر عمروزش خراش کا جتنی لہاس تھا۔ جگے جگے دو چار زیورات بھی منبوج تھے۔ ہاتھوں میں رہتی ہندی اور بالوں میں گڑھی کیا اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ عروس تو بہار ہے۔

فرید خان مسلسل سوچ رہا تھا کہ آخر یہ لڑکی کون ہے جو گزرتی تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے ایک ایک فرد کو خوب اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا۔ بلکہ اس پاس کے دو چار اور گاؤں کے لوگوں سے بھی کافی حد تک واقف تھا۔ چودہ سال قبل جب وہ اپنے قریبی شہر ساہیوال میٹروک کا امتحان دینے گیا تھا تو اسے شہر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے گھوم پھر کر ساہیوال شہر کو دیکھا جہاں زمانے میں ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ شاید اس لڑکی کو کہیں شہر میں دیکھا ہو لیکن کافی دماغ سوزی کے باوجود اسے کچھ بھی یاد نہ آیا۔ اور بھلا اگر دیکھا بھی ہوتا تو اسے عمر سے بعد پہچانتا کیسے؟ اس وقت تو وہ لڑکی بھی بمشکل سات آٹھ سال کی ہوئی۔

نہ جانے کون تھی بے چاری؟ خدا معلوم بد نصیب کہاں سے آئی تھی اور کہاں جا رہی تھی؟ اسے کس نے قتل کیا اور کیوں؟ بے شمار سوالات تھے جو فرید خان کے ذہن میں گھبرا رہے تھے، لیکن کسی بھی سوال کا جواب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

گاؤں بھر میں ایک ہنگامہ مچا تھا۔ فرید خان کا کھیت چاروں طرف سے یوں گھیر لیا گیا تھا جیسے کسی خطرناک معرکت کو گرفتار کرنا مقصود ہو۔ دیوے لائن پر بھی لوگ اکھٹے ہوئے تھے، لیکن کسی بھی سوال کا جواب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

فرید خان کون ہے؟ فرید خان بے بسی کی تصویر بن کر کھڑا تھا۔ ہر شخص لہجہ طعن کر رہا تھا اور فرید خان کی قوت ترکرنے کے لیے تھوکت لگتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ اسے کچھ نہیں معلوم لیکن کوئی بھی اس کی بات کا یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ فرید خان کو دردہ کر اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ کیوں خود بخود اتنی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ اگر وہ فوراً ہی گاؤں کے سربراہ آوردہ لوگوں کو آگاہ کرتا تو شاید شک و شبہ کا اتنا زیادہ نشانہ نہ بنتا۔

فرید خان اچھے یہ بات بتانی پڑے گی کہ اس لڑکی سے تیرا کیا تعلق تھا اور تو نے اسے اس بے دردی سے کیوں قتل کیا؟ گاؤں کے چودھری ریاست علی کا خاصہ شہرت کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے فرید خان کو انتہائی نفرت سے گھورا اور خوں بارنگہ ہیں ڈالنا ہوا اس پر اس تیزی سے چھٹا مویا اسے چاہا جائے گا۔

یہ حملہ اگرچہ بے حد ہنگامہ آویز تھا لیکن فرید خان کے لیے اس موقع پر خاموش رہنا ہی مناسب تھا۔ اس وقت چودھری کی مخالفت اسے بے حد مشکل پڑ سکتی تھی۔

”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ فرید خان ہی اس حادثے کا ذمہ دار ہے۔“ گاؤں کے حکیم صاحب نے بیس میں چنگاری ڈالی۔ وہ کافی عرصے سے فرید خان پر تباہ کھائے بیٹھے تھے جس نے ان کی بیسیس جیسی موٹی سیاہ اور پھو پڑی سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ”غضب خدا کا! بیس سال کی عمر ہوئی۔ آخر وہ شادی کیوں نہیں کرتا؟“

”حکیم صاحب! میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں۔ اگر آپ میری طرف سے بدگمان ہیں تو کم از کم اس معصوم مردہ لڑکی کی بے حرمتی تو نہ کریں۔“ فرید خان رو پٹنا ہو گیا۔

”خیر خیر۔ بات کو زیادہ بڑھانے کی ضرورت نہیں۔“ چودھری ریاست علی نے دونوں کو خاموش کر لیا۔ ”بہتر یہی ہے کہ تھانے میں رپورٹ کر دی جائے۔ پولیس والے خود ہی جھوٹ اور سچ کا پتا چلائیں گے۔“

☆☆☆

انسپکٹر صولت حسین اپنی تفتیشی ٹیم کے ہمراہ جائے وقوع پر پہنچ چکا تھا۔ گاؤں کے معززین ایک بار پھر فرید خان کی طرف سے تفتیشی ٹیم کے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔

کا جائزہ لیا۔ آپس میں کھینک نام و نشان نہیں تھا۔ فرید خان نہایت اداس اور ممکن ایک کونے میں کھڑا تھا۔ لوگوں کے جبر سے فرید خان کو طوم بنار ہے تھے۔ حالات و شواہد کی روشنی میں انسپکٹر صولت حسین بھی مجبور تھا کہ فرید خان کو ہی لازم غمہ آ کر تفتیش کا دائرہ آگے بڑھائے۔

”فرید خان! صورت حال تمہارے خلاف ہے۔ موجودہ حالات میں تمہیں گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے، اب عدالت میں کہنا۔“ انسپکٹر صولت حسین نے اپنے نائب کو اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر فرید خان کے ہاتھوں میں جھڑی ڈال دی۔

”انسپکٹر صاحب! آپ نے ابھی لڑکی کی لاش کا مکمل معائنہ نہیں کیا ہے۔ کیا یہ بھتر نہیں ہوگا کہ آپ پہلے اس طرف توجہ دیں؟“ چودھری امید علی نے ایک بے حد اہم بات کی طرف انسپکٹر کی توجہ مبذول کرانی۔

”آپ کا کیا خیال ہے میں یہاں بونجی جھک مارنے آیا ہوں؟“ انسپکٹر نے واقعی اب تک لڑکی کی لاش کو نہیں چھیڑا تھا لیکن چودھری نے جب یاد دلایا تو اس کی افسرانہ شان کو نہیں بچھا۔ اپنی روایت و عادت کے ساتھ اس نے چودھری کو جھڑک دیا۔ ”مجھے اپنے فرائض بخوبی معلوم ہیں۔ آپ کو دلغی اعلازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

چودھری شہنشاہ کرکٹیں جھانکے لگا۔ گاؤں والوں کے سامنے اس کی بے عزتی ہوئی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی اس گستاخی پر وہ زبان گدلی سے کھینچ دیتا لیکن ایک ایسی اشرک و وہ بھلا کیسے مزاح سے سکتا تھا۔ اپنی تذلیل پر وہ اپنا دل سوس کر رہ گیا۔

انسپکٹر صولت حسین ایک سپاہی کے ہمراہ آگے بڑھا اور لڑکی کی لاش کوالت پالت کر دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی کے جسم پر زخموں کے نشان تلاش کر رہا تھا۔ چھ منٹ گزر گئے لیکن وہ ایسا کوئی نشان تلاش نہ کر سکا۔ اس کے پیچھے پر لگے کے چار نمودار ہوئے گئے۔ وہ معززین کی جانب مڑا۔ ”لڑکی کے جسم پر کہیں بھی چوٹ، زخم یا لکھڑا نشان نہیں ہے۔ صرف ایک اور جگہ پر معمولی سی خراشیں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی کانٹے دار چھڑی سے کھرچا گیا ہو۔“ انسپکٹر کے بیان پر سب لوگ آکھٹ بدعلائ ہو گئے۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر اسے قتل کیسے کیا گیا؟“ انسپکٹر صولت حسین نے اپنی تفتیشی ٹیم کے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔

”میں اس امکان کا بھی جائزہ لے چکا ہوں۔ لڑکی کے گلے پر کوئی نشان نہیں ہے۔“ انسپکٹر صولت حسین نے ایک اور حیرت انگیز انکشاف کیا۔

ایک ایک تین چار بڑے لوگ آگے بڑھے اور اپنے اپنے طور پر کوئی سراغ پانے کی کوشش کرنے لگے لیکن جلد ہی ہاتھس ہو کر واپس اپنی جگہ پر آ گئے۔ سب کے سب غرور مند تھے کہ یہ ممکن ہے کہ کسی کوئی کر دیا جائے اور جھوٹ کے جسم پر کوئی نشان نہ ہو۔ ایسا تو صرف زہر خورانی سے ہی ہو سکتا ہے لیکن ایسے بھی کوئی آچر نہ تھے۔ نہ منہ پر جھاگ تھا اور نہ جسم نیگلوں تھا۔

”لڑکیاں بڑے کمزور دل والی ہوتی ہیں۔ ممکن ہے فرید خان نے کوئی ایسا سفاکانہ سلوک کیا ہو جس کی وجہ سے اس نے چاری کی حرکت قلب بند ہوئی۔“ حکیم صاحب بہت دور کی کوڑی لائے۔ فرید خان سے ان کی نفرت بدستور باقی تھی۔

”ہم تحقیقات کے دوران اس امکان کو بھی پیش نظر رکھیں گے۔ فی الحال پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بغیر کوئی حتمی رائے نہیں کاہم کی جاسکتی۔“ انسپکٹر صولت حسین نے ایک فارم پر چار معززین کے دستخط لیے اور تفتیشی ٹیم لاش اور طوم فرید خان کو ہمراہ لے کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔

فرید خان جیل کے اندر بھی ایک مذہب میں جھکا تھا۔ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا اور پولیس اس کو تباہی کا بکرا بنانے پر تکی ہوئی تھی۔ فرید خان کو یقین تھا کہ اگر حکیم صاحب اس قدر رشددہ کے ساتھ اس پر الزام نہ دھرتے تو پولیس انٹی آسانی سے اسے جیل میں نہ ڈالتی۔

حکیم صاحب زمیندار چودھری امید علی کے صاحب خاص تھے اس لیے چودھری کے کان بھرنے کے لیے ان کے پاس کافی مواقع تھے۔ ان کی چرب زبانی نے آخر رنگ دکھایا اور فرید خان چودھری کی آنکھوں میں ٹپکتے لگا۔ چودھری کا بڑا ذوق کیکر رفتہ رفتہ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی فرید خان سے کٹر آنے لگے۔ بھلا وہ چودھری کی مرضی کے بغیر کیسے چل سکتے تھے۔ نتیجتاً کوئی بھی فرید خان کو رشددہ دینے پر راضی نہ ہو رہا تھا۔ فرید خان نے بھی تہہ کر لیا تھا کہ چاہے اسے زندہ بھر کھار دیا جائے۔ وہ حکیم صاحب کی بیٹی سے ہرگز ہرگز شادی نہیں کرے گا۔ اس کے دل میں چودھری امید علی اور حکیم صاحب کے خلاف نفرت کا ایک سمندر موجزن تھا۔

نرسین برق رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ وہ کھل اور باوقاری لڑکی اپنی نشست پر مسمی تھی۔ وہ یقیناً کچھ سوچ رہی تھی۔ چند ہی روز قبل اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہوئی تھی اور اب وہ شادی سے فارغ ہو کر تھوڑا سا لاہور جا رہی تھی۔ شوہر اپنے ساتھ لے کر آیا تھا چونکہ وہ زیادہ دن ٹھہر نہیں سکتا تھا اس لیے شادی میں شرکت کے دوسری ہی روز وہ واپس چلا گیا تھا اور اب عمرائش کو اکیلے ہی واپس کاسٹریٹ کرنا تھا۔

سباوہال کا اسٹیشن گزر چکا تھا۔ عمرائش کچھ دیر تو اپنی نشست پر بیٹھی رہی اور پھر تنگ آ کر دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ تازہ ہوا کے جھوٹے اس کے دل و دماغ کو معطر کر رہے تھے اور اس پر نئے کی کیفیت طاری تھی۔

سرشاری کا پریک عالم اس کے پورے وجود پر عکس ہوا تھا جسے وہ خود کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔ منزل قریب آنے کی سرستی اور اپنے خوابوں کے شہزادے سے ملنے کا سرور اس کے ہوش و خرد اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ دروازے کے پچھلے کچھ دووں چنل تھا سے دنیا سے بے خبر کھڑی تھی۔ اس کا معصوم ذہن مسرت و شادمانی کے جذبات سے معمور دور کھیں خلاؤں میں گویا ہوا تھا۔

اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پشت پر تھہر اپنی ہڈی ہو گیا ہو۔ ایک شدید ہلکی ضرب نے اس کے ہوش و حواس معطل کر دیے اور اگلے ہی لمحے وہ معمولی طور پر فضاؤں میں پرواز کر رہی تھی۔ ریلوے کپارٹمنٹ کے بھاری بھر کم کھلی دروازے سے بے پناہ قوت کے ساتھ مراندگی کے زم و نازک سے جسم کو یوں فضا میں اچھال دیا تھا جیسے کوئی خوفناک آئندہ خیم و خاشاک کو اڑا کر لے جاتی ہے۔

عام طور پر ریلوے کپارٹمنٹ کے دروازوں میں نیچے کی طرف ایک ابھری ہوئی موٹی کیل نصب ہوتی ہے جو دروازے کو کھولنے کی ایک خلیب میں جا کر اکٹھ جاتی ہے لیکن اس کپارٹمنٹ کا وہ قفل شاید کبھی طور پر کام نہیں کر رہا تھا یا پھر لڑکی سے دروازہ چپک کر نے میں کوئی کوتاہی ہو گئی یا اس کی تھہری میں ہی کھسکا تھا۔ فلیب لڑکی کے لیے یوں فضا میں پرواز کرنے کا یہ عملی تجربہ بہت ہی بھانک اور دہشت آمیز تھا لیکن ان سبب اور اذیت ناک محسوس نے جلد ہی اس کی جان کی کیفیت سے نجات دلا دی۔ اس کی درجہ نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ حالت غارتگی میں

فضاؤں میں بھولتا رہا اور پھر ایک کھیت میں جا کر گمدم کی لعل کی کٹائی ہو چکی تھی۔ ہر طرف گمدم کے ڈھیر چاہے جا چکے ہوئے تھے۔ وہ بے روح جسم ایک ایسے ہی ڈھیر پر آن کر گمدم کے شاعرانہ بستر پر لیٹا اور ہوا کی جیسے قدرت نے یہ خاص بستر صرف اسی کے لیے بچا کر تیار کیا ہو۔ چند ایک سخت ریشتوں نے اس کے جسم پر دو چار خراشیں ڈال دی تھیں لیکن مجموعی طور پر بدن بالکل نیا تھا۔ دور سے دیکھنے والے کو یہ نظارہ بے حد دلچسپ نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی خوش اندام حسینہ خواستہ احسن ہے مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر عجب حسن سلامت تھا۔ اس کا دلکش قد و قامت اس قدر پروقار تھا کہ نرسین خان بھی پہلی نظر میں مرعوب ہو گیا۔ اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ آگے بڑھ کر اس حسینہ کے آرام میں بیٹھ جائے۔

کپارٹمنٹ میں ایک عجیب سی آفراتفری مچا ہوئی تھی۔ چوٹی اسٹیشن آنے ہی والا تھا۔ وہاں اترنے والی خواتین اپنا سامان اور بچوں کو سنبھالنے میں مصروف تھیں۔ انہیں کسی اور طرف دھیان دینے کی فرصت نہ تھی۔ وہ خواتین جنہیں چوکی میں نہیں اترنا تھا وہ خود وہنگے اور سامان کی اٹھاپچک کی وجہ سے کافی پریشان تھیں۔ ڈبے میں ہر طرف ایک کھرام سا چاچا ہوا تھا۔ ایسے میں کسی کا دھیان اس طرف کیا ہی نہیں کرساں ڈبے میں سے ایک حرامی نصیب کم ہوئی ہے۔ ہر عورت اپنی ہی دھن میں کھنکھاتی اور اگر بعد میں کسی نے اس کے بارے میں سوچا ہوگا تو یہی کچھ کر رہ گئی ہوگی کہ شاید چوکی ہی اس کی منزل مقصود ہو۔

لیکن کپارٹمنٹ کے ایک سرے پر بیٹھی ایک فربہ اندام اور پر شکوہ شخصیت بیگم آباد حسین کی دور رس نگاہیں مسلسل اسی لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کم گو اور کم آواز خاتون تھیں لیکن ان کے دل میں یہ خواہش بڑی دیر سے بھج رہی تھی کہ وہ لڑکی ان کے پاس آ کر بیٹھے اور ان سے باتیں کرے۔ ابھی بیگم آباد حسین ارادہ ہی کر رہی تھیں کہ وہ لڑکی کو اپنے پاس بلا لیں کہ وہ لڑکی ان کے جذبات سے بے خبر اپنی دھن میں مسرت دروازے کے پچھلے کچھ دوں چنل چا کھڑی ہوئی۔ اسے کیا خبر کہ وہ باہر کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے نہیں بلکہ موت کا نظارہ کرنے جا رہی ہے۔ بیگم آباد حسین کی نگاہیں مسلسل اس لڑکی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اس جانکاہ حادثے کو دور رخ پڑے ہوئے انہوں نے چشم حیرت

حادثہ ان کے دل و دماغ پر بجلی بن کر گر لیا لیکن وہ کفری کیا حتیٰ تھیں۔

انہوں نے اس پورے دلدزدہ منظر کو ایک پارا ہے چشم تصور سے دوبارہ دیکھا اور سوچ میں پڑ گئیں کہ اس حادثے پر وہ کیا رد عمل ظاہر کریں۔ پہلا خیال جوان کے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ شاید کچھ کر ٹرین کو روکا جائے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھیں لیکن پھر فوراً ہی وحش سے چند گھبراہٹیں۔ انہوں نے آن کی آن میں اپنی اس جھجک بڑھوتری کو دیکھا تھا۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ اگلے اسٹیشن پر کس ریلوے اسٹیشن کو اس حادثے کی خبر دے دیں گی لیکن اگلے اسٹیشن آتے آتے انہوں نے اس خیال کو بھی مسترد کر دیا۔ انہوں نے انتہائی سوچ و بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہیں گی۔ خواہ مخواہ مصیبت کو دعوت دینا کہاں کی گھنڈی ہے۔ وہ لڑکی تو اپنی جان سے کٹی۔ اب اگر وہ کسی کو کچھ بتاتی ہیں تو پولیس کی تفتیش اور عدالت کے چکر ان کی گھر کی زندگی کو بظاہر بنا کر رکھ دیں گے۔ خاموش رہنے میں ہی بھلائی ہے۔

☆☆☆

پشاور ریلوے اسٹیشن پر خبریں خالی ہو چکی تھیں۔ تمام مسافر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے اور خاکروب خالی ڈبوں کی صفائی کر رہے تھے۔ فرسٹ کلاس لیڈ پر کپارٹمنٹ میں ایک برقعہ کے نیچے ایک سوٹ میں رکھا ہوا تھا۔ شاید کوئی مسافر اپنا سامان بھول گیا تھا۔ خاکروب نے فوراً اسٹیشن ماسٹر کو اطلاع دی اور سوٹ کس کے مالک کی تلاش ہونے لگی۔ کئی گھنٹوں بعد بھی جب کچھ پتا نہ چلا تو اسٹیشن ماسٹر نے وہ سوٹ کس ریلوے پولیس کے حوالے کر دیا۔

ریلوے پولیس کے دفتر میں بھی وہ سوٹ کس کئی دن پڑا اور کئی کوئی بھی اس کی تلاش میں نہ آیا۔ بالآخر اسے اسی آئی نادر سے ملے۔ اس کا تالا توڑا گیا۔ تالا کھلا گیا تھا کہ اندر سے کوئی نہ تو کئی ایسا سراغ اچھٹا جائے گا جس کے ذریعے سوٹ کس کے مالک کا پتا چل سکے۔

سوٹ کس کے اندر چند زمانہ کپڑوں اور دو چار کتابوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس ایک انتہائی دیدہ زیب ڈائری بھی دستیاب ہوئی جس میں کئی عمل اور نام عمل غزلیں اور نظمیں تحریر تھیں۔ ڈائری کے پہلے صفحے پر بڑی ہی خوبصورت اور عجب تحریر میں عمرائش کا نام تحریر تھا اور غزلوں کے مطلع میں بھی کئی کھلیں استعمال کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ

شعر و سخن کا مجموعہ وقت رکھتی ہے۔ اس ڈائری میں کئی کئی نیا نہیں لکھا تھا لیکن تحریر اور نام کے ذریعے اس بات کا پتا چلتا تھا کہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اسے اس آئی نادر سے تحریر کے نمونے اخبارات کو فراہم کر دیے اور ساتھ ہی اس مضمون کا ایک اشتہار بھی دے دیا کہ عمرائش کی زبان کے سر پرست جلد از جلد پشاور ریلوے کے اسے اس آئی نادر سے رابطہ قائم کریں۔

☆☆☆

عمرائش خاتون اور سلطان جہاں آپس میں خالہ زاد بہنیں تھیں۔ تقسیم کے نور ابدان کے والدین گراہی آگئے۔ ہمیں ان دونوں بہنوں کی شادیاں ہوئیں۔ عمرائش خاتون تو لاہور سدا رہیں کیونکہ ان کے شوہر وہاں کے ایک اچھا چال میں ڈاکٹر تھے اور سلطان جہاں کے شوہر اسی محلے کے گراہی میں ہی اپنا اپورٹ ایکسپورٹ کارپس کو مل لیا۔

چونکہ دونوں شادی تک ایک ساتھ رہی تھیں۔ اس لیے ان کے آپس میں مرہم بھی خوشگوار تھے۔ وہ دونوں ہمیشہ کم اور سہیلیاں زیادہ تھیں۔ شادی کے دو سال بعد ہی عمرائش خاتون ایک بچے کی ماں بن گئیں جس کا نام لعل میر رکھا گیا۔ دوسری طرف پانچ سال کے طویل انتظار کے بعد سلطان جہاں کی مراد بھی پوری ہوئی اور ایک بچی کی ان کی گود میں مسکرانے لگی۔ عمرائش کے آجانے سے ان کے گھر کا کونہ کونہ جھگڑنے لگا۔ دو سال بعد وہ بھی ان کی زندگی کی خوشیوں میں اضافہ کرنے کے لیے آگئی۔ ان دونوں نے مل کر سلطان جہاں اور احسن علی کی زندگی میں رنگ ہی رنگ بکھیر دیے۔

دونوں بہنیں اپنی اپنی زندگی میں کتنی تھیں لیکن آپس میں فحون اور غلطی کے ذریعہ رابطہ کرتی تھیں۔ فیصل میراب میٹھیل کے آخری سال میں تھے اور عمرائش کی اسے آئندہ کرنے کے بعد شعر و ادب کی دنیا میں اپنی گریز کی خوشبو بکھیر رہی تھیں۔ اچانک ایک روز عمرائش خاتون کو خیال آیا کہ اب ان کے گھر میں بہو آئی چاہے۔ انہوں نے اپنے شوہر ڈاکٹر ختم میر سے مشورہ کیا اور پھر پہلے ہی میٹھیلوں پر فیصل اور عمرائش کے رشتے کی بات بٹے لگی۔

ایک سال بعد عمرائش اور فیصل کی شادی نہایت تزک و احتشام سے ہوئی۔ عمرائش کے والد احسن علی نے اس تقریب کے کئی کیسٹ بنوائے اور فرست کے اوقات میں

ایک اچھے اور دیانت دار شہری ہونے کے ناتے ہمارا فرض ہے کہ ہم قانون اور نظم و نسق چلانے والے اداروں سے تعاون کریں۔ اگر ہم کچھ غلط ہو تا ہوا دیکھ رہے ہیں تو مختلف افسران کے علم میں یہ بات لانی چاہیے۔ اسی طرح ہمارا معاشرہ برائیاں سے پاک ہو سکتا ہے۔ ”آباد حسین صاحب نے بڑے دل نشیں انداز میں اپنی بات کو یہ بات سمجھائی۔ ”آپ نے بہت صحیح کہا۔“ بیگم صاحبہ نے خرمندی سے کہا۔ ”لیکن اب کیا کیا جائے؟ وہ وقت تو گزر چکا۔“ ”کچھ بھی نہیں ہوا۔ دیر آید درست آئے۔ خدا نے اس لوگوں کی ضرورت مدد کی ہوگی۔“ آباد حسین نے اپنے دل کو دلاسا دیا۔ ”کل صبح ہم دونوں تھانے چلتے ہیں۔ وہاں آپ تمام باتیں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیں۔ شاید آپ کے چشم دید کوئی پولیس والوں کے کچھ کام آسکے۔“ انہوں نے بیگم صاحبہ کا اشارہ کیا اور دونوں گھر کی طرف چل پڑے۔ اب بیگم صاحبہ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ ان کی شرفی اور چلبلاہن وانہیں آگیا اور وہ کراچی میں گزرتے ہوئے وقت کی باتیں انتہائی دلچسپ میراٹے میں بیان کرنے لگیں۔ لیکن اب آباد حسین صاحب کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا ذہن تو نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔

انجیکر صولت حسین کی تعیناتی کا یہ دوسرا روز تھا۔ کافی دیر صبح کے بعد اس کا چادر شہری علاقے میں ہوا تھا۔ وہ بٹھاروڑ نامیہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں مسکرت دلی ہوشی تھی جسے جانے کے لیے ابھی اس نے ہاتھ ماچس کی جانب بڑھائے ہی تھے کہ چراسی نے ایک اوجیز عمر جوڑے کی آدھی اطلاع دی۔ صولت حسین کی پیشانی پر ہل پڑ گئے۔ پھر ایک حکانک شان کے ساتھ اس نے گردن کو اثبات میں حرکت دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ فریادیوں کو حاضر کیا جائے۔

”اسلام بیگم صاحبہ عالی!“ اندر داخل ہوتے ہی آباد حسین صاحب نے اپنی مخصوص رعب دار آواز میں سلام عرض کیا۔ ”بیگم السلام!“ صولت حسین نے ان کو سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد اندازہ لگا کر موصوف شریف ایک بیگم پانچ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔“ فرمائیے اکیسے؟

”بات یہ ہے کہ میں ایک بہت ہی نازک مسئلے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے آیا ہوں۔ ذرا توجہ سے سنئے گا۔“ آباد حسین صاحب کے چہرے پر احتیاطاً شاید قانون کی مدد کرنے کے بغیر تصور سے ان کی شخصیت میں غرور و فخر کی آمیزش شامل ہوئی تھی۔ ”بات یہ ہے کہ چند روز قبل میری بیگم خیر مسٹل کے ذریعے کراچی بسنے لاہور آ رہی تھیں۔ ان کے کپارٹمنٹ میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی، جو اچانک ایک حادثہ کا شکار ہو گئی۔ میری بیگم چشم دید گواہ ہیں اور یہ اسی بارے میں آپ کو تفصیل سے آگاہ کرنا چاہتی ہیں۔“

انجیکر صولت حسین کو اچانک ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اپنی کرسی سے نکلتے اٹھ کھڑا ہوا۔ معزز مہمانوں کو کرسی پریشانی اور پھر برا دراست بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں! اب آپ بے کم و کاست تمام واقعہ بیان کریں۔ آپ نے کیا دیکھا؟“

”میں تنہا کراچی سے لاہور آ رہی تھی۔ میرے شوہر میرے ساتھ نہیں تھے۔ رات کے تقریباً آٹھ بج رہے تھے۔ وہ لڑکی کپارٹمنٹ کا دروازہ کھولے دونوں طرف کے پینڈل پکڑ کر عین درمیان میں کھڑی تھی اور پھر میں نے وہ عجیب قیامت خیز منظر دیکھا جس کے تصور سے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔“ بیگم صاحبہ نے ایک پکڑ سوز سلی کی اور پھر روہال سے اپنی ناک صاف کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔ ”میں نے دیکھا کہ وہ بھاری بیگم خیر دروازہ تیزی سے لڑکی کی پشت کی طرف بڑھ رہا ہے اور کل اس کے کے میں کچھ کچھ سنی، وہ بد نصیب لڑکی انسانی کینیا نیوں میں آٹا ٹاٹا کہیں گم ہو گئی۔“ بیگم صاحبہ ایک بار پھر غمزہ ہو گئیں۔

”یہ کب کا واقعہ ہے اور وہ کون سی جگہ تھی جہاں آپ نے لڑکی کو زمین سے گرتے دیکھا؟“ صولت حسین کی بے چینی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور وہ کسی حادثے کی گمشدہ کڑیاں ملاسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ بیس اگست کی بات ہے۔“ بیگم صاحبہ نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈبے میں زبردست بڑ بونگ کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ ساہیوال انجیشن آنے والا تھا۔ وہ لڑکی بھی کراچی ہی سے سواہر ہوئی تھی لیکن سفر کے دوران ہم دونوں میں بات چیت نہیں ہوئی۔ بہر حال آٹھ گھنٹے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی کسی دوسری گھونٹ میں کھڑی تھی۔“

عورت وہاں آ رہی تھی۔ ٹرین جب دوبارہ چلنے لگی تو وہ لڑکی اپنی نشست سے اٹھ کر دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ ٹرین اب پوری رفتار پکڑ چکی تھی اور وہ لڑکی دونوں طرف کے پینڈل پکڑے بدستور دروازے میں کھڑی تھی اور اچانک میں نے روح فرسا منظر دیکھا جس کو میں دہرائانا نہیں چاہتی۔“ بیگم صاحبہ کی آواز ایک بار پھر رنڈھ گئی۔

انجیکر صولت حسین کو یاد آیا کہ وہ ان دنوں ساہیوال میں ہی تعینات تھا اور محبت میں پائی جانے والی لڑکی کی لاش کی حقیقت اسی نے کئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس سلسلے میں فریڈ خان نامی ایک شخص کو گرفتار کیا گیا تھا جس کے کھیت میں وہ لاش پائی گئی تھی۔ صولت حسین کا ساہیوال ہی سے چادر لاہور ہوا تھا، جس کے لیے وہ کافی دنوں سے تک دو دو کر رہا تھا۔ لاہور آ جانے کے باوجود اس مقدمے نے اس کا چہرہ نہ چھوڑا اور ساہیوال تھانے سے کوئی نہ کوئی آدمی اس بارے میں کوئی نہ کوئی معلومات لے کر یا پتی معلومات لینے اس کے پاس جاتا۔

لیکن اب بیگم آباد حسین کی چشم دید گواہی کے پیش نظر اسے ایک نیا راستہ دکھلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کیس کے سلسلے میں اس پر جو بڑا قہار و ختم ہو سکتا تھا اور سب سے بڑی بات کہ خود ہی ایک عجیب سی الجھن اور ذہنی کوفت سے نجات مل سکتی تھی۔ اور اب اسے فریڈ خان کا خیال ستا رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ فریڈ خان بے گناہ ہے۔ شاید اس کی بے گناہی نے ہی اس اتفاق کو جنم دیا تھا۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے کی صورت میں اس کے ترقی کے بھی امکانات تھے۔ وہ اس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ آباد حسین صاحب کی آواز اس کو جھٹکا تھا۔

”مشور کیا سوچنے لگے؟ کیا ہم لوگ اب جاسکتے ہیں؟“ آباد حسین صاحب کی چہرہ تھے۔

صولت حسین کو اچانک یاد آگیا کہ وہ ایک ڈنڈہ دار افسر ہے اور اسے ابھی دونوں میاں بیوی سے بہت سے سوالات کرنے ہیں۔ وہ بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں تو آپ نے بتایا کہ وہ لڑکی آپ کے سامنے حادثے سے دوچار ہوئی۔ آپ یہ بتائیں کہ اس حادثے کے فوراً بعد آپ نے کیا قدم اٹھایا؟ کیا آپ نے کسی ذمہ دار افسر کو اطلاع دی؟ کیا آپ نے اپنی فریڈ خانے میں رپورٹ درج کرائی؟“ صولت حسین وہی سوالات اٹھارہ تھا جن کا

”حقیقت یہ ہے کہ اس حادثے کو دنوں مذہم ہوتے دیکھ کر میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل مفقود ہو کر رہ گئی۔ بعد میں جب ہوں دو حواس بجا ہوں تو کچھ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ جب میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس کو دلہ و دلسائے کا کسی سے ذکر نہ کیا جائے۔“ بیگم صاحبہ نے دھجے اور افسردہ لہجے میں اپنی کوئی ہی کا اقرار کیا۔

دونوں طرف کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر آباد حسین گویا ہوئے۔ ”دراصل میں چند دنوں سے غصوں کر رہا تھا کہ بیگم جب سے کراچی سے آئی ہیں، کچھ اداس اداس اور کھوئی کھوئی رہنے لگی ہیں۔ بالآخر کل شام میں نے ان سے یہ راز اٹھوا ہی لیا۔ اور یہ بھی میرے ہی سمجھانے بجھانے کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے آپ کو حقیقت بتا دی ہے۔“

ابھی آباد حسین صاحب کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ باعجب صوبیدار ایک اخبار لے کر آئے اور اسے ہوا اور ایک اشتہار کی طرف صولت حسین کی توجہ مبذول کرانی۔ اشتہار پر نظر پڑتے ہی صولت حسین حواس پانچ نظر آنے لگا۔ اسے اشتہار اور بیگم آباد حسین کے بیان کا سلسلہ ایک دوسرے سے منسلک دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈال کر واقعات کی کڑیاں ملائی شروع کیں۔ لڑکی جب حادثے سے دوچار ہو گئی تو لاوارث ہوئی کس آخری انجیشن پٹا اور تک جا پہنچا جہاں ریلوے پولیس نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ صولت حسین نے آباد حسین صاحب سے ان کا پتالیا اور ان لوگوں کو یہ کہہ کر جانے کی اجازت دے دی کہ ضرورت پڑنے پر ان کو پھر تکلیف دی جائے گی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے فوری طور پر اسے ایس آئی پٹا اور ریلوے پولیس ٹاور شیڈ سے رابطہ قائم کیا۔ فیس کے ذریعے ٹاور شیڈ نے خزانہ گس کی تحریر کے دو نمونے صولت حسین کو روانہ کر دیے۔ اور اگلے ہی دن صولت حسین نے لاہور سے شائع ہونے والے ایک روزنامے میں ایک اشتہار شائع کر دیا۔ اس اشتہار میں عراند گل کے ساتھ گزرنے والے حادثے کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ اگرچہ صولت حسین کو پورا یقین تھا کہ عراند اور حادثے کا شکار لڑکی ایک ہی شخصیت ہے لیکن پھر بھی ابھی اس کے پاس عملی شہاد اور ثبوت نہیں تھے اور قانون ثبوت مانگتا ہے۔ ابھی اس کو اس مسئلے میں حیرت تک دو کر گئی تھی۔

ڈاکٹر فیصل نے رے، علامہ اقبال پیردنی دروازے سے دسمبر 2022

اخبار افشاں اور اپنے کمرے میں آکر اخبار پڑھنے لگا۔ پہلا صفحہ اچھی طرح دیکھنے کے بعد اہم خبروں کے بقیہ صفحے پڑھنے کے لیے اس نے جیسے ہی آخری صفحہ دیکھا تو اچانک ہی اس کی تنگی مٹ گئی۔ صفحہ کے مین درمیان کالم نمبر تین اور چار پر ایک ایک باکس کے اندر عمران کی تحریر نمایاں انداز میں شائع کی گئی تھی۔ آخر عمران کی غزل اسے بھرپور انداز میں کیوں شائع ہوئی ہے؟ اسے تو نام و نمود سے کوئی وجہ بھی نہ تھی؟ وہ صرف اپنی ذہنی صلاحیت کو نکھارنے کے لیے اور اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اپنی ڈائری بھرتی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ پیروں میں تسکین دہانگی اور اس نے دوبارہ اخبار مضبوطی سے قلم کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے جلدی جلدی پورا مضمون پڑھ ڈالا۔ اشتہار ایک گمشدہ بلکہ دریافت شدہ سوٹ کیس کے بارے میں تھا جس کے اندر رکھی ہوئی ڈائری میں سے یہ غزل برآمد ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی وہ بے ہوش ہوا جائے گا۔ اس خبر کے اندر یقیناً کوئی بے باک راز پوشیدہ تھا۔ کوئی ایسی بات جو اس کا ذہن جلیں کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کرنے لگا۔ نہیں، یہ سب صرف میرا وہم ہے۔ عمران یقیناً خیریت سے ہو گیا۔ میں پاگل ہوں جو ایسے غلط خیالات میں الجھ گیا ہوں۔ اس نے اپنے سر کو دائیں بائیں زور سے جھکا اور فضول خیالات سے جھکا رہا پانے کی کوشش کرتے ہوئے اشتہار میں دیے گئے نمبر کو تلاش کیا۔

”پہلا انسپکٹر صولت حسین اسپیکنگ۔ آپ کون ہیں۔“

”صولت حسین نے افسرانہ شان کے ساتھ دعب دار آواز میں پوچھا۔

”میرا نام فیصل میر ہے۔ آج کے اخبار میں عمران کی سوٹ کیس کے بارے میں ایک اشتہار شائع ہوا ہے اور میں اس سلسلے میں کچھ اور معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن آپ عمران کی کون ہیں اور اس کے بارے میں کیوں پوچھنا چاہتے ہیں؟“ انسپکٹر صولت حسین کے کان کھڑے ہو گئے۔

”میں اس کا شہر ہوں۔ اگر اہانت ہو تو میں آپ کے پاس آجاتا ہوں۔ آٹنے سامنے بیٹھ کر تفصیلی سوال جواب کر لیں گے۔“ فیصل نے بڑی عاجزی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ جلدی تحریف لے آئیے۔“

صولت حسین نے اپنے قاتل کے کچھ دھڑکے کے بارے میں

فیصل نے کارنگائی اور دس منٹ بعد وہ صولت حسین کے سامنے بیٹھا تھا۔ سلام دو عا کے بعد انسپکٹر صولت حسین بات شروع کی۔ ”فیصل صاحب! سوٹ کیس کا معاملہ کوئی خاص نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ آپ کی ایلیمنٹر سکرپٹ کیا غائب ہیں اور اشتہار شائع ہونے کے باوجود اپنا سوٹ کیس حاصل کرنے کیوں نہیں آئیں؟“ صولت حسین نے فیصل میر کے چہرے پر نظر پڑا جاتے ہوئے سوال کیا۔

”اسی سوال کے جواب کی تو مجھے بھی تلاش ہے انسپکٹر صاحب؟ گزشتہ دو ماہ سے ہم جس کرب و اندوہ سے دوچار ہیں، اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ آپ کو سوٹ کیس مل گیا۔ لیکن خود عمران کہاں ہے، کیا آپ اس معاملے میں کچھ رہنمائی کر سکتے ہیں؟“

”دیکھئے فیصل صاحب!“ انسپکٹر صولت حسین نے سچے سچے الفاظ میں سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہم خود ابھی تک محض اندازیرے میں حیر چلا رہے ہیں۔ ہم خود معلومات میں اس حد تک ہیں کہ پشاور اور ملے پولیس کی ایک ایسا سوٹ کیس ملا جس کا کوئی دعویدار نہیں ہے۔ اسے ایسی آئی ڈائریج نے سلامتی کے بعد اس سوٹ کیس میں سے ایک ڈائری برآمد کی جس پر عمران کی نام تحریر تھا۔ ہم نے اس کے تحریری نمونے کو شہر کو دیا تاکہ کوئی سراغ مل سکے۔ اب اگر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ گمشدہ خاتون آپ کی ایلیمنٹر سکرپٹ میں اب تک کیوں کوئی لینے نہیں آیا؟“ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود صولت حسین پولیس والوں کی شاطرانہ چال چلنے سے باز نہ آیا۔ وہ کھمبھرا کر فیصل کو کسی کھٹے میں جکڑنا چاہ رہا تھا۔

”انسپکٹر صاحب! جیسا کہ میں پہلے بھی آپ سے عرض کر چکا ہوں۔ میری تنہم کراچی سے لاہور کے لیے بذریعہ خیبر پختونخوا کیس کو روانہ ہوئیں لیکن نہ جانے کیوں وہ یہاں نہیں پہنچیں۔ ہم نے کراچی اور لاہور کے پولیس اسٹیشن پر ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی ہے لیکن تا حال ہم حالات سے بے خبر ہیں۔ براہ کرم آپ ہمارے زخموں پر ٹھک پاشی مت کریں اور اگر آپ کے پاس کوئی خبر ہے تو بتا دیجیے۔“ فیصل کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔ ضبطی بڑا کوشش کے باوجود آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔

جب فیصل نے دو چار گھنٹہ بی لیے جب وہ گویا ہوا۔ ”فیصل صاحب! میں نے آپ کو کہاں اس لیے بلایا تھا کہ تمہاری میں مکمل کر دو چار ہاتھ ہو جائیں۔ آپ ایک نوجوان اور تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ امید ہے کہ آپ جو ملے کے ساتھ جوش میں آئے بغیر میری بات سنیں گے۔ ویسے آپ کی ٹیبل کے لیے میں یہ وضاحت کر دوں کہ ابھی یہ سب کچھ محض میرا اندازہ ہے اور خدا کرے کہ یہ سب کچھ ایک خیال خام ہی ثابت ہو۔ بہر حال میں آپ کو پوری بات سنانا ہوں۔ ذرا عمل سے بچنے گا۔“

”میں بہت تنگ ہوں۔ آپ جو کہتا چاہ رہے ہیں، بلا میں دیکھ کر ڈھلے۔“ فیصل نے ٹھوکر لگتے ہوئے کہا۔ اس کا دل کسی خوفناک اندیشے سے دھڑک اٹھا تھا۔ نہ جانے انسپکٹر کیا کہنے والا ہے۔

صولت حسین چند لمبے سوچا رہا۔ واقعات و کردار کو اپنے ذہن میں جمع کرتے ہوئے اس نے کہا شروع کیا۔ ”میں جس آگست کو ساہیوال میں ریلوے ٹرک سے کچھ دو ایک کھیت میں ایک لاش پائی تھی۔ یہ لاش ایک نوجوان لڑکی کی تھی جو اپنے پیٹے اور شکل و صورت سے کسی معزز خاتون کی نظر آتی تھی۔ گاؤں والوں کا بیان تھا کہ وہ لڑکی ان کے گاؤں کی نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس سے واقف ہیں۔ ہم نے کھونٹ لگانے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ پتا نہیں چل سکا۔ مجبوراً اگلے روز ہم نے اس کو لاوارث قرار دے کر ایک مقامی قبرستان میں دفن کر دیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق لڑکی پر کوئی غم نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس کے جسم پر زخم یا تشدد کا کوئی نشان پایا گیا۔ کھیت کے مالک کا نام فرید خان ہے۔ بظاہر وہ بھی بے قصور نظر آتا ہے لیکن قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے ہم نے اسے گرفتار کر لیا ہے اور راتل میں اس سے پوچھ گچھ چاری ہے۔“ صولت حسین نے جلدی جلدی پانی کے دو گلاس چڑھائے تب اس کی طبیعت بحال ہوئی۔

”تو اس واقعے سے کیا ثابت ہوا ہے؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ لاش عمران کی تھی؟“ فیصل نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

”میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ابھی کچھ ثابت نہیں ہوا۔ میں ہم صرف ایک نظریے کی بنیاد پر آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ اب ہمارے ساتھ تعاون کریں گے تو

صولت حسین سمجھ رہا تھا کہ اس وقت فیصل کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی، کسی لیے وہ ذرا نفسیاتی اعزاز سے بات کر رہا تھا۔ جبکہ حالات و واقعات کے پیش نظر وہ جان چکا تھا کہ وہ بد نصیب لڑکی عمران کی ہی تھی۔

”آپ ہی بتائیے! آپ مجھ سے کیا تعاون چاہتے ہیں؟“ فیصل نے گھوگردے میں پوچھا۔

”آپ کو صرف یہ کرنا ہوگا کہ میرے ہمراہ ساہیوال قاتلے چلیں۔ متوفی کے کپڑے اور زیورات وہاں محفوظ ہیں۔ آپ انہیں شناخت کریں۔ یہ مرحلہ یقیناً ایک دشوار گزار مرحلہ ہے لیکن دونوں صورتوں میں آپ ذہنی بھر کے لیے ایک ذہنی کوفت سے نجات حاصل کر لیں گے۔ یعنی اگر میرے من میں خاک، وہ شخص جسے آپ پہچان لیتے ہیں تو واقعی مددے کے بعد آپ سنبھل جائیں گے کہ موت تو ہر ایک کو آتی ہے۔ دیر یا سویر۔ دوسری صورت میں بھی ایک آس بندھی رہے گی۔“ صولت حسین بہت ہی سلیبے ہوئے اعزاز میں بات کر رہا تھا۔

”لیکن آپ کو یہ شک کیوں ہے کہ مرنے والی عمران کچھ ہی تھی؟“ فیصل نے پانی سے سوال کیا۔

جواب میں صولت حسین نے وہ پوری روادار بیان کر دی جو تنہم آباد حسین نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

”لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ شک کی گنجائش اب بھی موجود ہے۔ لیکن بے کڑی سے کرنے والی حور کوئی اور ہو؟“ صولت حسین نے فیصل کو کھٹل تلی دیے ہوئے کہا۔

لیکن فیصل بھی اس قدر ہاتھ نہیں تھا کہ حالات و واقعات کے اشاروں کو کچھ نظر انداز کر دیتا۔ اس کی عقل کبہر ہی تھی کہ عمران اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن دل یہ یاد کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ مسلسل دعائیں کیے جا رہا تھا کہ کاش یہ سب کچھ غلط ہو۔

”میں ساہیوال چلنے کے لیے تیار ہوں۔“ چہرے غور کرنے کے بعد فیصل نے پرامن انداز میں کہا۔ ”لیکن مشکل یہ ہے کہ میں ان کپڑوں اور زیورات کو شناخت نہیں کر پاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ میں اپنی اور عمران کی والدہ کو ساتھ لے لوں۔ عمران کی والدہ ہی ہمیں بتا سکتی ہوں گی کہ انہوں نے کون سے کپڑے اور زیورات پہنا کر اپنی بیٹی کو الوداع کہا تھا۔“ فیصل نے اپنی جگہ آگے بڑھ کر وال سے صاف کیا۔

اب کہاں تکلف کریں گی۔ میں پٹاور سے سوٹ کس اور
 جہاں سے کپڑے اور زیورات یہاں منگوا لیتا ہوں۔
 میں نون کر کے آپ کو اطلاع دے دوں گا کہ مطلوب سامان
 پہنچ گیا ہے تب آپ لوگ زحمت کر لیں۔" مولت حسین
 نے بڑے ادب سے اپنا خاندان پیش کیا۔
 "بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ایک بڑی زحمت سے
 بجالایا۔ اچھا اب اجازت دیں۔" فیصل نے اپنا چادر اور فون
 کمر لٹ کر لیا اور مردہ قدموں کے ساتھ باہر کی جانب چل
 پڑا۔

اس کے دل میں بہت زور کی قہقہہ تھل تھل ہورہی تھی۔
 وہ کسی صورت میں یہ قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ اس کی
 شریک حیات، جان سے پیاری عمر انداسے تہا چھوڑ کر اس
 دنیا سے جا چکی ہے۔ مگر اگر وہ سیدھا جانے کرے میں کس
 گیا اور بستر میں ڈال کر سسکیاں بھرنے لگا۔ کاش یہ سب
 ظلم ہو، جھوٹ اور افواہ ہو، لیکن عمران کی مسلسل جھنجھٹ اور
 اس دوران سامنے آنے والے عریاں حقائق فیصل کے دل
 کی آواز کی گئی کر رہے تھے۔ وہ سوچتا رہا، روتا رہا اور پھر
 روتے روتے سو گیا۔

ریحانہ خاتون کوئی کے ایک انتہائی سرے پر کسی کام
 میں مصروف تھیں۔ انہیں فیصل کی واپسی کا بہت دیر بعد پتا چلا۔
 اور جب وہ اسے دیکھنے اس کے کمرے میں گئیں تو وہ سوچا
 تھا۔ انہوں نے اسے بند سے جگایا مناسب نہ سمجھا اور
 خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

شام کا اندھیرا چمکیل جانے کے بعد فیصل سو کر اٹھا۔
 اس کی طبیعت کا پورے صبح اور شام ہی کافی حد تک کم ہو چکی
 تھی۔ اگرچہ دل کا بوجھ بکھرا اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ اس نگر
 میں لٹھلا تھا کہ اس خوفناک حقیقت سے اپنی والدہ اور
 ماں کے دل و دماغ میں ایک زبردست کشش جاری تھی۔
 اس نے خود قدرت کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا
 لیکن وہ پریشان تھا کہ اس بات کو وہ اپنی ماں کے سامنے
 کیسے بیان کر سکے گا۔ وہ تو اس صدمے کو برداشت نہ
 کر پا سکتی تھی اور اگر ان کو کچھ ہو گیا تو؟ لیکن اب تو یہ خطرہ
 مول لے لیں کہ کوئی چارہ نہ تھا۔ آج ذہن کے تمام خدشے
 بیدار ہو چکے تھے۔ فیصل جانے چاہیں۔ اس کے بعد سب
 لوگ باقی زندگی اس شلش سے نجات حاصل کر کے گزار لیں
 جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور اپنی والدہ کے کمرے

کی جانب چل پڑا۔
 ریحانہ بیٹھ رہی تھیں۔ اس کی اس عادت سے واقف تھیں
 کہ جب بھی اسے کوئی پریشانی ہوتی ہے تو وہ رات کو ان کے
 باتیں کرنے آ جاتا ہے۔ انہیں امید تھی کہ وہ ضرور آئے گا۔
 اسی لیے رات کے بارہ بج جانے کے باوجود وہ ابھی تک
 جاگ رہی تھیں۔ دروازے پر کھٹکنا کہ وہ چونک اٹھیں۔
 فیصل اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس نے ایک کرسی کھٹکائی اور
 اپنی والدہ کے قریب آ کر خاموش بیٹھ گیا۔ اس کا
 چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے فیصل؟ تم پریشان اور محض فکر
 آ رہے ہو؟" ریحانہ بیٹھنے کے بعد فیصل کے چہرہ پر
 نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "کیا اپنی ماں سے کچھ چھپاؤ
 کے؟" انہوں نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔
 فیصل نے فیصل کے لیے ایک استغاثہ تھا۔ اس نے اپنی
 ہمتوں کو جمع کیا اور پھر سے ہونے لگے میں پورا واقعہ بیان کر
 ڈالا۔ ریحانہ بیٹھ کر چہرہ ہلکا ہوا۔ ان پر سکھسا
 لہے میں کسی نے ان کا سارا خون چھوڑ لیا ہو۔ ان پر سکھسا
 جھانک کر اور فیصل کو یوں لگا جیسے وہ اس بیٹی کے بعد اپنی ماں
 کو بھی گھوڑے گا۔ اس نے اپنی ماں کے چہرے پر غصے
 پانی کے جھینٹے مارے اور ان کے کانوں کو چھپتیا۔ وہ ڈاکٹر
 کو فون کرنے کے لیے اٹھنے ہی والا تھا کہ ریحانہ بیٹھنے
 کراچے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور پھر ان پر دیوانگی سی
 غاری ہو گئی۔ وہ اپنے بیٹے سے لپٹ کر زار و قطار رونے
 لگیں۔ خود فیصل کا دل بھی بھرا آیا تھا لیکن اس نے اپنے آپ
 کو قابو میں رکھا۔ اگر وہ بھی بے قابو ہو جاتا تو ماں کو ہمارے
 کون دیتا۔ کچھ دیر بعد وہ اس غم کو برداشت کرنے کی ہمت
 کر چکی تھیں۔ اب سلطان جہاں کو مطلع کرنے کی اہم ذمہ
 داری ابھی کو بھجانی تھی۔

☆ ☆ ☆

کلینک اور گھر پر فیصل کے کان مستقل ٹیلی فون کی
 طرف متوجہ رہے۔ نہ جانے کب مولت حسین کا فون
 آجائے۔ ہالٹر چار دن بعد اس کا بلاوا آ گیا۔ شام پانچ
 بجے فیصل اپنی والدہ اور ماں کے ہمراہ انشپلر مولت حسین
 کے سامنے بیٹھے تھے۔ سلام دعا کے بعد مولت حسین نے
 کہا۔ "فیصل صاحب! میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ لوگوں
 کو کچھ اطلاع نہ ہو سکی۔ آپ آج آ رہے ہیں۔" فیصل نے
 اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کوئی بات نہیں انشپلر صاحب! مجھے اس بات کا
 بخوبی احساس ہے کہ آپ ہمارے دکھ درد میں برابر کے
 شریک ہیں۔ بہر حال اب مناسب یہی ہے کہ جلد از جلد
 ہمیں وہ سامان دکھایا جائے تاکہ ہم کسی کڑوت سکون سے
 بیٹھ سکیں۔" فیصل نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔
 "تمہیں کچھ ہے۔ آپ لوگ اطمینان سے تشریف
 رکھیں۔ میں ابھی حاضر ہوا۔" بیٹے ہوئے مولت حسین
 نے لپٹے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔
 تقریباً دس منٹ بعد کوئی اندر آیا۔ فیصل کے ساتھ
 ساتھ کمرے میں موجود خواتین کے دل بھی ایک نامعلوم
 خدشے سے دھڑک اٹھے۔ نہ جانے اب پردہ غیب سے کیا
 نمودار ہونے والا ہے۔ پریشانی کے عالم میں فیصل ایک جھٹکے
 سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن پھر فوراً ہی بیٹھ گیا۔ آنے والا ایک
 اردلی تھا جس کے ہاتھوں میں ایک ٹرسے تھی اور ٹرسے کے
 اندر خطے مشروب کے تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔
 اردلی نے ایک ایک گلاس تینوں کے سامنے رکھا اور چپ
 چاپ واپس چلا گیا۔ تینوں کے دل آنے والے ڈاک ٹکٹ
 کے تصور سے بوجھل ہو رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی
 گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا۔

پانچ منٹ مزید گزر گئے۔ مولت حسین بیٹھے ہوئے
 چہرے کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔ "معاف کیجئے گا۔
 آپ لوگوں کو چند منٹ کی اور زحمت برداشت کرنا ہوگی۔
 دوسرے کمرے میں تمام اشیاء ترتیب سے رکھ دی گئی ہیں۔
 پٹا اور پلوے انشپن کے اے ایس آئی ڈارٹر اور ساہیوال
 پولیس انشپن کے انشپلر شرید آخر وہاں موجود ہیں۔ اب
 صرف ہمیں اپنے ڈی ایس بی صاحب کا انتظار ہے۔ وہ بھی
 گھر سے نکل گئے ہیں اور چند منٹ میں پہنچنے والے ہیں۔
 ان کے آتے ہی کارروائی شروع کر دی جائے گی۔" مولت
 حسین نے جلدی جلدی فیصل کو صبر سے حال سے آگاہ کیا۔
 جمی باہر چپ کے کمرے کی آواز آئی۔

"بیٹے! ڈی ایس بی صاحب بھی تشریف لے آئے۔
 میں ابھی حاضر ہوا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر
 بھاگا۔ چند منٹوں کے بعد وہ واپس آیا اور فیصل سے مخاطب
 ہوا۔ "دوسرے کمرے میں تمام افسران موجود ہیں۔ ان
 کے سامنے آپ لوگ متونہ کی چیزوں کی شہادت کریں گے
 کہ وہ آپ کے ساتھ ہیں۔" مولت حسین نے کہا۔

لوگوں کا یہ بیان سنی ہوگا اور پولیس کے ریکارڈ میں درج کیا

جائے گا۔ آجے اب ملتے ہیں۔" مولت حسین نے فیصل
 کے کانوں پر ہاتھ رکھا گویا اسے صبر اور دل جمعی کی تلقین
 کر رہا ہو۔

لڑتے قدموں اور امید و ہم کی کیفیت میں جتنا فیصل
 آگے بڑھا۔ دونوں خواتین کی بھی یہی حالت تھی۔ بلکہ حقیقی
 معنوں میں وہ فیصل کی نسبت کچھ زیادہ ہی غراب ناک
 حالت سے دوچار تھیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی پولیس
 افسران اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ فیصل نے دیکھا کہ
 کمرے کے درمیان ایک بہت بڑی میز پر چند اشیاء
 چادر سے ڈھکی رکھی ہیں۔

"اب کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ آپ لوگ
 میز کے گرد کھڑے ہو جائیں۔ ہم نے اس تمام کارروائی کی
 ویڈیو فلم بنانے کا بھی انتظام کیا ہے تاکہ سب کچھ عسری طور
 پر بھی ریکارڈ میں آجائے گا۔ فیصل صاحب! آگے تشریف
 لائیں۔ اور آپ دونوں خواتین بھی۔" مولت حسین نے
 خواتین کو اشارہ کیا۔

سلطان جہاں اور ریحانہ بیٹھ کر چہرہ فقی ہو رہا تھا۔ چند
 ہی روز میں ان کے چہروں کی تمام شادابی رخصت ہو چکی
 تھی۔ یوں لگتا جیسے چائیک ان کی عمریں دینی ہو گئی ہیں۔
 وہ دونوں لڑتے کاتپتے یوں آگے بڑھ رہی تھیں جیسے کوئی
 انہیں زبردستی مجبور کر رہا ہو۔

مولت حسین نے ایک سرے سے چادر کو جکے جکے
 اوپر سر کا شروع کیا۔ سسوائٹ کے جکے باوا دی رنگ کے
 سوٹ کس کی ایک جھلک نمودار ہوئی اور پھر اگلے ہی لمحے
 پورا سوٹ کس ان کے سامنے تھا۔ سلطان جہاں کے حلق
 سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ "ہاں ہاں۔ بیکار ہے۔ یہ
 میری عمران کا سوٹ کس ہے۔"

فیصل نے بھی انہماک میں سر ہلایا۔ مولت حسین نے
 آگے بڑھ کر سوٹ کس کا ڈھکن اٹھا دیا۔ سلطان جہاں
 آگے بڑھیں اور اس میں موجود ایک ایک کپڑے کو اٹھا کر
 یوں دیکھیں جیسے یہ کوئی بہت نازک اور بے حد قیمتی چیز ہے
 جو ذرا سی گھسی سے ٹوٹ جائے گا۔ وہ بڑے چار سے ہر
 لباس پر ایک بوسہ شہت کرتیں اور پھر اسے ایک طرف نرمی
 سے رکھ دیتیں۔ ان کی زبان بالکل خاموش تھی لیکن آنکھوں
 میں ایک سمندر برپا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کیفیت
 میں مبتلا ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک ایک کپڑا تھا۔ ان کے

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفشیل پیج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے خنطین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے مہتمموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر آپ لوڈ کر کے ادارے کو تکلیف دہانی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سامبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سپینس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سمرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63 فیبر 11 ایسٹینش ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

35804200-35804300

کے لیے ایک سائیز ہو گیا۔

انہی کال پر بات کر کے فون بند ہی کیا تھا کہ اہلکام لائبروں نے ٹھیکر کیا۔ کن پوائنٹ پر پہنچے تاکہ کوہا۔ طاقت ضائع کیے شاہ میر نے سارے پتے لائبروں کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

شاہ میر کو شیروں سے زیادہ زوہیب کی فکر ہو رہی تھی کہ وہ سیو ہو۔ لائبروں نے صرف نیسے جھپٹے تھے۔ مہیا سیل، مہنگی گھڑی کچھ بھی چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی مطلوبہ چیز جھین کر لائبروں نے شاہ میر کو چھوڑ دیا اور وہاں سے نکلنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔ شاہ میر کو زوہیب کی فکر تھی کہ وہ تو بس کسی طرح جلدی سے زوہیب کے پاس جانا چاہ رہے تھے۔

لائبروں کو آخر شے دیکھ کر انہوں نے بھی قدم بڑھانا چاہا۔ مین اسی وقت لائبروں کو کیا سمجھ آئی کہ اپنی سیلفی کے لیے شاہ میر پر دو فائر کر دیے۔ ایک سر پر اور دوسری گولی سینے پر لگ گئی۔ گولی مارنے ہی اندھا دھن لائبروں بنے دوڑ لگائی اور اپنی بائیک پر چڑھ کر نکل گئے۔

سب اتنا اچانک ہوا کہ کسی کو سمجھنے اور سنبھالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ زوہیب کے ہاتھ میں مٹائی کا ٹوکرا تھا جو گولی کی آواز سے ڈر کر ہاتھ سے چوٹ گیا۔ منٹوں میں مٹائی کی شاپ کے باہر جم غفیر جمع ہو گیا۔

زوہیب نے بھی رش کی طرف کا پھٹنے والے کے ساتھ قدم بڑھائے۔ لوگوں کے رنج جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگا اور جیسے ہی ماموں پر نظر پڑی وحشت ناک جھج اس کے گھٹے کو چرتی ہوئی لگی۔

دوڑتے ہوئے ماموں کے پاس پہنچا۔ ساتھ ہی ماموں کا فون گرا پڑا تھا۔ جسے اٹھا کر اس نے لاسٹ ڈائل پر کال لگائی۔ زوہیب چوہنا ہی تھا پر حاضر دماغی سے فوراً ہی کال لگائی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت بڑا اور ہمت والا آدمی ہے۔

لاسٹ کال چھوٹے ماموں شاہ زین کی تھی۔ جس پر دوبارہ کال گئے پر شاہ زین نے فوراً ہی کال اٹھائی اور زوہیب کی روٹی ہوئی آواز سن کر اندھا دھن بھاگا۔

☆☆☆

ایک ایک کر کے سب شاہ میر کے پاس پہنچ گئے۔ ساتھ ہی ایسپینس سرورس بھی پہنچ گئی تھی۔ جنہیں شاہ زین نے راستے میں ہی کال کر دی تھی۔ شاہ میر کو ایسپینس میں ڈالایا گیا اور اسپینس جتنی فوری سے تیار کیا صرف وہاں پہنچا۔

دسمبر 2022ء

جائے۔

سب نے اس بات سے اتفاق کیا تو اب نکاح کی چار پائ بھی خوب زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ ہر کوئی اپنے کپڑے جوتے اٹھائے بھاگ بھاگ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی مسافت طے کر رہے تھے۔

کمرے میں اتنے مہمان تھے کہ کوئی بھی کمرہ کچھ لمبے لمبے خالی نہیں ہوتا۔ دولہے کے کمرے میں سب مرد و عورتیں جمع تھیں۔ دولہے کے بڑے بہنوئی دولہے کو تیار ہونے میں مدد کر رہے تھے۔ چھوٹے بہنوئی کو سالے صاحب کی آنکھوں میں سرمہ لگانے کا موقع ملا تو وہ بہت خوش ہوئے اور بس اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

چھوٹے بہنوئی نے ابھی ایک آنکھ میں سرمہ لگایا تھا کہ تراترے جتنا فون دولہے کو اٹھاتا پڑا فون۔ سامنے والے کی بات سننے ہی دولہا اندھا دھن اپنے کمرے میں جمع مردوں کے گچ جگہ بناتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔

نکاح میں جانے کی ساری تیاریاں ہو چکی تھیں۔ بس لیے باہر دولہا کی کار بھی تیار تھی۔ مین کرٹ کے بالکل قریب دولہے کی کار جو کہ چھول پتوں اور خوب رنگ برنگی لائٹس سے لگی ہوئی تھی کھڑی تھی۔

دولہے نے اسی کار کی جالی ڈرائیور سے لی پور زین سے گاڑی بھاگے گیا۔ باقی لوگ پیچھے سے آواز دیتے رہ گئے پر دولہے کے توجہ سے کان میں جوں تک نہ رہی۔

دوسری اور بھر تیسری گاڑیوں میں تین چار مرد بیٹھے اور دولہے کی کار کے پیچھے بھاگے۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ گھر کی عورتیں سب دھچکی رہ گئیں یہ سب اتنا آٹا ٹاٹا ہوا کہ کسی کو کچھ بھی نہیں آیا اور پھر سب سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

بڑے ماموں شاہ میر اور بھانجا زوہیب دونوں مٹائی کی شاپ پر گئے ہوئے تھے۔ شاہ میر کو پہلے ہنگ جانا تھا کہ پیسے نکالنے کے لیے۔ شاہ میر ہنگ کا پتہ رقم نکالوانے میں کوئی چندرہ منٹ لگ گئے۔ چندرہ منٹ گئے بعد ہنگ سے باہر نکلے سیدھا مٹائی کی شاپ پر پہنچے۔

ماموں بھانجا دونوں اندر گئے اور ہنگ میں منٹ بعد شاپ سے مٹائی کے دو ٹوکے لے کر نکلے۔ ایک سات ٹوکے ٹوکرا ماموں کے ہاتھ میں اور ایک پانچ ٹوکے ٹوکرا بھانجے کے ہاتھ میں تھا۔ شاپ سے دو قدم بڑھے تھے کہ اچانک شاہ میر کا سیل بجنے لگا۔ مٹائی کا ٹوکرا ماموں کے پاس رکھ کر فون سننے لگے۔

194

تبی و امیں

مکرمی مدیر اعلیٰ
سلام شوق

ایک اور سچ بیانی ارسال خدمت ہے۔ اس کے تمام کردار زندہ ہیں اس لیے نام مقام بدل دیا ہے۔ اُمید ہے کراچی سے اندرون سندھ تک پھیلی یہ کہانی قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

خلیل جبار
(احمد آباد)

احسان ابھی تک گاؤں نہیں پہنچا تھا۔ راتے ہی میں رات ہوتی تھی۔ اس کی عادت تھی، جب شہر جاتا تھا، پہلے کام خانا کر فوراً ہی گاؤں کا رخ کر لیتا تھا کہ اس کا ملازم محمود مگر نہ پہنچے، فکر مند ہو جاتا تھا۔ وہ اکثر اس کو سمجھاتا کہ وہ فکر نہ کرے، میں جیسا کہ چاہوں ہوں جو شہر جا کر کم ہو گاؤں میں۔ اس کی بات پر وہ ہاں دہکتا رہتا تھا۔

ضروری ہے۔ "شاہ میر کے بابا نے پڑا حلو کر لیا۔" "جی بابا بتائیں ہمیں کیا فیصلہ لیا ہے۔ ہم سے جو بات میر کے بڑے گاؤں میں چھوٹی بہن کے لیے ضرور کریں گے۔" شاہ میر کے بڑے بہن کی نے احاد کے ساتھ کہا۔

"جی بابا بھائی تمہیں کہہ رہے ہیں۔ ہم سے جو ہو سکے گا ہم ضرور ساتھ دیں گے۔" چھوٹے بہن کی نے بھی بات کی تائید کی۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں نے فیصلہ لیا ہے۔ شاہ میر کی بیوہ (بڑی بہن) کی شادی میں شاہ زین سے گروا دیا ہوں۔" بابا کی بات پر جہاں سب شاہ زین کا ہنسنے لگے تھے۔ وہیں شاہ زین احمدیہاں سے بیٹھا تھا۔ شاید اسے اس فیصلے کا پہلے سے ہی علم تھا۔

"بابا آپ کے فیصلے پر تو کوئی اعتراض نہیں ہمیں ہر حتمہ کا کیا ہوگا۔ جو شاہ زین کی راز نگ رہی ہوگی۔" چھوٹی بہن نے حتمہ کا سوچ کر کہا کہ کون کب یہ رشتہ دہی لائی تھی اور سب کو یہ سن بھی آیا تھا۔

حتمہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جس کا باپ کم آمدنی میں بھی اپنی بیویوں کو پال رہا تھا۔ حتمہ کی بہن بہنیں اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ باپ محنت مزدوری کر کے سات لوگوں کا پیٹ پال رہا تھا۔

شاہ میر کی بیوی بھی چھوٹے گھرانے سے آئی تھیں۔ جس کا رخ بڑی بہن نے کر دیا تھا۔ بڑی بہن اگلی تھی۔ وہ بھائی تھے۔ جن کی شادی ہوئی اور الگ الگ کرائے کے گھر میں رہنے لگ گئے۔ پہلے باپ اور پھر ماں دونوں ہی دنیا فانی سے کوچ کر گئے تھے۔

مگر کے لوگ بھی اپنی گاڑیوں میں ایوب نیس کے پیچے کل گئے۔ ہسپتال تک کر شاہ میر کو فوراً آپریشن تھیں میں لے جایا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر زباہر آئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔

گروا لے کر گھر پہنچے۔ گھر میں سب کو پتا چل چکا تھا۔ خوشیوں سے گروا دن رات میں تہل تہل ہو چکا تھا۔ ہر طرف جی دھکا دھکا دھکا دھکا کا سا حال بندھ گیا تھا۔ ہل بھر میں پورے گھر میں جیسے کھرام مچ گیا تھا۔ جو لوگ کلاچ کی تقریب میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔ وہ سب اس اچانک حادثے کا سن کر انہوں کا اکتھار کر رہے تھے اور تعزیت کرتے مگر کی طرف پلٹ رہے تھے۔

قرب رات کے دس بجے شاہ میر کی میت لے کر گھر پہنچے۔ بارہ بجے کا اعلان پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔ لوگوں کا جم غفیر اٹھا ہو چکا تھا۔ تقریب میں آنے والے سب ہی گھر سے ہو کر واپس آ چکے تھے۔

شاہ میر کی بیوی اور ایک ڈیڑھ سالہ بیٹی تھی۔ گھر میں سب کو روٹے پیٹے دیکھ کر بچی بھی روٹے روٹے پٹکان ہو رہی تھی۔ شاہ کی بیوی بری خیر سننے ہی بے ہوش ہو چکی تھی۔ سب کوشش کر رہے تھے ہوش میں لانے کی پر ہوش میں آتے ہی زاروں قطار روٹے لگتی روٹے روٹے چنگی پتھر ہونے لگی۔

اتنا بڑا صدمہ برداشت نہیں کر رہی تھی۔ بار بار بے ہوش ہوتی رہی۔ بارہ بجے جب شاہ میر کی میت گھر سے نکلی اس کے بعد ہی گھر والوں نے فینک کی گولی دے کر سلا دیا۔ بیٹی روٹے روٹے پہلے ہی سو چکی تھی۔ اسے بھی ماں کے سر ہانے سلا دیا۔

☆☆☆

تین دن گھر میں سنائے کا رواج رہا جیسے کوئی کسی کو جانتا ہی نہ ہو۔ بس یک دم سب کے منہ پر لگ چکا تھا۔ نہ کھانے پینے کا ہوش نہ سونے کا جگنے کا ہوش۔ گھر جیسے دیران ہستی کی مانند بالکل سناں ہو گیا تھا۔ تیسرے دن کل خواتین کے بعد عمر کی نماز کے وقت سب قبرستان گئے دعاؤں کا سلسلہ جاری تھا۔ گھر واپس آنے پر شاہ میر کے بابا نے گھر کے سب ہی فرکوا کا کھانے کا کہا۔

"جیسا کہ سب جانتے ہیں شاہ میر کی دوا ہم ڈتے داری جواب دہاری ڈتے داری ہن چکی ہے۔ اس ہمارے

احسان نے لڑائی کے علاوہ صدمہ میں آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا آگاہ بن گیا۔
 کرائے کا مکان تھا۔ ایک چھوٹا کمرہ اور چھوٹا سا آگاہ بن گیا۔
 اس کے والد مرحوم دور در دور جیتے تھے جس دن مزدوری مل جاتی۔
 گھر میں کھانا تیار ہو جاتا۔ وہ نہ روکے سوچی کھا کر گزارا کرتا۔
 پڑتا۔ اپا کو جس دن زیادہ رقم مل جاتی وہ خود کو بادشاہ تصور کرتے۔
 کھانے کے لیے بہت زیادہ اشیاء گھر لے آتے۔
 زیادہ کھانے پینے کی اشیاء دیکھ کر والد و زہت کا منہ بن جاتا تھا۔
 "سب لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کے بغیر گزارا گزارا ہو سکتا ہے۔"
 "پریشان نہ ہو، یہ سب ہم ہی کھائیں گے، کسی کو باہر دے کر نہیں آئیں گے۔"
 "یہ مجھے بھی پتا ہے، ہم ہی کھائیں گے، جس دن مزدوری میں زیادہ پے مل جائیں، میرے پاس جمع کرادیا کرو تا کہ جس دن نہیں کام نہ لے، اس دن اس رقم سے کھانے پینے کا سامان لایا جاسکے۔"
 "یہ تم بھی جانتی ہو مجھے مزدوری میں اتنی رقم کہاں ملتی ہے، یہ اتفاق ہے کہ سید صاحب خوش ہو کر زیادہ رقم دے دیتے ہیں، زیادہ پیسے پڑے پر میرا دل کرتا ہے کہ گھر والوں کو خوش کرادوں۔" اپانے کہا۔
 "سب مردوں کا ہی دل کرتا ہے، اپنے بیوی بچوں کا بھرپور خیال رکھیں، ان پر خرچ کریں، لیکن آگے بھی دیکھنا پڑتا ہے، پھر تم بچا کر رکھنا پڑتی ہے۔" والدہ کہتیں۔
 اپا احسان کو بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے اس لیے مشکل حالات میں بھی اسے تعلیم دلار رہے تھے۔ احسان ان کا بازو بننا چاہتا تھا لیکن ابا اسے کام کی اجازت نہیں دیتے تھے۔
 "ابا مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آپ اس عمر میں بھی محنت مزدوری کریں۔"
 "بھوکھن کی بات ہے، جب جیسے نوکری مل جائے گی، میں محنت مزدوری کرنا چھوڑ دوں گا۔" والد اسے تسلیم دیتے۔
 تعلیم مکمل ہو جانے پر احسان نے نوکری کی تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ والدین کو خوشیاں دینا چاہتا تھا، لیکن قسمت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایسا حادثہ تھا کہ احسان لی کر رہ گیا۔ ایک تیز رفتار بس نے رستے کو جکڑ دیا۔ اس رستے میں اس کے ابا اور اسی بازار سے سبزی اور دیگر سامان لے کر آ رہے تھے۔ ان کے انتقال پر وہ تیار ہو گیا تھا۔

تھے وہ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں پورے پورے ہوئے تھے۔ نوکری مل جانے پر وہ شادی کرنا چاہتے تھے لیکن قسمت اس کا حریف امتحان لینا چاہتی تھی۔ شاید اسی لیے عرش نے شادی کا مطالبہ شروع کر دیا۔
 ایک دن وہ دونوں ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ احسان نے عرش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تم میری پوزیشن سے واقف ہو، میں کرائے کے مکان میں رہتا ہوں، دو ماہ سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا ہے، مالک مکان کا مطالبہ کر رہا ہے کہ چار ماہ سے کہ کرایہ دو ورنہ مکان خالی کر دو، روزگار میرے پاس ہے نہیں، میں کسی طرح شادی کر سکتا ہوں؟"
 "آخر نہیں نوکری کب ملے گی؟"
 "اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"
 "میں تمہارے حالات بہتر ہوتے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"
 "ماہی کفر ہوتی ہے، انسان کو اپنے حالات کے اچھا ہونے کی امید رکھنا چاہیے۔"
 "چاہے کسی کی شادی کی عمر ہی نکس جائے؟"
 "تم لگ کر کیوں کرتی ہو، میں ہوں نا، میں تم سے شادی ضرور کروں گا۔"
 "کب کرو گے، جب میں پورے ہو جاؤں گی؟"
 "عرش یہ آج تم مجھ سے کسی باتیں کر رہی ہو۔"
 احسان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔
 "میں آج یہ فیصلہ کر کے آئی ہوں۔"
 "کیسی؟"
 "مجھے دو نوک جو اب چاہیے۔"
 "میں جیسے کیسے یقین دلاؤں کہ تم سے شادی کروں گی۔"
 "اس بات کی کیا گارنٹی ہے، جیسے جلد روزگار مل جائے گا؟"
 "عرش..... احسان نے کہنا چاہا۔
 "میری بات جیسے سنا لگے گی لیکن یہ حقیقت ہے، مجھے تمہارا مستقبل روشن نظر نہیں آ رہا ہے۔" عرش نے کہا۔
 اس دن وہ احسان کو بالکل بدلی بدلی لگ رہی تھی۔
 "جیسے کسی نے میرے خلاف ورغایا ہے، جیسی ایسی بات کر رہی ہو۔" احسان نے کہا۔
 "کیا میرے پاس دماغ نہیں ہے، میں بھی دوروئی کھاتی ہوں۔"
 "میں یہ چاہتی ہوں کہ احسان نے عرش سے

مجھوڑے ہوئے کہا۔
 "میں نے اپنے والدین کو روکا ہوا تھا لیکن کب تک روکوں، بڑے اچھے، اچھے رہتے آ رہے ہیں، میرے لیے۔"
 "میرے کیا چاہتی ہو؟"
 "میرے اچھے مستقبل بہتر چاہتی ہے، جو رہتے آئے ہیں، وہ بہت معقول ہیں، کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لوگ بے روزگار ہیں۔"
 "ہم نے جو ایک ساتھ رہنے کے خواب دیکھے تھے؟"
 "ان کو ایک خواب کی طرح بھلا دو۔" عرش نے کہا۔
 احسان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عرش کیا کہہ رہی ہے، اس کے دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔
 "آج کے بعد مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش مت کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ فیسے سے اٹھ گئی۔ "اور پاس میں مل ادا کر کے جاری ہوں، تمہارے پاس مل دینے کے لیے نہیں ہوں گے، اور یہ ہونے والے ایسے لوگوں کے کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں کرتے۔"
 اس وقت واقعی اس کی جیب میں پیسے نہیں تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ جاتے جاتے بھی خطرے کے حیر برسا کے جائے۔
 اس دن کے بعد عرش نے احسان سے رابطہ نہیں کیا۔ نوکری کے نہ ملنے اور عرش کا اسے چھوڑ دینے پر وہ ٹوٹ سا گیا تھا۔
 عرش کی شادی ایک دولت مند شخص سے ہو گئی۔ وہ عمر میں عرش سے بڑا تھا لیکن اس کے پاس مال و دولت بہت تھا۔
 عرش نے احسان کو اپنی شادی کا دعوت نامہ بھی بھجوا دیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا، اس نے رابطہ توڑنے کے باوجود کیوں اسے دعوت نامہ دیا ہے۔ وہ اس پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ اس نے بروقت اچھا فیصلہ کیا ہے، جس کے نتیجے میں ایک امیر شوہر کی بیوی بن گئی ہے۔ احسان کے پاس اسے بھوک اور غربت کے سوا کچھ ہی مل سکتا تھا۔ اس کا مکان بھی کرائے کا تھا۔ عرش کے شوہر کا پیشہ نہیں میں بھگتا تھا، جہاں کئی ملازم خدمت پر مامور تھے۔ احسان اس کی شادی میں نہیں گیا اور

کی تھی۔ رشتے دار غربت کی وجہ سے احسان سے ویسے ہی کتراتے تھے۔ کون اسے اپنی لڑکی دینا۔ ایک عرش ہی تھی جو اسے پسند تھی، وہ تو جی بھی نہیں کر سکتا تھا کہ عرش اس کے ساتھ ایسا روایتی اختیار کرے گی۔
 احسان، عرش کی بے وفائی پر ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ ماہی کے ان دنوں میں ایک آفس میں احسان کو کلرک کی نوکری مل گئی۔ تنخواہ اتنی اچھی نہیں تھی مگر اکیلے آدمی کے لیے بہت تھی۔ وہ جب گھر سے آفس کو روانہ ہوتا تو بہت خوش ہوتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ دفتر میں اس کا دن اچھا گزار جاتا تھا۔ لیکن گھر آتے پر وہی ادا سی اور تنہائی کا سامنا ہوتا تھا۔
 تنہائی نے احسان کو مطالعے کی جانب مائل کر دیا۔ احسان کا کوئی خراج نہیں تھا۔ ہر مہینے احسان اپنی تنخواہ سے کچھ بچت کر کے اچھی کتابیں لے آتا۔ ان کتابوں میں مصروف ہو کر گھر میں تنہائی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ گھر میں دل لگنے لگا تھا۔
 دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ وقت کا کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ایک دن احسان صدمہ کے علاوہ زیب النساء اسٹریٹ سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک بڑی سی کار پر پڑی۔ اس کار میں عرش بیٹھی تھی۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ دو سال بعد احسان نے عرش کو دیکھا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ لپک کر اس کے پاس جائے۔ اس کا خیال احوال پوچھنے۔ احسان کی اس سے شادی نہیں ہوئی تھی، لیکن انہوں نے ایک عرصہ یونیورسٹی میں ساتھ گزارا تھا۔ اس نے ابھی اس کی جانب دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ عرش نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔ احسان کے دل کو ایک گھونسا سا لگا۔ اس کا انداز تیار ہوا تھا وہ اس سے ملنا نہیں چاہتی، وہ اپنے سے کم حیثیت والے سے کسی طرح بات کر سکتی تھی؟ عرش نے منہ پھیر کر احسان کو اس کی اوقات یاد دلانی تھی۔ وہ ایک پیسے والے کی بیوی تھی، اور احسان ایک غریب کلرک۔ احسان کی آنکھیں اٹھک رہیں ہوئی تھیں، لیکن آنکھوں کا گھٹا پن بتا رہا تھا کہ اسے دکھ ہوا ہے۔ اسے میں عرش کا شوہر آگیا اور کار وہاں سے ہٹ گئی۔
 رات جب احسان چارپائی پر سونے کے لیے لیٹا۔ بے اختیار اس کی نظروں کے سامنے عرش کا چہرہ آگیا۔ اس کا چہرہ کیا نظر آیا، ماضی کی یادیں بھی ایک ایک کر کے سامنے آئے لگیں۔ عرش بڑے سے میں کر دو تھی اس لیے وہ

دووں کیمین میں بیٹھ جاتے تھے۔ اس کی جو بھی شے نہیں آتا تھا۔ احسان اسے اچھی طرح سے سمجھا دیتا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ان دونوں کی دوستی محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ملاقات میں ساتھ بیٹھے اور میرے کی تمسک کھائی جاتی تھیں۔ احسان کو خود پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ لڑکیوں سے دور رہنے والا شخص تھا۔ پھر کیسے اس کے قریب آ گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ گہری اور گہری ہوتی جا رہی تھی کہ سرخس کا بیاجرو سامنے آ گیا۔ احسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس محبت کا یہ انجام ہوگا۔

احسان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ نہ جانے یہ سلسلہ کتنی دور جا رہی رہا۔ اس کا تکیہ آنسو سے تر ہو چکا تھا۔ عجیب کے بھگ جانے پر وہ چٹکا اور مردہا، عورتیں آنسو بہاتی ہیں، مرد نہیں۔ مرد بہاؤ رہتے ہیں یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان ہوا، اور وہ سکون کی نیلو سو گیا۔ صبح ہونے پر ذہن پر عمل، پورے محسوس ہو رہا تھا۔ ہاشما کر کے وہ دفتر روانہ ہو گیا۔

دفتر سے لوٹنے پر احسان نے دروازہ کھولا۔ صحن میں ایک خط پڑا تھا۔ وہ کسی دیکھ کی طرف سے تھا۔ یہ خط شہزاد پور سے آیا تھا۔ اس نے لحاظ چاک کیا۔ خط میں مختصر تحریر تھی۔

”تمہارے ماموں اور لیس کا چند دن قبل انتقال ہو چکا ہے۔ تم مجھے شہزاد پور میں آ کر معاملات کو دیکھنا۔“

احسان کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کوئی عزیز یا رشتہ دار شہزاد پور میں بھی رہتا ہے۔ وہ بھی اندرون سندھ نہیں گیا تھا۔ ذہن پر زیادہ زور دینے پر اسے یاد آ گیا، اس کے دور پرے کے ماموں اور لیس کی راجہ میں رہتے تھے۔ انہوں نے دو شادیوں کی تھیں، مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ ماموں ہو کر انہوں نے تیسری شادی نہیں کی۔

ایک دن ان کے بارے میں پتا چلا کہ وہ کراچی سے اپنا سب کچھ لے کر اندرون سندھ چلے گئے۔ ان کو شہزاد پور اتنا پسند آیا تھا وہ ہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ احسان سوچ رہا تھا کہ ماموں اور لیس کا انتقال ہو چکا ہے، پھر میں کیا کروں، کون سے معاملات ہیں جن کو نکلانے کے لیے مجھے کہا گیا ہے۔ وہ میرے اتنے قریبی عزیز تو تھے نہیں پھر ان کے بارے میں مجھے کیوں مطلع کیا جا رہا ہے؟ خط میں موبائل نمبر بھی تھا۔ اس نے کال کیا۔

”میں احسان بات کر رہا ہوں، آج کی ڈاک سے مجھے ایک خط ملا ہے، جس میں ماموں اور لیس کے انتقال کی خبر دی گئی ہے اور۔۔۔“

”ٹھیک ہے، یہ خط میں نے ہی لکھا ہے۔ تم ایک دو دن میں میرے پاس آ جاؤ۔“

”میں نے یہی پوچھنے کو کال کی ہے کہ جب ان کا انتقال ہو چکا ہے، پھر مجھے کیوں بلایا جا رہا ہے؟“

”بات یہ ہے کہ تمہارے ماموں نے وصیت کر دی ہے کہ ان کی جائیداد تمہیں دی جائے اس لیے اب یہاں آ کر جو بھی معاملات ہیں، ان کو دیکھنا۔“

”ٹھیک ہے، میں دو دن بعد آ جاؤں۔“

”کل ہی آ جاؤ۔“

”مجھے دفتر سے چھٹی لینا پڑے گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

وکیل نے کہا۔ احسان کو اندازہ نہیں تھا۔ ماموں کی کتنی جائیداد ہے لیکن پھر بھی اتنی ضرورت ہوئی کہ اس کے حالات زندگی بہتر ہو جائیں گے۔ احسان جب شہزاد پور پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ماموں اور لیس نے بہت شاندار حویلی نما گھر بنایا تھا۔ حقیقی ہاؤسی کرنے کو بھی اچھی خاصی زمینیں تھیں۔

☆ ☆ ☆

جائیداد کی تبدیلی خوش اسلوبی سے احسان کے نام ہو گئی۔ اسے گاؤں کا ماحول اچھا لگا۔ وہیں ٹھہر گیا دو سال کا عرصہ ایسے بیت گیا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ خریداری کے لیے احسان کو اکثر حیدر آباد بھی جانا پڑتا تھا، اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا اس لیے وہ رات ہونے سے پہلے گھر آ جاتا تھا۔

اکثر تنہائی ملنے پر احسان کو سرخس یاد آ جاتی۔ وہ سوچتا کہ کاش اسے یہ دولت پہلے مل جاتی تو سرخس کسی اور کی نہ ہوتی۔ مگر کاتب تقدیر نے اس کی زندگی کو قلمی کہانی بنا دیا تھا جو اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا اس لیے وہ ایک خواب کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔

اس دن حیدر آباد سے واپس آ رہا تھا کہ اسے اپنی کار روک دینا پڑی، اگر وہ کار کو بریک نہ لگا تا تو وہ لڑکی اس کی کار سے ٹکرا جاتی، وہ بدحواسی کی حالت میں گلی سے نکل کر سڑک پر دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ کار کے رک جانے پر وہ

دیکھ گئے۔

”کون لوگ ہیں؟“ احسان نے پوچھا۔

”یہ میں نہیں جانتی ہوں گی۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے، چننے جاؤ۔“ اس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ فوراً کار میں بیٹھ گئی۔

”بھئی سینٹ پر لیٹ جاؤ اور اپنے چہرے کو اس کپڑے سے ڈھانپ لو۔“ اس نے سینٹ پر رہی چادر کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی نے اس کی بات پر عمل کیا، اور خود کو چادر میں چھپا لیا۔ ایسا محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ کار کے پچھلے حصے میں کوئی ہے۔ کچھ قاصلے پر احسان کو چند نوجوان نظر آئے، ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ ان کی حرکات و سکنات بتا رہی تھیں کہ ان کو کسی کی تلاش ہے۔ اس کی کار جب ان کے نزدیک آئی۔ ان میں سے ایک نوجوان نے کار میں بھاڑا اور پیچھے ہٹ گیا۔ چادر میں چھپی لڑکی کو اس نے یہ سمجھا کہ کار کے اس حصے میں سامان پڑا ہے، احسان نے بھی اس کے کار سے دور ہو جانے پر اطمینان کا سانس لیا۔

”وہ لوگ بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اب بتاؤ، میں تمہیں کہاں چھوڑ دوں۔“ احسان نے پوچھا۔

”اس وقت میری خود کچھ نہیں آ رہا ہے کہ کہاں جاؤں۔ مجھے ہر طرف اپنی موت نظر آ رہی ہے۔“

”موت نظر آ رہی ہے، کیسے؟“ احسان چونکا۔

”وہ لوگ مجھے ہر حالت میں پکڑنا چاہتے ہیں۔“

”ایسا کیا جرم کیا ہے جو تمہیں پکڑنا چاہتے ہیں۔“

”میں بے قصور ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔“

”جب تم نے کچھ نہیں کیا، پھر یہ تم کو کیوں مار دیتا چاہتے ہیں؟“

”قصور میرے بھائی کا ہے۔“

”تمہارے بھائی نے کیا کر دیا ہے، جو یہ تمہارے دشمن بن گئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے بھائی رجم نے الیاس خاص خیل کی بہن زینب سے پسند کی شادی کر لی ہے، اور اسے لے کر نہیں وہ کہاں چلا گیا ہے، وہ ان دونوں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

”تم اذریو لیل میں رہتی ہو؟“ احسان نے پوچھا۔

”نہ، نورا، شادی ہوئی، رات ہی ہوئی، ایک شادی، اگر قریب میں ہیں اس کی ہوں، زینب کے بھائیوں کو میرے

یہاں آنے کی خبر تھی اس لیے وہ یہاں آ گئے۔ وہ مجھے زبردستی اغوا کر کے لے جانا چاہتے ہیں، میں بڑی مشکل سے ان کے چنگل سے بچنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔“

”ابھی تم نے بتایا تھا کہ وہ تمہیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔“

”میں بڑی طرح خوف زدہ تھی اس لیے منہ سے نکل گیا۔“

”تمہیں کیوں اغوا کرنا چاہتے ہیں؟“

”مجھے اغوا کرنے سے میرے خاندان کے لوگ حرکت میں آئیں گے اور وہ میرے بھائی رجم و زینب کو تلاش کر کے جرم کے سامنے پیش کر دیں گے، جرم جرم نہ بھی کرے گا، اور زینب کے کسی بھائی سے مجھے شادی کرنا پڑے گی۔“

”رجم نے زینب سے شادی کی ہے، کوئی جرم نہیں کیا۔“ اس نے کہا۔

”جرم کے کتنی جاتی ہے، اس کی نظر میں یہ جرم ہے۔ اس جرم پر وہ جرم زادے گا وہ درست تصور کی جائے گی۔“

”تم زینب کے بھائی سے شادی کر لو گی، تو وہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کریں گے؟“

”جانوروں سے بدتر سلوک کریں گے۔“

”یہ بہت ظلم ہے۔“ احسان نے کہا۔ ”کچھ کس کے لوگ بہت ہی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔“

”کیا تمہارا حلق کاؤں سے نہیں ہے۔“ لڑکی بولی۔

”میرا حلق کچھ کس سے نہیں ہے، میں نے کراچی میں وقت گزارا ہے۔ ابھی چند سالوں سے شہزاد پور میں رہ رہا ہوں، ویسے مجھے اس طرح کی خبریں اخبارات میں پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔“ اس نے کہا۔

”گاؤں میں جہالت بہت زیادہ ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر انسانوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔“ وہ بولی۔

”تم جب تک چاہو میری حویلی میں رہ سکتی ہو۔“ اس نے آفر کی۔

”ٹھیک ہے، تمہاری حویلی میں کون، کون رہتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں اور ملازم حویلی میں رہتے ہیں۔“

”تمہارے ساتھ والدین اور دیگر لوگ نہیں رہتے؟“

”والدین کا انتقال ہو چکا ہے، والدین کی ماموں

اولاد ہوں۔" آٹا کھد کر وہ خاموش ہو گیا۔
کارے حویلی کے اندر داخل ہونے پر احسان نے کار
کا دروازہ کھولا اور پھر اسے اندر آئے کو کہا۔
لڑکی کا نام کائنات تھا، وہ حویلی دیکھ کر حیرت زدہ رہ
گئی۔

"میں حویلی میں کہاں رہوں گی؟" کائنات نے
پوچھا۔
"تم جاہو تو اوپر کے پورشن میں رہ سکتی ہو، نیچے کے
حصے میں بھی رہ سکتی ہو، اندر کا حصہ محفوظ بھی ہے۔" احسان
نے کہا۔
کمرہ دیکھ کر کائنات مطمئن ہو گئی۔ اس کمرے کی
بات یہ تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی اس کے پاس نہیں
آ سکتا تھا۔

"یہ کمرہ میرے لیے اچھا ہے، اوپر کے حصے میں
اکیلے مجھے خوف محسوس ہوگا۔" کائنات نے کہا۔
"ٹھیک ہے، تم یہاں رہ سکتی ہو۔" احسان نے کہا۔
"میرے یہاں تو کتابوں کی پوری لائبریری موجود
ہے۔" وہ کتابیں دیکھ کر بولی۔
"ہاں میں نے یہ کمرہ اسٹڈی کے لیے مخصوص کیا ہوا
ہے۔"

"میرے اس کمرے میں رہنے سے تمہاری اسٹڈی
پر فرق پڑے گا۔" وہ بولی۔
"کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جو کتاب پڑھنے کو چاہیے
ہوگی، وہ میں یہاں سے نکھالوں گا، حویلی کے ہر کمرے
میں سکون ہے، کسی بھی کمرے میں پڑھ لوں گا۔" پھر اس
نے کہا۔ "تم مجھے چھٹی گئی ہو۔"
"ہاں میں نے ابتر پاس کے تعلیم چھوڑ دی تھی۔"
"تو کتابوں کے ہوتے ہوئے، تمہیں تہائی محسوس
نہیں ہوگی۔" اس نے کہا۔

"کتابوں سے مجھے بہت محبت ہے۔ میں اپنا وقت
فضول کاموں میں ضائع کرنے کی بجائے پڑھنے پر صرف
کرتی ہوں۔"
"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ
کھڑا ہوا۔

احسان تھک چکا تھا، اس لیے تھوڑی دیر آرام کرنا
چاہتا تھا، وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ پہلے ٹیبلٹ، ٹیبلٹ
کھا لی، پھر سو گیا۔

رات کے کھانے کا وقت ہونے پر احسان نے محمود کو
لڑکی کا کھانا کمرے میں پہنچانے کی ہدایت کی۔ اس پر وہ
بولی۔ "کیا وہ آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھائے گی؟"
"نہیں اسے کھانا کمرے میں ہی پہنچا دینا۔"
"صاحب یہ کون ہے؟" محمود یہ پوچھتے ہوئے ٹپکھا
رہا تھا۔

"وہ میرے اکل تاسم کی بیٹی کائنات ہے، چند دن
یہاں گزار کر وہ اپنے امتحان کی تیاری کرتا چلتی ہے، اس
لیے میرے ساتھ آئی ہے۔"
"اچھا یہ بات ہے، میں بھی اس لڑکی کو آپ کے
ساتھ دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔"
"پریشان ہو گئے، کیوں؟" احسان نے حیرت سے
اس کی طرف دیکھا۔

"بڑے لوگوں کے شوق بھی بڑے ہوتے ہیں، وہ
بازاری عورتوں کو کوئی، کئی دن کے لیے گھر میں لے آتے
ہیں، جب دل بھر جاتا تو چھوڑ آتے ہیں۔"
"تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟" احسان نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

"صاحب برا نہیں منانا جراتی دیوالتی ہوتی ہے، جراتی
میں انسان بھی نہ بھی بیک عی جاتا ہے، یہ فطری ہی بات
ہے۔" وہ شرمندہ، شرمندہ سا لگد ہاتھا۔

وہ شرمندہ تھا اس لیے اچھی جھپٹ مٹانے کو اس نے
کمرے کی صفائی شروع کر دی۔ احسان اسے صفائی کرنا
دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ محمود کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے
اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "پہلے اسے کھانا دے آؤ،
پھر میرا کھانا لگا دینا۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔" محمود نے کہا اور فوراً ہی
کمرے سے نکل گیا۔

آج کے سفر نے احسان کو تھکا دیا تھا اس لیے رات
کا کھانا کھا کر جلد ہی سو گیا۔
صبح آٹھ بجے کھانے پر احسان نے محمود سے پوچھا۔
"کائنات کو ناشتا دے دیا؟"

"ہاں صاحب وہ ناشتا کر چکی ہے، وہ آپ کا پوچھ
رہی تھی۔"

"اجہا میں ناشتا کر لوں، پھر اس سے ملاقات کرنا
ہوں۔" اس نے کہا۔
وہ پھر اس کے کائنات کے کمرے میں چلا گیا۔

ایک کتاب پڑھ رہی تھی، احسان پر نظر پڑتے ہی بولی۔
"تمہارا ذوق اچھا ہے، اچھی اور معیاری کتابیں رکھی ہوئی
ہیں۔"
"اس کا مطلب صبح ہی سے کتابوں کا اچھی طرح سے
معائنہ کر لیا ہے۔"

"رات نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں نے ان
کتابوں کا جائزہ لے لیا، جتنے دن میں یہاں ہوں، دن
اچھے کٹ جائیں گے۔" وہ بولی۔

"مجھ سے کوئی کام تو نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں، بس محمود ہاں سے کہہ دینا میرے متعلق کسی کو نہ
بتائیں۔"

"نئے فگر ہو، وہ کسی کو نہیں بتائے گا بوراصل میں نے
اسے بتایا ہے کہ تم میرے اکل کی بیٹی ہو، اس لیے وہ تم سے
کسی نوعیت کے سوال نہیں کرے گا، تم بھی اس سے زیادہ
بات چیت نہیں کرنا۔" احسان نے کہا۔

"تم نے بابا کو میرے متعلق اور کیا بتایا ہے؟"
"تم یہاں امتحان کی تیاری کرنے آئی ہو۔"
"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔

احسان اس سے مل کر گزریوں پر نکل گیا۔ شام گئے
واپسی پر وہ کائنات کے لیے دو جوتے لے آیا۔ وہ کپڑے
دیکھ کر چوکی۔ "ارے یہ کیا کلفت کر لیا۔"

"دراصل اس حویلی میں کوئی قانون نہیں ہے، جس
کے کپڑے پہنیں سکو، تمہارے پاس جوڑا بھی ایک ہے۔ اس
لیے لے آیا۔"

کائنات کو احسان کے پاس رہنے ہوئے کئی دن ہو
چکے تھے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاری تھی کہ نواب شاہ واپسی
جائے یا نہیں۔ نواب کے بھائیوں کے انوکھی کوشش پر وہ بری
طرح سے خوف زدہ ہو گئی۔ وہ نواب شاہ جانے کے خیال سے
ہی خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ احسان کے پاس وہ خود کو محفوظ
سمجھ رہی تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

نوابان کے پڑوس میں رہتی تھی۔ اس کا بھائی رحیم
بھائی ہی سے زیو کو پسند کرتا تھا۔ جوان ہونے پر دونوں میں
محبت کا جذبہ پروان چڑھنے لگا۔ رحیم کے والدین کا انتقال
ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے چچا رمضان سے زیو کے لیے رشتہ
بجھوایا۔ زیو کے والدین اور بھائیوں نے انکار کر دیا۔ ان
کا کائنات کے والدین سے بھی بددلی تھی، اس لیے ان کا رشتہ اور
وہ اس کے کائنات کے کائنات کے کمرے میں چلا گیا۔

اردو انسانہ باعموم اور پاکستانی انسانہ
بالخصوص 1947ء کے واقعات سے بہ شدت متاثر
ہوا۔ کوک اس کا پہلا انعام دھنکے کا تھا لیکن جلد ہی ان کو
ایک چمکندہ ٹی بی اور کچھ اچھے انسانے جیسے فکس
نگلورسے، نوپے ٹیک، جڑیں، پانچواں، دادا، گمراہ،
دغیرہ وغیرہ لکھے گئے۔ بلکہ خرقہ انجمن حیدرہ، خدیجہ،
ہائبرہ، ممتاز شہرین، انتظار حسین وغیرہ نے بہت نہیں
انسانے اس دور میں لکھے۔ پھر اس دور کے مختلف
انٹورا احساسات جیسے آزادی، ہجرت کے نتیجے میں
پیدا ہونے والے ناگہیا، فرقہ واریت، مصیبت وغیرہ
نے انسان کو ایک خوف میں مبتلا کر دیا۔ اس نسل کے
اندر خوف کی صرف مقامی وجوہات ہی نہ تھیں بلکہ بین
الاقوامی اسباب کو بھی دخل تھا۔ دو عالمی جنگوں نے
معاشرے کی صدیوں پرانی منظم روایات کو شکست د
رخت سے دو چار کیا تھا اور انسانی زندگی کا اعجاز بدل
گیا تھا۔ انسان جسمانی اور ذہنی Dislocation
کا شکار ہو گیا۔ دوسری عالمی جنگ نے بے سہارا
انسانوں کی ایک ٹھیک پونے گوب پر تعمیر دی جن
شما سے بہت سے عقوان شباب میں تھے۔ جن کی
اکثریت کو ماں کی گودی گرمی اور باپ کے سرے کی
محنت کا غیب نہ ہوتی تھی۔ نفسیاتی انجمن، برابر خوف
اور ذہنی آوارگی ان کا مقدمہ تھی۔

یہ کیفیت کی مخصوص خطا ارض، کسی ایک نسل
تک محدود نہ تھی۔ بلکہ رسل و رساں کے جدید وسائل
کرہ ارض کے تمام انسانوں کو قریب لے آئے تھے
اور سب کا دکھ سا بٹھا ہو گیا تھا۔

بازار میں دونوں میں اتنی جگہ کا ہی بیڑی کر بد مزہ کے روشن
پرکھاڑی اٹھالی تھی۔ اس دن وہ روشن کو بری طرح سے ڈکی
گردیتا، لیکن لوگ درمیان میں آگئے اور معاملہ ریل و رخ ہو
گیا۔
جب رحیم کا چچا رمضان رشتے کی بات کرنے گیا۔
وہ غصے سے بھڑک اٹھے، اور اسے گھر سے بے عزت کر
کے نکال دیا۔ اس بات نے رحیم کو متحیر کر دیا۔ وہ رشتے
سے انکار کرنے کا حق رکھتے ہیں لیکن چچا رمضان کو بے
عزت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ رحیم کو چچا کے بے عزتی
کا کھانا ہوا ہی تھا۔

سوچا تھا۔ زبیر اس کی صحت میں دیرانی تھی۔ وہ اس کی بات بلیغ کسی جنت کے مان سکتی تھی۔ جب اس نے کورٹ میرج کی بات کی، وہ فوراً مان گئی۔ اسے اس بات کی یقینی گارانتی تھی کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ وہ جوش میں ہوش کو بیٹھا تھا۔ اس نے کچھ دن کائنات کو اپنے چچا رمضان کے گھر چھوڑ دیا، اور کراچی جا کر زبیر سے کورٹ میرج کر لی۔ اس طرح اس نے اپنے چچا کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا تھا۔ رجم کا خیال تھا جب بات ٹھنڈی ہو جائے گی، وہ نواب شاہ آجائے گا۔ زبیر کے بھائیوں نے سب سے پہلے رجم کے گھر کا تالا توڑ کر قبضہ کر لیا۔ چچا رمضان نے گھر کا قبضہ چھوڑنے کی بات کی تو انہوں نے زبیر کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ رجم نے انتہائی خطرناک قدم اٹھایا تھا۔ زبیر کے گھر والوں کو اگلے پچھلے بدلے لینے کا موقع مل گیا تھا، وہ زبیر کو ہنگامہ کر کے جانے پر زبیر کی واپسی کا مطالبہ تو کر رہے تھے، لیکن اس کے ساتھ وہ کائنات کا رشتہ اور رقم کی صورت میں جرم نامہ بھی لینا چاہتے تھے، یہ سب اس لیے کیا جاتا ہے کہ کوئی اور شخص اس طرح کسی اور کی بیٹی کو اغوا یا ہنگامہ کرنے لے جائے۔

وہ کائنات پر مسلسل گمراہی رکھے ہوئے تھے کہ جب بھی وہ گھر سے باہر نکلے، اسے اغوا کر لیں، تاکہ چچا رمضان پر زور ڈالیں کہ وہ زبیر کو بازیاں کر کے دیں۔

چچا رمضان کے رشتے داروں میں اڈیروہل میں شادی کی تقریب تھی۔ مگر سب ہی افراد شادی میں جا رہے تھے اس لیے کائنات کو گھر پر چھوڑنا مناسب نہ سمجھا گیا اور اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ کائنات اس بات سے بے خبر تھی کہ زبیر کے بھائی بھی اس کے تعاقب میں آگئے ہیں، اور اس کو اغوا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کائنات کے رشتے داروں کے وہاں کی گھر تھے۔ اس نے شادی میں آنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان رشتے داروں سے ملنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

چچا رمضان کا بیٹا نوید احمد پولیس کے محکمے میں اسے ایس آئی تھا، اور نواب شاہ میں ہی اس کی پوسٹنگ تھی۔ زبیر کے بھائی چاہتے تھے کہ بازار سے کائنات کو اغوا کر لیں تاکہ چچا رمضان کو ہنگامہ مل گیا ہو تاکہ وہ زبیر کو بازیاں کر سکے، جب زبیر بازیاں ہو جائے گی تو وہ اپنی من مانی شرائط منظور کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چچا رمضان اپنی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے کہنے لگے۔

تیار ہو جائے گا۔

وہ لوگ کھات لگائے بیٹھے تھے۔ ایک گھر سے جب کائنات نکلی، انہوں نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ ان کی گرفت میں نہیں آسکی اور انہیں پھکادینے میں کامیاب ہوئی۔

احسان کو کائنات پسند آئی تھی۔ وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے جائے۔ لڑکی کا معاملہ تھا، وہ اسے اپنے پاس رکھنا وہ دن نہیں رکھ سکتا تھا۔ جب تک وہ رہتا چاہتی تھی، اپنی مرضی سے رہ سکتی تھی۔ چچا رمضان کو جتنا ضروری تھا کہ کائنات اس کے پاس ہے۔

احسان کائنات سے شادی کر کے اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ مگر بات کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

”کائنات کیا تمہارا کہیں رشتہ ملے ہو چکا ہے؟“ اس نے آخر پوچھ لی۔

”ابھی نہیں۔“

وہ اس وقت زمینوں پر سے ہو کر آیا تھا۔ اپنے گھر سے میں جانے سے پہلے وہ اس کے پاس آ گیا تھا۔

”میں سمجھ رہا تھا کہ کہیں تمہاری بات کی ہو چکی ہوگی، سنا ہے اندرون سندھ میں لڑکے اور لڑکیوں کی شادیوں کم عمری میں ہی کر دی جاتی ہیں۔“

”ہاں ایسا ہوتا ہے، لیکن میرے لیے ابھی کوئی رشتہ نہیں آیا۔“ کائنات نے کہا۔

”موجودہ حالات میں تمہارے لیے نواب شاہ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ زبیر کے بھائی اس انتظار میں ہوں گے کہ تمہیں گھر جانے سے پہلے ہی اغوا کر لیں۔“ احسان نے کہا۔

”اسی لیے میں نے چچا رمضان سے بھی رابطہ نہیں کیا کہ کہیں یہاں میری موجودگی کا زبیر کے بھائیوں کو پتا نہ چل جائے، ورنہ وہ چچا رمضان سے پہلے یہاں آجائیں گے۔“ کائنات نے کہا۔

”جب تک کچھ سمجھ نہیں آتا، یہاں آرام سے رہو اور اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے غور و فکر کرتی رہو۔“ احسان نے سہماتے ہوئے کہا۔

چند دن اور گزر گئے۔ کائنات کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ وہ خود کو یہاں محفوظ سمجھ رہی تھی۔ احسان اسے اپنی کار میں

فیس ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ کسی طرح رسک لے کر اسے نواب شاہ لے جاتا، مگر زبیر کے بھائیوں کو پتا چلے گا کہ احسان نے اسے بیچا تھا، اور اپنے پاس رکھا تھا، وہ واپسی پر احسان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

وہ محسوس کر رہی تھی، احسان اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ خود بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ اسے اتنا اچھا شوہر نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی زندگی کا فیصلہ چچا رمضان اور بھائی رجم ہی کر سکتے تھے۔ اس نے چچا رمضان سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چچا رمضان اس سے بات کر کے بہت خوش ہوا، اور اسے پولیس کی حفاظت میں نواب شاہ لے جانے کا یقین دلادیا۔ وہ خود بھی چاہ رہی تھی۔ چچا کے پاس جا کر احسان کے بارے میں پتا لے گی، اور ان کو چیل کرے گی، چچا رمضان اس کی شادی احسان سے کر دے۔ چچا رمضان نے دوسرے دن شہداد پور آنے کا کہہ کر احسان کا پتا معلوم کر لیا۔ کائنات چچا رمضان سے بات کر کے خوش اور مطمئن ہوئی تھی۔ اس کے دماغ میں جو خدشات تھے، وہ بھی دور ہو گئے تھے۔

رات جب احسان کی کائنات سے ملاقات ہوئی وہ بہت اندر ہوا تھا۔ اسے کائنات سے جدا ہونے کا احساس دہم کر رہا تھا۔

”کائنات تم کل نواب شاہ جانے کو تیار ہو۔“ احسان نے پوچھا۔

”ہاں۔“ کائنات نے کہا۔

”جیسے تمہاری مرضی، میں تمہیں نہیں روک سکتا، تم چند دن کے لیے مہمان بن کر آئی تھیں۔“

”یہ اتفاق ہے، ہماری ملاقات لکھی تھی، بہانہ زبیر کے بھائی بن گئے۔“ کائنات مسکرائی۔

”میری خواہش ہی تم یہاں رہو۔“

”میں اسی صورت میں یہاں رہ سکتی ہوں، جب ہماری شادی ہو جائے، اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“ کائنات نے کہا۔

”میں شادی کرنے کو تیار ہوں۔“ احسان نے کہا۔

”ہماری شادی کا فیصلہ چچا رمضان کریں گے۔“

”کیا وہ اس رشتے پر تیار ہو جائیں گے؟“

”نواب شاہ پہنچ کر میں ان کا ذہن ہلادوں گی، جب ہی وہ ہماری شادی کرنے کو تیار ہوں گے۔“

”نواب شاہ کی طرف سے کیا ہوگا؟“

”نواب شاہ کی طرف سے کیا ہوگا؟“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے کائنات مسکرائی۔

دوسرے دن چچا رمضان اپنے بیٹے اسے ایس آئی نوید احمد کے ساتھ پولیس گاڑی میں وہاں بھیج کر دیا۔ چچا رمضان کائنات کو دیکھ کر خوش ہو گیا، اسے گلے لگا، سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیا۔ کائنات کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔

احسان نے ان مہمانوں کے لیے اچھی دھمت کا اہتمام کیا تھا۔ چچا رمضان اس سے بہت متاثر ہوا تھا، اور اس نے احسان کی خوب تعریف بھی کی۔

جب وہ کائنات کو لے کر چلے گئے۔ احسان کو یہ گھر سوتا، سوتا گئے تھا۔ اس کے آنے سے پہلے بھی وہ اکیلا زندگی گزار رہا تھا۔ ابھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا۔ احسان نے محسوس کر لیا تھا۔ کائنات بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ وہ ضرور اپنے چچا سے شادی کے سلسلے میں بات کرے گی۔

کائنات کو گئے چند دن ہو گئے تھے۔ احسان کو اس کی یاد بری طرح ستانے لگی تھی۔ روزانہ اس کا دل کرتا تھا، وہ کائنات یا اس کے چچا سے بات کرے، لیکن بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

ایک دن احسان ناٹنے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کے موبائل پر کال آئی۔

”احسان میں کائنات بول رہی ہوں۔“

اس کی آواز سن کر احسان کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔

”کائنات تم کیسی ہو؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس تمہاری یاد بہت آتی ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ احسان نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”تمہارے بھائی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟“

”ہاں نوید بھائی سے موبائل پر بات ہوئی تھی۔ وہ کراچی میں ہے، وہاں ایک ٹیلی فون میں اسے ملازمت مل گئی ہے، اور کرائے کے مکان میں رہ رہا ہے۔“

”نواب شاہ آئے کے پاس سوکھو، اس کا کیا ارادہ ہے؟“ احسان نے پوچھا۔

”اس نے نواب شاہ آنے کے بارے میں مشورہ کرنے کی غرض سے کال کی تھی۔“

”پھر نوید بھائی نے کیا مشورہ دیا؟“

”نوید بھائی نے کہا کہ میں اسے اپنے گھر پر رکھ دوں۔“



فطرت

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!

یہ مسج بھائی میری نہیں یہ انعم اور بانو کی ہے بلکہ ہاتھوں کی
گھر گھر رہی ہے۔ اس کی زبان اور سراج نے کیسے اس کی
زندگی میں زہر بھریا اسی کا بیان یہ یہ مسج بیان۔ آپ کو بھی
پسند آئے گی۔

مریم ملک
(کراچی)

مترارف ہوتا۔ بڑا بھائی شہزاد بھی اس کو اہمیت دیتا تھا۔ اس
کی ہر بات بغیر کو کوئی لفظ ادا کیے بغیر لیا جاتا تھا۔ گویا گھر
میں بالوس پر مقدم کی۔

☆☆☆

"میرکس نے لگ گئی یہ لڑکی؟" ہانکی ماں اہم

میں سال قبل بانو بہت حسین تھی۔ بڑے بھائی کے
بندوبست میں اس کا تھا۔ اس کے بعد دو چوٹی نہیں سدھو
نمرہ جس اور دو چوٹی بھائی میل اور سبیل تھے مگر مگر راج
اس کا تھا۔ چوٹے بن بھائی والدین کی بجائے اس سے
ڈرتے تھے۔ اس کی آنکھ کے اشارے پر دوڑے دوڑے

بھائی کو نواب شاہ آنے کا مشورہ دیا ہے۔ کیونکہ زبیر کے
بھائیوں اور والدین کا خضر ابھی ختم نہیں ہوا، مگر بھی برابر
میں ہے، وہ کسی وقت بھی انتقام لینے کو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔
"ڈنکن، دشمن ہی ہوتا ہے، اس سے بھلائی کی توقع
نہیں رکھنا چاہیے۔" احسان نے کہا۔
"احسان تمہارے لیے خوشخبری ہے۔"

"کیسی خوشخبری؟"

"چچا اس رشتے کے لیے مان گئے ہیں، وہ تم سے
بہت متاثر ہیں، وہ کہہ رہے تھے کہ احسان اچھا اور بھلا
لڑکا ہے۔ وہ کائنات کے لیے بہت بہتر رہے گا، موجودہ
حالات میں سب سے بہتر ہے۔"

احسان خود بھی سبکی چاہتا تھا کہ زبیر کے بھائیوں کو ان
کی شادی کے بارے میں فوری بتا دے۔ ایک مختصر
تقریب میں ان کا نکاح پڑھا کر پائیس گاڑی میں کائنات کو
رضعت کر دیا گیا۔ زبیر کے گھر والوں کو اس نکاح کے
بارے میں اس وقت علم ہوا، جب کائنات گھر سے رضعت
ہوئی۔ چچا رمضان نے اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو
نئی عمارت کیا تھا کہ کائنات کا شوہر احسان کراچی میں رہتا
ہے۔ زبیر کو بھی کائنات کے نکاح کے بارے میں بتا دیا گیا
تھا لیکن وہ نواب شاہ نہیں آسکتا تھا۔ اس نے احسان اور
کائنات کو کراچی آنے کی دعوت دی تھی۔ احسان کو جیسے ہی
خراشت لی وہ کائنات کو کراچی میں زبیر سے ملاقات کرانے
لگا۔ احسان کو کچھ خریداری کرنا تھی، اس لیے وہ کائنات
کو چھوڑ کر بازار چلا گیا۔ راستے میں ایک جگہ اسے عرش نظر
آئی، وہ پوسیدہ سے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ احسان نے اس
کے پاس گاڑی روک دی۔ وہ اپنے پاس بڑی سی گاڑی
رکھنے لگے کچھ پر تھی۔

"عرش کہاں جاؤ گی، آؤ میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

احسان نے کہا۔

اس نے احسان کو حیرت سے دیکھا، اور گاڑی میں
بیٹھ گئی۔

"یہ کس کی گاڑی ہے؟" اس نے پوچھا۔
"میری گاڑی ہے۔" احسان نے بتایا۔
"تمہاری گاڑی، اتنی رقم تمہارے پاس کہاں سے
آئی؟"

"میری قسمت کھل گئی ہے، دور پرے کے ماموں
خوب دولت میرے لیے چھوڑ گئے تھے، میرے کام آ رہی
ہے۔"

احسان کی گاڑی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی،
جہاں اسے شانگ سینٹر سے خریداری کرنی تھی، وہ کائنات
کے لیے ابھی ہی شاپنگ کرنا چاہتا تھا، اور اسے ایسے تھاٹک
دینا چاہتا تھا کہ وہ کچھ نہ کر دے خوش ہو جائے۔

ہمارے ہی تھے۔
 "تو بارگاہ ہے یہاں مت کھلا کرو۔ اپنے گھر کے دروازے پر کھلا کرو۔ پر نہیں، تم لوگ ایسے نہیں جھوٹے۔ آج تو میں تمہاری ٹھیک والی کلاس لوں گی۔" ہالو محلے کے بچوں کو دھتے ہوئے ہوئی۔

"چل چھوڑ جانے دے ان بچوں کو۔" انہم نے ہالو کا ہاتھ بچے کے کان سے دھتے ہوئے کہا۔
 "اماں تم تو رہے ہی دو۔ ہر بار انہی بچوں کا ساتھ دیتی ہو اس لیے یہ شہر بنے ہیں۔" ہالو انہم کی طرف متوجہ ہوئی جبکہ اپنی جان بخشی ہوئی دیکھ کر دوسرا وہ بچہ۔
 "چل گھر چل، اب تو بچی نہیں رہی، اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے۔ محلے کی کوئی بچی اس طرح دروازے پر کھڑی ہو کر ادنیٰ آواز میں نہیں لڑتی جس طرح تو لڑتی ہے۔" انہم۔

ہالو کا ہاتھ پڑ کر گھر کے اندر لے آئی۔
 "تو بچی بارگاہ بچی ہوں تھے کہ اس طرح کی حرکتیں نہ کیا کرتی تھی لیکن تیری زبان ہے۔ کوئی نہیں آئے گا تجھے۔" انہم شفقت سے ہالو کے سر پر ہاتھ پھیر کر ہوئی۔
 "ہاں، تو نہ آئے کیا ہے۔ میں بھی کوئی مری نہیں ہمارے شادی کے لیے۔" سچی بارگاہ ہے ہالو مت کہا کرو، میرا نام پیش ہے۔ دادی خود تو مری پر ہالو نیم کی عادت سب کو والی تھی۔" ہالو غصے سے لال پکلا ہوتے ہوئے ہوئی۔

"چل پتر غصہ نہ کر۔ میں تیرے محلے کے لیے ہی سمجھاتی ہوں۔ یہ تازہ خرے صرف ماں باپ اٹھاتے ہیں، مالکے گھر جانے کی تو وہ تیرا اس طرح کا رویہ نہیں ہے گا۔ اپنے دل میں کچھ تری پیدا کر اور زبان سے یہ نہ کروا ہٹ نکال پیچک۔ اگر تیری زبان سے یہ لاوا مسلسل نکلا رہا تو کوئی اچھا نہیں جانے گا تجھے۔" انہم نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"اچھا مجھے ہموک لگ رہی ہے، کچھ کھانے کو دو۔" ہالو منہ دھتے ہوئے ہوئی۔
 "تو دوسرا خزان بچہ اور باقی بہن بھائیوں کو بھی پلا لے۔ میں جب تک کھانا لاتی ہوں۔" انہم کہتے ہوئے مگن کی جانب بچی کی۔

☆ ☆ ☆
 "اب اس نے کیا کرنا جو اس کے ہمارے کی شامت

ہم جی ہے۔" انہم نے ہاتھ پر تیریاں چڑھا کر پوچھا۔
 "اماں یہ دو بچوں میں کھل آیا ہے، اس کی ٹیڈیشن کی مچھرا سے کچھ نہیں پڑ سکتی۔ پس فیس وصول کرتی ہے۔" ہالو دانت چیر کر ہوئی۔
 "میں آج جا کر اس کی مس سے ہاتھ کروں گی۔"

انہم گھر میں ہوئی۔
 "اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسکول کی بچوں کے بعد ہی جی اور ٹھیک شاک بنا کر آئی ہوں۔ اب کوئی ضرورت نہیں اس کو اس ٹیڈیشن میں جھینے کی۔"
 انہم ہالو کی بات پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اسے اب کچھ معنوں میں اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر نہ تھی۔

☆ ☆ ☆
 دن گزرتے جا رہے تھے۔ ہالو میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو چکی تھی۔ رزلٹ آچکا تھا۔ ہالو نے اچھے نمبروں سے دسویں پاس کی تھی۔ گھر والوں نے اسے بار بار سمجھا دیا لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی کہ اسے آگے تعلیم جاری نہیں رکھنی۔ بڑے بھائی شہباز نے اسے لڑکیوں کی تعلیم حاصل کرنے کے بہت سے فوائد سے آگاہ کرنا چاہا مگر ہالو نے درجی سے ٹوک دیا۔ سدرہ ساتویں کلاس میں تھی اور غرہ تیسری میں جبکہ جمیل انھوں میں تھا اور اسکول پانچویں میں۔ شہباز ملک سے باہر نوکری حاصل کرنے کے لیے کوشش کر رہا تھا۔

مگر انہم شہباز کو باہر بھیجنے سے پہلے اس کی شادی کر دینا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں اپنے شوہر سے بات کر چکی تھی۔ امین ایک نیتے قبل سکھر سے گراچی آچکے تھے۔ ان کے پاس ایک اچھی خبر بھی تھی۔ وہ نوکری کے سلسلے میں ایک سال پہلے سکھر چلے گئے تھے اپنی کہنی کے ہمراہ۔
 "آپ اب بھی نہ آتے، ہو جیے وہیں سکھر میں۔" ہالو ہراسی سے ہوئی۔

"میں وہاں شوق سے نہیں رہ رہا میرا بچہ۔ کون جانتا ہے کہ اپنے گھر سے دور رہے۔ یہ سب میں تم لوگوں کے لیے کر رہا ہوں تاکہ تم اچھا کھاؤ اور اچھا پہن سکو۔" امین ہالو کی طرف دیکھ کر مگر ہوا۔
 "ہاں ہاں، ہم جو آپ کی شکل دیکھیں تو کبھی بڑس گئے۔" امین نے ہالو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

ہالو ہر وقت گلے شکوے کرتی رہتی اور جب گلے

جی کی اٹھارہ کو وہ انہیں سال کی ہو چکی تھی۔ اس کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ شہباز ہالو کے لیے ڈیجیٹر سارے گلے لایا تھا اور دل ہی دل میں اپنی بہن کے لیے دعا گو تھا۔
 سالگرہ کے دو روز بعد ہالو کی خالہ علیہہ خاندان سے گراچی کسی خاص مقصد کے تحت آئی تھی۔ علیہہ نے اسی شام اپنے آنے کا دعایاں کیا۔ انہم کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، امین کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔

"میں اپنا عابد بہت پسند ہے۔ اچھا بچہ ہے، ہمارے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے۔ اچھا کھاتا ہے، ہالو کے لیے اس سے بہتر بہن ہوسکتا ہے۔" انہم خوشی سے ہرشار تھی۔
 "مگر باپ... میری خواہش ہے کہ پیش میرے عابد کے لیے ہو اور کائنات اپنے شہباز کے لیے۔ اگر میں اپنی کائنات کا ہاتھ کی اور کے ہاتھ میں دوں گی تو مجھے ہر وقت فکر لاحق رہے گی۔ اگر میری کائنات اس گھر میں آجائے تو میں ہر طرح کی پریشانی سے آزاد رہوں گی۔"

علیہہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔
 "میں کوئی اعتراض نہیں ہے بہن۔ جس طرح مجھے ہالو عزیز ہے اسی طرح کائنات بھی ہے۔ آپ بس شادی کی تیاری کریں۔" امین نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔
 ہالو گھر کے دروازے سے گل کر کھڑی سب سن چکی تھی۔ وہ اس سب کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ کمرے میں جانا چاہتی تھی، انکار کرنا چاہتی تھی پر کسی سوچ کے تحت خاموش ہوئی۔

ہالو چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی اور بیڈ پر سیدی لیٹ گئی۔ اس رشتے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے دماغ میں کی سوال ابھر رہے تھے۔
 "میں انکار کروں بھی تو کوئی جواز تو ہو میرے پاس؟ ویسے بھی آج نہیں تو کل میری شادی ہوتی ہے۔ عابد اچھا ہے، سلجھا ہوا، شکل صورت بھی پیاری ہے، ایسے میں انکار کرنا بیوقوفی ہے۔" وہ سوچوں میں گمن تھی کہ غرہ کی آواز اسے حال میں لے آئی۔

"آپ کی شادی ہو رہی ہے کیا؟" منہی غرہ نے پوچھا۔
 "ہاں، آپ کی شادی ہو رہی ہے کیا؟" منہی غرہ نے پوچھا۔
 "ہاں، آپ کی شادی ہو رہی ہے کیا؟" منہی غرہ نے پوچھا۔

☆ ☆ ☆
 "آپ اس نے کیا کرنا جو اس کے ہمارے کی شامت

"آپ کی شادی ہو رہی ہے کیا؟" منہی غرہ نے پوچھا۔
 "ہاں، آپ کی شادی ہو رہی ہے کیا؟" منہی غرہ نے پوچھا۔
 "ہاں، آپ کی شادی ہو رہی ہے کیا؟" منہی غرہ نے پوچھا۔

☆ ☆ ☆
 "آپ اس نے کیا کرنا جو اس کے ہمارے کی شامت

☆ ☆ ☆
 "آپ اس نے کیا کرنا جو اس کے ہمارے کی شامت

☆ ☆ ☆
 "آپ اس نے کیا کرنا جو اس کے ہمارے کی شامت

☆ ☆ ☆
 "آپ اس نے کیا کرنا جو اس کے ہمارے کی شامت

☆ ☆ ☆
 "آپ اس نے کیا کرنا جو اس کے ہمارے کی شامت

عالمی اپنے سینے سے آجائے گی تو جسیں کم کام کرنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں تم پر دست داریاں بہت ہیں پر ضروری ہے کیا برکت جتنے رہتا۔ ماما کہ تم اپنی دست داریوں سے منہ نہیں پھرتی۔ مگر ان دست داریوں کو جھانکے گا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ اتنا تو تم کام نہیں کرتی جو جتنی چلی گئی سناٹی ہو بھی گئے تو بھی اسی کو میرے کان تک مجھے جہاں تمہاری روزروزی لڑائیوں سے۔ "عابد قدرے تیز لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا، میں لڑتی ہوں کیا ہر وقت؟ میں نے اسے کام بھی اپنے سینے میں نہیں کیے۔ اگر یہاں کر رہی ہوں تو میرے شکر گزار ہوں۔" سر پر ہاتھ مار کر بولی۔ "میں اس گھر کے لیے کچھ بھی کر لوں مگر آپ کی وہ سگی کترو بھائی ہی رہے گی۔"

بانو بولنے پر ہونے کمرے سے باہر چلی گئی۔ یہ ان کی پہلی لڑائی تھی اس کے بعد ہر شام عابد کے چاب سے آتے ہی بانو کی نہ کسی بات کو لے کر لڑنے لگتی۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہو چکا تھا۔ گھر کا ہر فرد بانو سے بات کرنے سے گریز کرتا۔

علیہ اب کچھ ہفتوں کی کترو اور بانو کے ساتھ مل کر گھر کے کام فرماتی۔ کترو کے لاکھنؤ کرنے کے باوجود علیہ گھر کے کام کیا کرتی جبکہ بانو کا موڈ ہمیشہ ہی خراب رہتا۔ اس دن سورج کے غروب ہوتے ہی عابد گھر آیا تھا کہ بانو کا موڈ پھر سے بگڑ چکا تھا۔ اس کے موڈ بگڑنے کی وجہ جھٹکا کی کاٹیا تھا جو عابد نے آنے سے قبل بانو کے کمرے میں آ یا تھا اور سنگھار میز پر رکھی کالج کی چوڑیوں کو کرچی کرچی کر کے چاچکا تھا۔ بانو کا بارہوا ہائی ہوا اور وہ دوڑتی ہوئی کترو کے کمرے میں جا چکی۔ عاصم چار پالی پر لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بانو نے عاصم کے گال پر دو چھوڑ سیدھے اور اونچی آواز میں ڈانٹا۔ عاصم تیز آواز میں رونے لگا۔ عاصم اور بانو کے چائے پر کترو، عابد اور علیہ کمرے میں چلی آئیں۔

"چینی نے مارا۔۔۔ چینی نے مارا۔" عاصم روتے ہوئے بولا۔

"برنج کی کد ہوتی ہے بانو۔ تم ہمیں برا بھلا کہتی ہو ہم خاموش رہتے ہیں اس لیے نہیں کہ ہم ڈرتے ہیں تم سے، ہماری خاموشی کی وجہ گھر کا ماحول مزید خراب کرنا نہیں ہے۔ اب تم نے میرے بچے کو مارا ہے یہ میں برداشت نہیں کرتی۔ آج اسے مارا تو تم نے۔" عابد نے بانو کی طرف دیکھا۔

"کترو نے تمہاری اٹلی اٹھا کر ہمارا گروایا۔"

"تم کوئی کون ہو مجھے دھمکی دینے والی۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔" بانو نے اسے چلاتے ہوئے کترو کو مارنے کے لیے آگے بڑھی۔ عابد نے برق رفتاری سے بانو کی کلائی پکڑی اور پک پکھٹتے ہی منہ پر ڈانٹے دار پھینک دیا۔

بانو اپنے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے چینی سے عابد کو دیکھنے لگی۔

"تم نے مجھے اس کی وجہ سے مارا، میں جا رہی ہوں اپنے گھر، تم جانتے تھے نا کہ میں اُمید سے ہوں۔ تم نے پھر بھی مجھ پر ہاتھ اٹھایا، جس میں اس کا خیال نہ بچھتا پڑے گا۔" بانو اپنی بات مکمل کر کے کمرے کی جانب چلی۔ بیک میں کپڑے، جوئے اور چند دیگر ضروری اشیاء ڈالے، پیسے اور چادر اٹھا کر کمرے سے باہر آئی۔

"تمہارا دامخ تو درست ہے اس وقت اسکی کہاں جاؤ گی تم۔" عیال بیوی میں لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بیوی گھر چھوڑ کر چلی جائے۔" علیہ نے اسے جانے سے روکا۔

"یہ میرا اور عابد کا معاملہ ہے، مجھے ہے آپ اس سے دور رہیں۔ ایک اور بات اسے کہہ دیجیے گا کہ بچہ ہوتے ہی مجھے طلاق دے دے۔" بانو صدر گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

بندر ہوتے قصبہ کا نام مسمیٰ گئے تھے۔ بانو کی اتنی ہوئی شکل، غم محال سا وجود، ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک لیے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اہم کے قریب آئی اور پھر مکے لگ کر دل کھول کر روئی۔ تمام افراد پریشانی سے بانو کو مکے جا رہے تھے۔

سردار نے آگے بڑھ کر دونوں کو الگ کیا تھا۔ کائنات، بانو کو اس حالت میں دیکھ کر چپ رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اس سے کسی بھی قسم کا سوال کرے گی تو وہ اسے ہی برا بھلا کہے گی۔

"کیا ہوا ہے میری بچی کو؟ تو اکیلی آئی ہے کیا؟" اہم نے دروازے کی طرف انور دیکھ کر پوچھا۔ سردار دروازے کی جانب پھرتی سے چلی اور پھر اگلے قدم واپس چلی آئی کیوں کہ ہاں کوئی نہ تھا۔

"مجھے عابد سے قطع چاہیے۔" بانو نے سر دھری سے کہا۔

سردار نے بانو کی طرف سے دیکھا۔ کیا کاروبار کرتے آئی ہے تاجھے۔" اہم تھلا گئی۔

"شہباز بھائی آئے تو انہیں کمرے میں بھیج دینا۔" سردار اور کائنات تم اچانک ایک ایک کر دو اور یہاں سے چلتی بنو۔ میں اگر خوش نہیں ہوں تو تم بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔" بانو کائنات کی طرف دیکھ کر بولی۔

"بانو بیٹا تم کب آئی۔ میں تمہاری امی سے آج کہہ رہا تھا کہ تم سے ملنے چلتے ہیں۔ اس طرح کائنات جی بھی اپنے گھر میں آئی۔ چلو اب تم آگئی ہو تو ہم پھر بھی جا سکتے ہیں۔" امین نے بانو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

بانو امین کی بات کا جواب دینے کی بجائے کمرے میں چلی آئی۔

☆ ☆ ☆

بانو کا رویہ سینے آنے کے بعد بھی نہ بدلتا تھا، وہ سب سے لڑتی جھگڑتی رہتی۔ کائنات برا کٹر چلاتی مگر کائنات اٹلی ٹھرتی کا مظاہرہ کرتی۔ اس سے نرم پشیمانیوں سے بات کرتی۔

"آئی مبارک ہو شہباز بھائی کا بیٹا ہوا ہے۔" سردار خوشی سے چہکتی ہوئی بولی۔

بانو اندر سے جل بھن کر رہ گئی کیوں کہ کائنات اپنے شہر سے ہر لاڈ اور نخرے اٹھاتی تھی۔ پورے محلے میں مٹھیاں پائی گئی۔ اس خوشی کے موقع پر عابد اور علیہ بھی کراچی آچکے۔ اہم اور امین سے درخواست کرنے لگے کہ وہ بانو کو سمجھانے کو۔۔۔ ہمارے ساتھ واپس چلے۔ اہم نے بانو کو کئی بار سمجھایا تب جا کر اس نے ہوش کے ناخن لیے اور سرسرا جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ سرسرا آکر بانو کے حراج میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئی۔ جبکہ عابد پہلے سے زیادہ بانو کا خیال رکھنے لگا تھا۔ علیہ اسے پھل، بزی پلاس کھلائی اور گھر کے کام کو ہاتھ نہ لگانے دیں۔ چند روز بعد ہی اللہ نے بانو کو رحمت سے نوازا۔ امین کا نام عابد نے منال رکھا تھا۔ مگر کے بھی فرد منال کو پیار کرتے اور اسے ہر وقت گود میں لیے رکھتے۔ ایک مہینہ بہت پرسکون گزارا تھا لیکن اس کے بعد وہ پھر سے لڑنے لگتی تھی اور منال کو ہاتھ لگانے نہ دیتی جس پر عابد بھی بھڑک اٹتا۔ آج بھی علیہ، منال کو گود میں لینے کے لیے کمرے میں آئی تو بانو نے داد عطا دیا۔ اس نے غصے میں آکر علیہ کو دھکا دیا، وہ گر کر پڑے۔ بچی کیونکہ عابد نے اسے تمام لیا تھا۔ بانو انیس میں آئی ہوئی تھی کالیاں کھینچے گئے تھے اور بار بار عابد سے طلاق کا مطالبہ کر رہی تھی۔

عابد نے بانو کی طرف سے دیکھا۔ کیا کاروبار کرتے آئی ہے بغیر تین بار طلاق دے بیٹھا۔

بانو حیرت سے گل بنی۔ عابد کو دیکھتی تو بھی حیرت کو۔ ہوش کی دنیا میں آتے ہی اپنا پورا یا بستر سمیٹ کر وہ جانے کے لیے کمرے سے باہر آئی تو عابد نے منال کو اس سے یہ کہہ کر لیا۔ "تم اس کی پرورش کیا خاک کرو گی جس میں تو خود خوروت ہے تیرے۔ تم میری بچی کو کبھی بے باک اور بد زبان بنادو گی اس لیے یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔"

بانو کو مطمئن تھا کہ وہ منال کو اپنے پاس رکھے گا مطالبہ کرے بھی تو وہ اتنی مضبوط اعصاب کی مالک نہیں ہے کہ اسے عابد سے لے لے۔ اس لیے بغیر کچھ کہے وہاں سے اٹھنے کے لیے نکل گئی شہین کا سفر کر کے دو کراچی آئی۔ میکے آتے ہی بیٹھک سے آئی آوازوں سے وہ اعزاز و لگا بچی تھی کہ سردار کے ہونے والے سرسرا لے آئے ہیں۔ سب سے نظر بچا کر وہ چھت پر چلی آئی۔ مہمانوں کے جانے ہی وہ بچے اہم کے پاس آئی اور عابد کے طلاق دینے کی خبر سنائی۔

شہباز پر وہ کئی بار زور دے چکی تھی کہ وہ کائنات کو طلاق دے اور منال کو واپس لے کر آئے۔

شہباز کائنات سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ کائنات سے بھی زیادہ اسے بانو عزیز تھی۔ بانو کی محبت میں آکر اس نے کائنات کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیا اور اپنے بیٹے شازل کو کائنات کے حوالے کر دیا۔ بدلتے میں اس نے منال کو مانگ لیا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا کہ بانو کو اپنے بھائی شہباز کی فکر پھر سے ستانے لگی اور اس نے نئی بھائی کی تلاش شروع کر دی۔ یہ تلاش جلد ہی ختم ہوئی اور اس نے سانو لے رنگ کی عام سے نقوش کی لڑکی سے اپنے بھائی کی شادی رچا دی۔

بانو کے اس فیصلے پر کسی نے بھی اعتراض نہ کیا۔ وقت گزرتا رہا منال سات سال کی ہو گئی۔ بانو نے منال کی پرورش میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ بچی سب سے پیار سے بات کرتی تھی۔ اسکول میں پوزیشن لینے والی بچی تھی۔ اپنی بیٹی کو تیز و تہذیب سیکھانے کے باوجود بانو اب بھی محلے داروں سے لڑتی اور اپنی بھائی رہا ب کو لڑاتی رہتی۔ رہا ب ڈری سکھی ہی بانو کی ہر بات مانا کرتی تھی۔ بانو کو بائبل ایسی ہی لڑکی اپنے بھائی کے لیے چاہیے تھی اور اسے وہ مل چکی تھی۔ شہباز اب بھی اپنی ساری خواہاں اپنی بہن کے ہاتھ میں لاکر رکھتا تھا۔ گھر کا سوا سلف بانو لایا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ گھر کی ان کی اپنی اپنی کپڑاں اور دھڑکی پینے کے مقابلے میں رقم ا



جنت

مکرم و محترم مدیر سرگزشت
السلام علیکم!

یہ ایک ایسی سچ بیانی ہے جسے میں نے سیدھے سادے لفظوں
میں لکھا ہے کوئی لڑا ما کوئی غلط بیانی نہیں کی ہے جو کچھ
اس بچی پر گزری ہے وہی کچھ لکھا ہے۔ اللہ کو دوست رکھنے
والے اسے پکارنے والے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ جنت کی زندگی
کبھی اعلیٰ سے اعلیٰ ہوتی آپ بھی ملاحظہ کریں۔

اختر سردار چوہدری
(مسماہوال)

کاک آج تھا اور جو وہ چچا کا تھا اور ان کی دکان میں موجود
نہیں ہوتی تھی۔ وہاں تو چھ رکت کے ڈبے، کچھ ٹیوں کے
ٹیکٹ، اور ایسی ہی بچوں کے لیے کھانے کی چیزیں تھیں۔ ان
سے کتنی آدھان ہو سکتی تھی؟
وہ ایک وقت کا کھانا کھاتے اور بچے کا کھانا کرتے
تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ نہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے
والدین سے کچھ نہ لے سکتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے
کچھ نہ لے سکتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے

اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔
نمرہ اچلی رحمت اور مہربانی کی حامل تھی اور فرزند نمرہ
سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ بھری فراز کے گھر والے اس کے
گھر رشتے کر آئے تھے۔ رشتے کرتے ہی نمرہ کو کھانے کی
انگوٹھی پہنا کر آنے والے مہینے کی چھ کو شادی کی تاریخ بتا
کر دی تھی۔ بالوں نے بڑھ چڑھ کر شادی کی تیاریوں میں حصہ
لیا۔ آج بھی فراز کے ساتھ شادی کی شاپنگ کے لیے بائیک
پر جاری تھی کہ سائے سے آتے ٹوک سے بائیک کا زوردار
قصاص ہوا۔ قصاص ہوتے ہی دونوں دنیاؤں مافیہا سے بے خبر
ہو گئے، بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لائے گئے۔ اسپتال
میں امیر جنسی میں ہانو کو ایڈمٹ کیا گیا۔ فراز جیسے ہی ہوش
میں آیا اس نے گھر والوں کو اطلاع دے دی۔

گھر والے آدھے گھنٹے بعد اسپتال میں موجود تھے۔
فراز کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ فراز کی دفعہ پانی مانگ چکا تھا مگر
ڈاکٹر اسے پانی پلانے کے حق میں نہ تھے۔ ان کے
مطابق تین گھنٹے بعد اسے پانی دیا جائے گا۔ فراز بھی پانی
کی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ ایسے میں موت جوش میں آئی اور
فراز کو دو گھنٹہ پانی پلا دیا۔ پانی پیتے ہی فراز اس دنیا سے
بچنے کے لیے منہ موڑ گیا۔ ہانو دنیا کی فکر سے آزاد ہوا ایک
سے بیگانہ بے ہوش تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ہانو کا بچپن مکمل
نہیں ہے۔ تین روزہ اسپتال میں زندگی موت کی جنگ لڑتے
لڑتے وہ بھی جاں بسی۔

☆☆☆

پانچویں قسمت کا پیر تھا یا اس کی فطرت کا اثر کہ ہانو
زندگی بھر خوش نہ رہی۔ اسے اس دنیا سے ملے چوتھا مہینہ تھا
کہ نمرہ کے لیے بہت اچھا رشتہ آ گیا۔ انہوں نے فوراً ہاں کی
تھی۔ سہیل اور سہیل کے لیے بھی مناسب رشتہ مل گیا تھا۔ انہوں
نے تینوں کو بیاہ کر اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ لیکن انہوں پر ایک
فرض ابھی بھی قرض تھا اور وہ کتنی سال۔ انہوں کی سالیں جب
تک چل رہی تھیں، وہ حال کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا چاہتی
تھی۔ رہا بے ہانو کے چاہتے ہی سکھ کا سانس لے کر اوپر
والے پورے میں شفقت ہو گئی۔ انہوں نے ساری جائیداد برابر
تقسیم کر کے خود کو کوئی الفیہ نہ کر دیا تھا۔ انہوں کے پاس اس کی
اپنی سال تھی جو اس کی آخری تنخواہ تھی اس کی بیٹی کی نشانی
تھی۔ وہ مضبوط ہاتھوں میں ہونے کے باوجود اپنے گھر والوں سے

دل ہو سکتی تھی۔ کم تر کی مدد کرتی۔ خوب سراؤں کو کھانا کھاتی۔
نمرہ سے رتی اور بدلے میں دعا نہیں لیتی۔ سدرہ کی شادی
ہانو کی مرضی سے ملے ہوئی تھی وہ اپنے گھر میں بے حد خوش
اور مطمئن تھی۔ ہانو کے کانوں میں عابد کے آخری الفاظ آج
بھی گونج کر رہے تھے۔ ہانو نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی
بیٹی کی تربیت اچھی سے اچھی کرے گی۔ وہ وعدہ بھاری
تھی۔ رہا بے ہانو کا پہلا بیٹا ہوا تو وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔ شہباز
سودری عرب میں تھا پر اپنے بیٹے کی پیدائش کا سن کر
پاکستان آنے کی خواہش ظاہر کی تو ہانو نے روک دیا۔ وہ دو
سال بعد پاکستان آیا جب تک اس کا بیٹا چھ دو سال کا ہو چکا
تھا۔ وہ چنا پھر رہا تھا۔ گھر میں میز کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر
دیکھتا تو بغیر خوف و ڈر کے ملے کے لیے تیار رہتی۔ شہباز
چھ روزہ کر دیا تھا۔

ہانو انہوں سے مشورہ کرنے کے بعد دونوں چھوٹے
بھائیوں کے لیے رشتہ ڈھونڈنے لگی۔ مگر اسے کوئی رشتہ نہ
مل سکا۔ ٹوک ہانو کے مزاج سے کھڑے تھے اس لیے رشتہ ڈھونڈنے
سے انکار کر دیتے تھے۔ ہانو لڑکی نہ ملنے پر ٹھک ہار کر بیٹھ
گئی۔ اس دن ہانو شہباز سے ویڈیو کال پر بات کر رہی تھی کہ
اجانک موصول ہونے والی خبر نے اس پر شکنہ طاری کر دیا۔
ہانو کے والد گھر میں کام کرتے ہوئے ہارٹ ایک سے
ہلاک ہو گئے تھے۔

ہانو کی موت کے فتنے ان کے گھر پر قیامت توڑ
دی تھی۔ سدرہ اپنے تین بچوں سمیت کراچی آ گئی تھی۔ ہانو
کی خالہ بیٹہ بھی اس حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ تمام
لوگ کتنے دن تک رک کر چلے گئے۔

ہانو کو ماں کی موت نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس
کے پاس سب کچھ تھا مگر بھری تنہا تھی۔ خیر کا بوجھ اسے
مختور رہا تھا۔ خود سے کتنی نا انصافی اور کائنات کو بے گناہ
ہونے کے باوجود اسے زندگی موت دے چکی تھی۔

کائنات اور عابد کی ایک سال بعد شادی ہو گئی تھی
نیکو دو دونوں ہر طرح سے اچھے تھے۔ ہانو نے خود کو
بھلانے کے لیے کپڑے پہنے خروار کر دیے تھے۔ منال نے
بھی میزک پاس کر لی تھی۔ نمرہ تین سال کی ہونے والی تھی مگر
اب تک شادی کے بندھن میں نہ بندھی تھی۔ نمرہ کا رشتہ
خانہ میں نہ ہو سکتا تھا اس کی بیاہ ہانو کی بیٹی تھی۔

ہانو نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ وہ اپنے گھر والوں سے
رہا بے ہانو کی عمر گھروں پر پڑی اور اپنے گھر والوں سے

ظہر پر کام کرتے ہوئے ایک دیوار کے نیچے آکر شہید ہو گئے تھے۔ وہ دیوار کے پار سے علم ہوا تھا کہ وہ اس کے پیدا ہونے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ اس کے بعد کی زندگی کے شب و روز تھے۔ وہادی جان بھی اور وہ بھی۔ زندگی کی بے کیف و مشکل ترین دن رات گزارتے ہوئے پانچ سال کا وقت بیک پیچھے ہی گزر گیا تھا۔

جب اس کے باپ زندہ تھے تو زندگی کتنی حسین تھی۔ سب کو محبت مل رہا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ والد ایک ساتباں کی طرح ہوتا ہے۔ اس کا والد محنت کش تھا، مزدور تھا۔ گھر میں ایک بیڑا سفر وادی بھی۔ وہ والدین کی ایک ہی بیٹی تھی۔ سارا دن کی مزدوری سے جو کما کر لانا اس سے اس کی والدی کی والدی اور رخت کے لیے درود کھانے پینے کی چیزیں لے لانا تھا۔ اکثر کھانا اسے بازار سے خریدنا پڑتا۔ کیونکہ گھر میں کوئی پکانے والا جو جو نہیں تھا۔ اس کے والد اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کا کلیجہ چٹ چٹا چٹا سوچتا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اتنی ہی عمر میں اسے چھوڑ گئے۔ یہ چھوڑ جانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ انسان کے اختیار میں ہے کیا؟ وہ سوچتی رہتی اور سوچوں کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتی۔ یہ گہر بڑا بڑا تھا۔ لیکن ذاتی تھا جو اسے والد کی طرف سے ورثہ میں ملا تھا۔ اسی جرجر، بوسیدہ، چھوڑ چھوڑ گئی ایک لڑکھائی ہوئے زندگی گزار رہی تھی کہ کل اچھا آئے گا لیکن وہ بھول رہی تھی کہ مزدوروں کا جب آج جاتا ہے تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس دن سچ سوچا لیکن میں آتی ہی اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر آسمان پر گہرے اہل محراب تھے۔ تو وہی لڑکھائی بعد بڑھتی گئی شروع ہو گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج بھی باپ کی کام سے پہنچی ہو جائے گی۔ آج بھی بچے گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ آج بھی ان کی دکان پر کوئی خریداری کرنے نہیں آئے گا۔

وہ انہی سوچوں میں گم مگم رہتی باڑش کو دیکھ رہی تھی۔ ایک غریب کے دن رات کیسے گزرتے ہیں جس نے گزارے ہوں اسے ہی علم ہوتا ہے۔ اس نے برآمدے میں بیٹھی زادگی الما کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر سوچنے لگا کہ کب کب سے یہ سچ ہوئی اس بات پر انکس گئی کہ اس کے پیارے ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر چڑھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے دل سے کہا کہ یہ قبر مجھ کی ہے۔ چنانچہ بھونکے گھر سے اگھر چھوڑ کر گئی۔ لاؤ لاؤ دیکھ رہی تھی۔

آنے والی آواز کو وہ بھی سے سنتی، بعد کا غلبہ تو بڑے غور سے سنا کرتی تھی۔

مٹلے والے اور شرارتی بچے اسے جیم ہونے کے طعنے دیتے۔ اسے شہادت کی نظر سے دیکھا جاتا تو اس کا دل جیسے کٹ کر رہ جاتا۔ کچھ مٹلے کی خواہشیں بھی اسے بھیجنے سے ہی منہیں خیال کرتی تھیں کہ اس نے پیدا ہونے ہی اپنی ماں کی جان لے لی تھی اور چار سال کی عمر میں اپنے والد کو بھی بھگتی تھی۔ یہ الفاظ ان کو دونوں کے تھے جو اس کی پڑوس میں رہتی تھیں۔

اس کی دادی الماں پہلے ہی بیمار رہتی تھی لیکن آج کل اس کی بیماری نے شدت پکڑ لی تھی۔ ایک دن دادی الماں نے اپنے اپنے پاس بٹھایا اور کہنے لگی۔ "بیٹی تم اپنے ماموں کے پاس چلی جاؤ۔ وہ شہر کے نزدیک ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔" دادی الماں کے لہجے میں کرب جھلک رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے تھے۔ جنت سے دادی کے یہ آنسو دیکھے نہ گئے۔ "نہیں الماں میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

اس کے لیے میں عزم تھا لیکن جو دادی الماں جانتی تھی وہ جنت نہیں سمجھ سکتی تھی۔ دادی جانتی تھی یہ درندوں کا معاشرہ ہے یہاں قبیلوں اور بے سہاروں کے ساتھ تاروا سلوک کیا جاتا ہے۔ جیم بچی کے لیے اس معاشرے میں زیادہ خطرات ہوتے ہیں اس لیے اس نے اپنے ہاتھ جنت کے سامنے جوڑ دیے۔

"بیٹی خدا نہ کر چلی جا۔ میرا وقت قریب ہے کہ میں آج مر جاؤں یا نہیں۔ اس کا کوئی پتا نہیں۔ تم میرا سہارا بنو۔ خود اپنا آپ بچا کر لیاں۔ اور کہیں محفوظ جگہ پر چلی جاؤ۔ جہیں اس وقت کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ میں اب مزید تمرا سہارا نہیں بن سکتی۔"

جنت جراتی سے دادی کو کچھ ہی تھی۔ اسے یاد تھا جب اس کے والد فوت ہوئے تھے تب اس کے ماموں شہباز اور مائی فوڑیاں ان کے ہاں آئے تھے۔ کافی دن ان کے گھر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے جنت کو اپنے ہاں لے جائیں لیکن اس وقت دادی نے انہیں جنت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جنت خود بھی نہیں جانا جانتی تھی۔ وہ اس کے لیے اپنی بیٹی کی بات کہنے لگی۔ اسے اس بات کی سمجھ نہیں تھی لیکن وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ اس کی دادی اس کے لیے، لعل، غلام

نہیں سوچ سکتی۔

اس نے دادی کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا۔ "اجھا دادی الماں مجھے آپ کہیں گی ویسا ہی کروں گی۔ فی الحال تو آپ جلدی سے کھانا کھائیں اور دوائی لے لیں۔"

آج صبح ہی وہ دادی کے ساتھ سرکاری اسپتال گئی تھی اور وہاں سے دوائی لی تھی۔ دادی جان کو کھانسی کے ساتھ بخار بھی تیز تھا۔ دادی جو کہ کمر کے اس حصے میں پہنچ چکی تھی اور مشکل سے خود راہت چل پھر سکتی تھی۔

وہاں شاید کوئی نشہ تھا۔ دیے بھی کھانسی کی دوا میں الکلوش شامل ہوتی ہے۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ اس نے ایک فیصلہ کیا۔ ان کے گھر سے پانچ گھنٹا چھوڑ کر وہ شہر خانہ تھا جہاں اس کا باپ مزدوری کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہوا تھا۔

اس جیم خانے کا تنظیم باپ نہیں اسے جانتا تھا۔ اکثر اس کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ وہ اس کے پاس جا پہنچی۔

"پاپا میں ایک کام سے آئی ہوں۔" اس نے سلام کے فوراً بعد اچھا نہ عیاں کرنا چاہا حالانکہ اس وقت دفتر میں دوا دادی اور مائی بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیاں دیکھ کر باپ نہیں اٹھ کھڑا اور اس کے ساتھ دفتر سے باہر نکل آیا۔

"ہاں بیٹے کیا بات ہے۔ کچھ پیچھے چاہیے؟" انہوں نے دلا سارایا۔

"نہیں پاپا۔" اس کے بعد اس نے ساری بات بتا دی۔ آخر میں کہنے لگی۔ "لیکن میں دادی جان کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔ میں جانتی ہوں آپ اپنے جیم خانے میں مجھے اور دادی کو داخل کر لیں۔ کیونکہ دادی جان کے خیال میں، میں باہر محفوظ نہیں ہوں۔"

باپا رہتی نے ساری بات سننے کے بعد ایک ہنگامہ بھرا اور اس کے سر پر ہاتھ بھر کرے ہوئے کہا۔ "تم جاؤ کل اپنی دادی الماں کو ساتھ لے کر آنا۔"

وہ انہی قدموں پر واپس لوٹ آئی۔ آج اسے نہ جانے کیوں باپا نہیں کچھ بلا بلا سلا کا تھا۔ اس سے پہلے ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ آج وہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ پھر اسے باپا نہیں کچھ یاد آیا۔ جب وہ باپا نے اس کے لیے دفتر بنائی دی تھی، وہ اندر بیٹھے کھسے کہہ رہے تھے۔ "صاحب کو بتا دینا جی چڑا آنے والی ہے۔"

فدائی

وہ شخص جو کسی جذبے کے تحت کسی نیک مقصد کے لیے اپنی جان کا غدار بن جائے اس سے مراد "فدائی" ہوتا ہے۔ ہاں "جان فدا" اور "فدا" جی، بھی لیا جاتا ہے۔ عربی لفظ فدا دی سے نکلا کہ فدا کی ہو گیا ہے۔ انجرائز میں فدا دی اسے کہتے ہیں جو بہادری کے کارناموں کی داستان بیان کرے اور ایسی داستان کو فدا دیہ کہتے ہیں۔ یہ نام انصافوں اور انصافوں ان کو ملتا تھا جو کسی کو اور اسے ہٹانے کے لیے گل پر مامور کیے جاتے تھے۔ انقلاب ایران کے دوران میں شروع میں فدا دی وہ لوگ کہلاتے تھے جو جمہوریت پسند جماعت کے حامی تھے مگر بعد میں عام حریت پسند اور دستور کے حامی بھی فدا دی کہلانے لگے۔ شیخ زادہ لاہکی بنے شاہد اسامیل مغربی نے سنہ ۱۹۷۸ء میں خاں شیلی کے پاس بھیجا تھا فدا دی نکلیں کرنا تھا۔ محمد شاہ کا چار کا منظور نظر شاعر سید مرزا سید اوردستانی (جو اسفہان کا رہنے والا تھا) بھی فدا دی نکلیں کرنا تھا۔

مرسلہ: دراز خیل غازی، لاہور

اس جملے کی اسے سمجھنا آئی تھی مگر اس جملے پر دل دھڑک اٹھا تھا۔ وہ سوچنے کی شاہد اس نے غلطی کی ہے، اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کسی کو اپنا دھنسا کر اپنے آپ کو حریف کٹر کرنا ہوتا ہے۔ شاید اس کی دادی الماں ہی جانتی ہیں۔

وہ جب واپس آئی تو اس کی دادی الماں فوڈ کو کھیت کر دروازے تک لا چکی تھی، اس کی رال بھر رہی تھی۔ وہ پہلے ہی بیمار تھی۔ جنت کے جانے کے بعد وہ مزید گر مند ہو گئی تھی اور خود کو چار پائی سے اٹھانے کی کوشش میں پھنسا کر لیا تھا کیونکہ چلنا پھرنا اس کے لیے تو بڑا مشکل تھا پھر اسی حالت میں اس نے خود کو کھیت کھیت کر دروازے تک پہنچایا تھا۔ یہ سب کھیتے میں جنت کو زیادہ دیر نہیں گئی۔ کیونکہ اس کی دادی الماں کے مٹی سے اسے ہونے پڑے اس بات کی گواہی دے رہے تھے۔ اس نے جلدی سے دادی الماں کو پانی پلا لیکن وہ بولنے لگی۔ "مائی بیٹے، میں جنت میں سے جاتی ہوں۔" کب اس کی دادی کو دیکھنے والوں نے دن کیا اسے اس کا

انصاف

محترم مدیر

سلام مستنون!

ایک دیکھ بھری سیج بیانی ارسال کر دی ہیں۔ اسے ضرور شامل کر لیں۔ سبق آموز ہے۔

تسلیم شیع



میرا نام فیضان ہے اور ہم تین بھائی اور ایک بہن ہیں۔ میری بڑی بہن کی شادی اور بڑے بھائی کی شادی ایک ساتھ ہوئی تھی یہ شادی ویسٹ کی تھی۔

بڑی بہن تو اپنے گھر میں بے حد خوش تھی لیکن بھائی

اجی زندگی سے خوش نہیں تھا۔ وہ ماس بہو کے رواجی

جنگلوں میں پس کر رہ گیا تھا جبکہ اس درمیان وہ ایک بیٹے کا

جان تھا۔ اسی اس سے بچا کرتے تھے جبکہ بچے کی ماں حد

کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اور وہ چاہتا تھا کہ مہفرت والدین پر ہوتے تھے۔

”جنت کیا پریشانی ہے جنہیں، کیا سوچتی راتی ہیں“ ایک دن اس کی ممانی نے اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں ممانی بس دادی کی یاد آ جاتی ہے اور وہ ماں بچا بھی یاد آتے ہیں۔“

”تو نے اسے کھلے دل لیا اور کہا۔“ جنت اب اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو، مجھے اپنی ماں اور ماموں کو اپنا باپ۔ ماہر

ساجد، مسعد یہ کو اپنے بھائی، بہن سمجھو، اور اپنی زندگی کو ایک نئے عزم و حوصلے کے ساتھ شروع کرو، کیونکہ اس دنیا سے جانے

والے ابھی پلٹ کر نہیں آتے۔ ان کو یاد کر کے پریشان ہونے کی بجائے تم ان کے لیے قرآن خوانی کیا کرو اور ایصال ثواب کیا کرو۔“

ممانی کی یہ بات سن کر جنت اب پابندی سے صبح کے وقت قرآن پاک کی تلاوت کرتی، پانچویں وقت کی نماز پڑھتی

اور ہر نماز کے بعد اپنے مرحوم والدین اور دادی کی مہفرت کے لیے دعا کرتی، اسے جب بھی اپنے والدین اور دادی کی یاد آتی وہ قرآن پاک پڑھتی اور ان کے لیے دعائیں کرتی

جس سے وہ خود کو نیکو محسوس کرتی اور اللہ کا شکر ادا کرتی ویونکہ وہ جانتی تھی شکر کرنے والا انسان ہی زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہی کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس نے

خود کو شکر گزار بندہ بنا رکھا تھا اس لیے اللہ نے بھی اس آیت کی تشریح کر دی تھی کہ ”تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔“

☆☆☆

ماموں ممانی کی شفقت میں دن گزر رہے تھے کہ ایک دن ممانی کی بہن کراچی سے آگئی۔ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ اٹانے

اپنے بھائی کے ہاں آئی تھی۔ وہاں سے بہن کے گھر بھی آگئی۔ اس نے جنت کو دیکھا تو سوال کیا کہ یہ کون ہے؟ ممانی نے

اس کا مفصل تعارف کرایا تو انہوں نے کہا۔ ”یہ تو سرتا پا اللہ لوگ ہے، مجھے ایسی ہی بہو چاہیے۔“

اور پھر وہ ایک ماہ کے اندر اندر ممانی کے بھانجے ارشد کی دہکن بن کر رہا جی چلی گئی۔

وہی بے سہارا جنت آج دولت میں کھیل رہی ہے۔ اللہ نے ایک بے سہارا کی زندگی کو ایسے کامیاب کر دیا ہے کہ

اس کی ممانی نے جب اس کی اولاد جان پارائی تو اس

علم نہ ہو سکا۔ وہ ہوش و بے ہوشی کی درمیانی کیفیت میں نہ جانے کتنی دیر تک بیٹھی رہی۔

دادی کی وفات پر ہی جنت نے اپنے خاندان کو دیکھا تھا۔ اس کے ماموں شہباز جو کہ ایک گاؤں میں رہتے تھے

اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ ان کے دو بیٹے ایک بیٹی تھی۔ جن سے مل کر چل رہی جنت اپنے دکھو کرب بھول گئی۔ وہ

بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اسے کلاس ختم میں مسعدیہ کے ساتھ ہی اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔

ماہر اور ساجد، مسعدیہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ چاروں مل کر اسکول جاتے اور وہاں اس کو ہم درک کرتے مل کر ہی

کھیلتے تھے۔ چل رہی جنت نے اپنی ممانی کا ہاتھ پانا شروع کر دیا جس سے اس کی ممانی بھی خوش تھی۔ جب اس کے ماموں

کلاس سے لوٹ کر آتے تو وہ ہمارک کر ان کے لیے پانی لاتی، ان کے جوتے تبدیل کرواتی۔ ماموں اس کے سر پر ہاتھ رکھتے

اور دعا دیتے۔ اپنے بچوں سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتے تھے۔ جنت کی زندگی میں خوشیاں آنا شروع ہو گئیں۔

اس کے ماموں شہباز اور ممانی اللہ کا شکر ادا کرتے کہ ایک جیم کی پورش کا انہیں موقع ملا ہے، ویسے بھی جنت کے

ساتھ ان کا ایک غلوں، پیار اور محبت کا خوبصورت رشتہ تھا انہوں نے اسلام میں جیم کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی

روایات کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اور شری زندگی گزارتے تھے۔ بچے چونکہ ہم عمر تھے ان میں چھٹی موٹی لڑائی بھی ہو جایا

کرتی۔ جب کوئی بڑی جنت کو اپنی تو شہباز کو اس کا علم ہوتا تو وہ اپنی بیوی کو بھابھا کرتا۔

”رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے گھروں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں

جیم سے اچھا سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کے گھروں میں سے ہمارے وہ ہے جس میں جیم سے برا سلوک کیا جائے۔“

ممانی اسی وقت اسے گلے سے لگاتی تھی اور خوب لالچا کر کرتی۔ جنت کی زندگی میں اب کچھ آرام ہی تھا۔

وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔ جنت میٹرک میں آچکی تھی۔ جنت کا آبائی گھر اس کے ماموں نے گریہ پر دے

دیا تھا۔ اس سے آنے والی ساری آمدن وہ جنت کے نام سے بینک میں جمع کراتے رہتے تھے۔ جنت نے جب سے ہوش

سنبھالا تھا اس نے دکھ ہی دیکھے تھے۔ اب اللہ نے اس کی ساری غمناکیاں اٹھ کر لیں۔ وہ اب خوش و خرم ہو گئی تھی۔

اس کی ممانی نے جب اس کی اولاد جان پارائی تو اس

++

فتاویٰ جہانداری

مشہور مؤرخ شیخ الدین برنی کی تصنیف۔ یہ کتاب فیروز شاہ تغلق کے عہد کے پہلے چھ برسوں کے دوران میں لکھی گئی۔ اس میں برنی نے غیاث الدین بلبن سے لے کر فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی عہد تک کے سیاسی و معاشرتی حالات کے بارے میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ برنی ذاتی طور پر سیاست کو مذہب سے الگ نہیں سمجھتا، بلکہ اس کی دلی خواہش تھی کہ ملکی، سیاسی و معاشرتی مسائل کے حل کرنے میں قدیم ضابطہ حیات کی طرف رجوع کیا جائے اس لیے اس نے قرآن مجید اور شادات نبوی اور خلفائے راشدین کے حکام کی روشنی میں بعض مسائل کو واضح کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ سلطان محمود غزنوی کو اس نے خاص طور سے مثالی رہنما بتایا ہے۔ کسی مثالی رہنما کے ذریعے اپنے نظریات کو بیان کرنے کا انداز قدیم علماء نے اختیار کیا تھا۔ برنی نے بھی یہی انداز اپنایا، چنانچہ سیاسی حالات میں اپنے ذاتی تاثرات کو بھی وہ سلطان محمود کی زبانی بیان کرتا ہے۔ "قادی جہانداری" کے اہم موضوعات یہ ہیں۔ بادشاہ کو خدا کی عنایت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کا مرتبہ دینی، شعور کی اہمیت و معیاروں کے اوصاف، مساوات خاص و مساوات عام، عسکری نظام، حق و باطل، ملوث و غیر ملوث، تصنیف کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

عہد تک کر رہا تھا۔ وہاں سے سامان لکڑا اور گھر باہر پارک میں گئے۔ لیکن چاندی کا وہ ٹکڑا بھی تو کیا مال ہوگا۔ میں روکنے کی کوشش کرتا رہا مگر انہوں نے مجھے بھی جھڑپ مار کر خاموش رہنے کی تلقین کی۔ میں ایک کمری پر بیٹھ گیا اور سب کا ردولی ملاحظہ کرنے لگا۔ اور ساتھ ساتھ مجھے کوکھن دے دے کر سلاتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سو گیا۔ اسی نے بھائی کو دل بھر کر دھوکہ دیا۔

بھائی بہت پیاری تھی۔ بھائی کے ساتھ ان کی جوڑی خوب چلتی تھی۔ دونوں ہی دہلے سکتے تھے اور نین نین کر کے رشتہ آتا تھا۔ اب بھائی کی جوڑی بھی وہی تھی۔ میں اور چینیوں جیسے بیٹھے ہوئے نین نہیں کر سکتے۔ صاف تھا کہ میں جسم بے دھڑکا تھا۔ میری بیوی بھی سوئی تھی۔ ہماری جوڑی بھی کچھ خاص نہ تھی۔ بس ٹھیک ہی تھی۔ میں نے شادی اپنی والدہ کی پسند سے کی تھی اور ان کی خوشی میں راضی ہو گیا تھا۔ بیوی کا خیال کرتا تھا کہیں اتنا نہیں جتنا اپنی ماں کا کرتا تھا۔

خیر ساری کارروائی کرنے کے بعد میری والدہ وہیں فرش پر بیٹھ کر رہ گئیں۔ جتنا بھائی کو چاہتا تھا۔ اس لحاظ سے ان کا ٹھکانا جتنا تھا۔ میں نے آہٹ سنا لی۔ اسی نے میری طرف دیکھا اور میں نے ان کی طرف، میں نے آنکھوں کی آنکھوں سے بے بسی ظاہر کی۔ اسی میں بہت ہمت تھی۔ لگا تھا بدلا لے کر پر سکون ہو گئی ہیں۔ انہیں غصہ تھا کہ پیادہ گیت سے بیٹھ کر کچھ لیتے۔ یوں کورٹ میں انہیں ڈیل و دوا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

تھوڑی دیر بعد نیچے کے پورشن سے آہٹ آئی بند ہو گئی۔ اسی جی نے اٹھ کر کچھ شے میں خود پر نظر ڈالی، تو ان کے بال بے ترتیب تھے، انہوں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے ہی اپنے بال درست کیے۔ چادر چلی اور مجھے پلٹے کا اشارہ کیا۔ میں نے پیچھے کی طرف نگاہ نہیں کی وہ انہیں شاید یہ ڈر تھا کہ کہیں ان کا دل سے نیچے کو لے جائے تو وہی نہ کر جائے۔ بھائی فرش پر اندر جی تھی درد سے بلجھا رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ اٹھ کر خود کو سنبھال سکے۔ اپنے درد کو ٹھیک کر کے انہیں کہاں کہاں دھکے دے رہا تھا۔ اسی نے میرا بازو پکڑا اور میں نے بچہ بھائی کے ہمارے میں رکھا پھر ہم تیزی سے بیڑیوں سے اتر کر گیت

میں نے پہلے انکار کیا لیکن جب ماں نے زبردستی جانے کو کہا تو دیوار پھٹا کر میں اندر داخل ہو گیا۔ اسی دوران میں اسٹیشن ٹکٹ ہو چکا تھا اور پانی کی طلب ہو رہی تھی۔ میرا دل کیا کہیں میں جا کر پانی کی لوس لیکن پھر اسی کا خیال آیا جو ابھی باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ قدموں سے مین گیٹ پر پہنچ کر گیٹ کھول دیا۔ اسی کمر میں داخل ہو گیا اور پھر آگے بڑھے۔ کمر میں داخل ہوتے ہی چھوٹی سی راہداری تھی جہاں سے نذر کر اندر جاتا تھا۔ بہت ہی آرام سے قدم رکھتے ہوئے ہم اندر داخل ہوئے۔ اب سورہے تھے، لیکن چھوٹے کی رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اسی کے ہاتھوں سے مانوس تھا۔ اسی کا اس محسوس کرتا تھا۔ اسی سے سوتا تھا۔ بھائی کو اسے چپ کرانے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ دو گھرے چھوڑ کر بیڑیاں چھیں۔ ایک میں میری ماں اور اس کا شوہر موجود تھا اور دوسرے میں اس کے ساسر موجود تھے۔ ہم احتیاط سے قدم اٹھاتے کر دلوں کے سامنے سے گزرے اور پھر بیڑیاں چڑھنے ہی سامنے ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے کے ساتھ دوسری طرف بھائی کا کمرہ تھا۔

میں ان کی روکنے کی کوشش کرتا تو اسی میری بات سنی اور تڑکی مچتی تھی۔ پتا نہیں کیوں آج میرا شیر جاگ رہا تھا یا تو اسی کی باتوں کا اثر تھا یا پھر اس بات کا کہ میں خود باپ بنے والا تھا۔ جب انسان خود ماں باپ بنتا ہے اسے جب ہی دوسرے والدین کا احساس آ جاتا ہے اور یہی کیفیت میرے ساتھ ہو رہی تھی۔ دل زوروں سے دھڑک رہا تھا کہ جانے کیا ہو جائے۔ ہم نے بھائی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا تو بھائی نے بناوٹ سے دروازہ کھول دیا، شاید ان کے خیال میں آج ان کے والدین کی آواز نہ کر آئی ہیں۔ ہمیں دیکھ کر ان کے ہاتھ پر ہل پڑ گئے۔

"آپ لوگ تو چلے گئے تھے؟" ان کے چہرے پر حیرانی کی ہر پچھائیں نمایاں تھیں۔ میری اسی کے چہرے پر کینسی سی مسکراہٹ آئی اور پھر انہوں نے ان کے گلوں پر ہاتھیں رکھی روائی کا چمڑکا کر دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ پہلے سے تیار کر آئی تھیں۔ اسی نے مجھے پکارتے ہوئے اور اپنے دو گھرے کو کہہ کر اپنے اندر گروہ سے باہر جانے کو کہا۔

میں نے پہلے انکار کیا لیکن جب ماں نے زبردستی جانے کو کہا تو دیوار پھٹا کر میں اندر داخل ہو گیا۔ اسی دوران میں اسٹیشن ٹکٹ ہو چکا تھا اور پانی کی طلب ہو رہی تھی۔ میرا دل کیا کہیں میں جا کر پانی کی لوس لیکن پھر اسی کا خیال آیا جو ابھی باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ قدموں سے مین گیٹ پر پہنچ کر گیٹ کھول دیا۔ اسی کمر میں داخل ہو گیا اور پھر آگے بڑھے۔ کمر میں داخل ہوتے ہی چھوٹی سی راہداری تھی جہاں سے نذر کر اندر جاتا تھا۔ بہت ہی آرام سے قدم رکھتے ہوئے ہم اندر داخل ہوئے۔ اب سورہے تھے، لیکن چھوٹے کی رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اسی کے ہاتھوں سے مانوس تھا۔ اسی کا اس محسوس کرتا تھا۔ اسی سے سوتا تھا۔ بھائی کو اسے چپ کرانے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ دو گھرے چھوڑ کر بیڑیاں چھیں۔ ایک میں میری ماں اور اس کا شوہر موجود تھا اور دوسرے میں اس کے ساسر موجود تھے۔ ہم احتیاط سے قدم اٹھاتے کر دلوں کے سامنے سے گزرے اور پھر بیڑیاں چڑھنے ہی سامنے ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے کے ساتھ دوسری طرف بھائی کا کمرہ تھا۔

دیا۔ "ابھی تک آپ پہنچے نہیں۔ مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔" یہی نے غمزدانہ لہجے میں کہا۔ تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا جواب دوں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے منہ سے جھجکاؤ نہ پھڑک جائے اور اگر ایسا ہوا تو میری والدہ وہی حال میرا کر لیں گی جو بھائی کا کیا تھا۔

"راستے میں ٹرین کا انجن خراب ہو گیا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔ بس تین گھنٹے تک بیٹھ جائیں گے۔" میں نے خود کا اعتماد بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میری بیوی نے تھوڑی اور باتیں کیں اور فون بند کر دیا۔

فون بند کرنے کے بعد میں پھر سے سوچ میں پڑ گیا اور اب سوچ رہا تھا کہ میری بیوی نے بھائی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ کیا اسے وہاں کی کوئی خبر نہیں آئی؟ کیا بھائی ٹھیک ہیں؟ انہیں کچھ ہوا تو نہیں؟ یا پھر زیادہ طبیعت نہ خراب ہو۔ خدا خیر کرے۔ میں بار بار ان کے لیے دعا میں مانگ رہا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہوں۔ انہیں کچھ بھی نہ ہو۔ اب ان کے پاس ان کا بیٹا تھا اور بچے کے لیے اس کی ماں بے حد ضروری ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

ہم جب گھر پہنچے۔ اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔ مگر کچھ کریمیں خبر لی کہ ساتھ بھائی اسپتال میں ہیں۔ انہیں کسی نے بہت مارا ہے اور وہ اسی کا پی نام لے رہی ہیں۔ اسی نے پیٹنے سے سر پر روپا پانچا اور رونے لگ گئیں کہ وہ اپنی بیٹی کو کیسے مار رہی ہیں۔ جب وہ اس کی بہن تھی تب ہاتھ نہ اٹھایا۔ اب وہ کیسے کر سکتی ہیں؟

میری بیوی مجھے اور میری اسی کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ دیکھنے سے میں نے منہ مڑ لیا اور پھر جلدی سے اٹھ کر اپنے شواہر نے لگ گیا۔

اسی اپنی بات پر قائم تھیں کہ میں کچھ مظلوم نہیں۔ ہم تو وہاں سے مصر کے لٹے ہوئے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ اسے کس نے مارا ہو سکتا ہے خود کو ہی مارا ہو اور اب خود کو ہی کر کے ہم پر الزام لگا رہی ہو۔

میری والدہ کی بات سن کر میری بیوی خاموشی سے رہی اور جا کر کچن میں کام کرنے لگ گئی۔ اس کے وہاں سے جانتے ہی اسی نے رو نہ دیکھا اور بیٹ پر لپٹ گئیں۔

کرنے نہ دیا۔" اسی نے بڑبڑاتے ہوئے کبھی اپنے اوڑھنا اور سو گئیں۔

اللہ نے مجھے بھی بیٹی سے اور بھائی کی دوسری بیوی کو بیٹے سے نوازا۔

گھر میں اب سکون رہنے لگا تھا۔ اسی اب بہت کم کسی بہو کو کچھ کہتی تھیں۔ ان کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنا تھا۔ ہمارے گھر کے ساتھ ایک گھر چھوڑ کر اسی کی دوست کا گھر تھا اور اس کے بیٹوں کی شادی تھیں۔ اسی اور بھائی میں معروف رہتی تھیں۔ گھر کے کام میری بیوی اور بھائی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی تھیں۔ سب کچھ اچھا چل رہا تھا کہ راجا ک میرا چھوٹا بھائی دہلی سے آگیا۔ اور بھائی زندگی میں پہلی بار گئی۔ وہ دہلی سے ساتھ لاکھ کر لایا تھا۔ جسے دیکھ کر میری اسی اور بھائی نے ہم سے آنکھیں میچھ کر لیں۔ اسی مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں لیکن چھوٹے کی باتوں میں آکر انہوں نے مجھے ہاتھیں سنانا شروع کر دیں۔ میں اور بھائی بھائی دکان سنبھالتے تھے۔ لیکن اب اسی اور بھائی کو ہم دینے لگتے تھے۔

میری بڑی بیوی بھائی سے اسی کا جھگڑا ہونے لگ گیا۔ ہر وقت گھر میں فساد شروع رہتا تھا۔ بھائی نے غصے سے آکر بھائی کو گھر سے نکال دیا۔

انہی دنوں میں کے بعد میرے بیٹے کی پیدائش ہوئی اور مجھ پر دہری زندگی جاری ہو گئی۔

ابو کو مجھ پر ترس آیا اور انہوں نے دکان مجھے سونپ دی۔

بھائی کو گھر سے نکالے تین ماہ ہو گئے تھے۔ بھائی اس سے ملنے نہیں جاتے تھے۔ محلے والوں نے ان کے گھر والوں کو بھائی کا پاؤں لگا کر ایسے دوسروں کی بیٹیوں کے ساتھ نہیں کرتے۔

"ہم بھی آپ لوگوں کے گھر کے معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں، جو آپ لوگ ہمارے معاملات میں دخل اندازی کر رہے ہیں۔" ابو اتنی بری طرح لوگوں کو لڑاتے تھے کہ وہ دوبارہ کچھ نہیں کہتے تھے۔

بھائی کی والدہ بھی کی پریشانی بردہاں کی جارہی تھیں۔ بے حد پریشان تھیں۔ وہ گھر آکر ہاتھ بھی جڑتیں کر ان کی بیٹی کے ساتھ اپنا کر رہے۔ وہ آگے کے بچے کی

نمران کی آواز بھائی کوئی نہ سنا۔ ایک کان سے سن بھی لینے تو دوسرے کان سے باہر نکال دیتے تھے۔

بھائی کی والدہ اسی پریشانی میں زندگی کو خیر آباد کہہ کر فوت ہو گئیں۔

بھائی بہت روئیں۔ آبی نے بڑے بھائی کو فون کر کے بھائی کا اپنی زندگی کو دوبارہ خراب نہ کرو۔ جاؤ بیوی کو حوصلہ دے۔ اسے تمہارے کاغذ کی ضرورت ہے۔

جیسا میری ماں کو ہوتا چاہیے تھا۔ ویسی میری بڑی بہن تھیں۔ اس کا سسرال اچھا تھا اس لیے وہ ہمیں بھی سنبھالتی تھی اور کبھی بھی کہ میرا دل کرتا ہے جیسے میں اپنے گھر میں بے حد خوش ہوں۔ ویسے ہی ہر لڑکی اپنے گھر میں خوش باش رہے اور اس کے لیے مرد کو چاہیے وہ اپنی بیوی کو خوش رکھے۔

بھائی بھائی کے پاس گیا اور حوصلہ دیا۔ بھائی نے لڑائی تو کی مگر مان گئیں۔ عورت تو مرد کے دہلیز سے چل جاتی ہے۔

اسی نے کہا کہ بھائی کو دایس نکالنا۔ بھائی خاموش رہا اور پھر وہ نہیں لایا۔ مگر اس نے میرے ابو سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ دکان اس کے نام کریں، میرے چھوٹے بھائی نے کہا کہ وہ دکان نہیں لینے دے گا۔ یہ دکان اس کی ہے۔

اسی بات پر دونوں ہاتھ پائی کرنے لگے۔ اسی پھر میں بڑے بھائی کا سر پٹ گیا۔ لوگ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کوئی بھی چھڑوانے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ جب میرے باپ نے کسی کی بات کی لاف نہیں رکھی تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ پائے پھٹے میں ہاتھ ڈالا۔

پائے پھٹے میں ہاتھ ڈالنے سے خود پر پی کچھ پڑتا ہے۔ چاہے آپ دوسروں کا بچاؤ نہیں بن کر ہی کریں عمر زخمی آپ خود ہی ہو جاتے ہیں۔

اس سب جھگڑے میں میں خود بھی زخمی ہو گیا۔ بھائی کو خیر تھا کہ جب وہ اپنے والد سے بات کر رہا ہے تو چھوٹے کو کیا پڑی تھی کہ وہ بیچ میں ٹانگ اڑائے اور پھر ہاں سے اسے منہ بھی نہیں کیا اور بولے دیا۔

جب ماں باپ ہی اپنے بچوں میں انصاف نہ کریں تو دوسروں سے کیا امید کرے وہ آپ کو انصاف دلا سکیں اور جیسا ماں باپ کریں گے وہ آپ کو انصاف بھی کرنے کی۔ مگر آپ چاہتے ہیں کہ میری والدہ کی ہر بات پر ہاں دے۔

ہاتھیں مائیں اور بیوی کی فراموش کر دیں۔ تب ہی احساس کمتری بچوں میں آتی ہے اور وہ والدین سے بدتمیزی کرنے کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر بدادیت پر اتر آتا ہے۔ پتے والدین سے ہی نکلتے ہیں۔ جب والدین انصاف نہیں کریں گے، تو آگے بڑھ کر بچے کیسے رشتوں میں انصاف کر سکیں گے۔

☆ ☆ ☆

بڑا بھائی اپنا حصہ لے کر علیحدہ ہو گیا اور اس نے اپنا کاروبار شروع کر لیا۔

اسی چھوٹے بیٹے کا زیادہ خیال کرنے لگیں اور اس کے لیے لڑکی ڈھونڈنے لگ گئیں۔

میری بیوی بچوں کے ساتھ کبھی دہلی تھی اور میں اپنے کاموں میں۔

ایک دن اسی کی اور میری بیوی کی لڑائی ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے پر بہتان لگا رہی تھیں۔ میں گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر سڑک کر رہ گیا۔ جب دونوں میرے پاس آئیں اور کہا کہ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ماں خود کو ٹھیک کہے جا رہی تھیں اور بیوی خود کو گھٹا کر رہی تھیں۔ میں اپنی ماں کو غلط نہیں کہہ سکتا تھا۔ ماں جیسی بھی ہو وہ ماں ہوتی ہے اور ہم ماں کو غلط کہہ کر کیا ہو سکتے ہیں۔ میں نے بیوی کو خاموش ہونے کو کہا اور بولا۔ "جاؤ میرے لیے کھا لاکھ بھوک لگی ہے۔"

میری بیوی میرے سامنے سے نہیں گئی۔ وہ بولی۔ "آج فیصلہ ہو کر رہے گا یا تو تمہاری ماں یا پھر میں۔"

عورت جب یہ فیصلہ کرتی ہے تو وہ یہ کہیں نہیں سوچتی کہ کل کو اس نے بھی سانس بٹھا ہے۔ چاہے اسی نے یا بری۔ اگر بہو کر ایسا فیصلہ کرنے کو کہے تو اس پر کیا ہے؟ میں نے بیوی کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا۔ "خدا کے لیے بات ختم کرو اور جا کر کام کرو۔"

میری بیوی ضد پر قائم رہی۔

بیویوں کا ماس کے ساتھ جھگڑے کرنے کا پتا ہے مگر یہیں پتا کہ جب مرد باہر سے تھکا ہوا لوٹے تو اس کو سکون دے۔ کھانا میا کرے۔ اس کے سامنے جھگڑے کی پٹی کھول کر نہ بیٹھ جائے۔

میری بیوی زندگی بھر میرے سامنے کھڑی رہی اور میں میں شیطان کے بہکاوے میں آ گیا اور غصے سے

تبت

وینٹر کیئر رینج

سرد اور خشک موسم میں

اپنی جلد کو دیکھتے

بھرپور تحفظ



چہرے پر

ہاتھوں پر

چہرے پر اور ہاتھوں پر

چہرے پر اور ہاتھوں پر

چہرے پر اور ہاتھوں پر

TIBET

نظر دوڑائی۔
نظر دوڑانے پر میری نظر پاس بڑی کالج کی گولڈ ڈارک کی بوس پر پڑی اور میں نے وہ اٹھا کر بیوی کے سر پر دے ماری۔
میری اسی کو توقع نہیں تھی کہ میں ایسا کروں گا۔ اگر انہیں مجھ سے ایسی توقع ہوتی تو شاید وہ مجھے روک لیتی۔
میری بیوی کو بوس پڑی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں ہی میں نے ایک دولا تھیں ماریں۔
میری ماں نے مجھے ایک طرف دھکا دیا اور جلدی سے میری بیوی کو سنبھالا۔ ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر شاید دیر ہو گئی تھی۔ بیوی کے سر سے خون لٹکا دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا اور جو خسر تھا وہ اب خوف میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے والدہ کی طرف دیکھا کہ کیا کروں؟
”مجھ سے پوچھ کر مارا تھا، جو اب پوچھ رہا ہے۔“
میری امی نے غصے سے مجھے کہا اور پھر میرے والد صاحب کو آواز دی دیکھیں۔ وہ آئے تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔
انہوں نے جلدی سے فون کر کے ایبوی لینس منگوائی اور میری بیوی کو اسٹرپٹر پر ڈال کر ایبوی لینس میں ڈالا۔
لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہوا۔
”وہ بچوں نے ماں کے سر پر بوس ماری۔ آج کل کے بچے شرارتی ہی بہت ہیں۔“ ابو نے جھکاتے ہوئے لوگوں کی باتوں کا جواب دیا اور ہم اسپتال کے لیے نکل گئے۔
میری بیوی کا سر سے کافی خون بہہ گیا تھا۔
ڈاکٹر نے ہمیں خون کی بوتلوں کا بندوبست کرنے کو کہا۔
میرے جتنے بھی جاننے والے تھے میں نے سبھی کو خون کے لیے فون کیا۔ سب نے قیام دیا۔
میری بیوی کو ہوش نہیں آ رہا تھا اور یہ بات کافی تشویش کا مقام تھی۔ میری امی بار بار مجھے ہرزاش کر رہی تھیں۔
میں خاموشی سے سنا رہا تھا۔ آج بھی الٹ سبک نہ کیا۔
”اچھا بیٹا بیٹے کے پکڑیں اچھا شوہر نہ بن سکا۔“
میری چچی کو وہ دن بعد ہوش آیا اور وہ اپنا دھکی توڑاں کوٹھکی گئی۔ پاگل ہو چکی تھی اور ایک پاگل انسان کی ہمارے گھر میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ہمارے گھر میں تو صحت مند انسان کی بیکر پٹھن تھی پھر پاگل انسان کی جگہ آسانی۔
میں اب پاگل خانے، گھر اور دکان کے پکڑ میں کھوکھ رہتا ہوں۔
صبح اٹھ کر بیوی کو دیکھنے پاگل خانے جاتا تھا۔ ہمارے دکان پر جاتا تھا اور پھر گھر میں آ کر بچوں کو سنبھالتا تھا۔
میں جب گھر نہیں ہوتا تھا تو امی بچوں کو سنبھال لیتی تھیں۔ اب وہ خود گم سم رہتی تھیں۔ چھوٹے سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا گھر اجڑے جو اس لیے میں گھر ہی نہیں بیٹا۔ وہ دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اسے گھر کی کوئی گھر ہی نہیں تھی۔
امی جہاں بیٹھی ہوتی وہاں بیٹھے سوچوں میں گم رہتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے سابقہ بیوی بھائی کو فون کر کے کہا جانی باگھی تھی۔
دوسری بیوی بھائی نے گھر واپس آنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں بھی آدھی آدھوری زندگی بسر کر رہا تھا۔
میں وہ انسان ہوں، جس نے اپنے پاؤں پر خود کھانا پڑی ماری تھی۔ اگر میں بیوی کو پیار سے دیکھ کر لیتا تو کچھ ایسا کرتا جس سے میری ماں اور بیوی نہ لڑتے۔ کچھ چھاسوچ لیتا تو آج پاگل خانے کے پکڑ نہ لگتا۔
میں نہیں جانتا کہ میری بیوی ٹھیک ہو پائے گی یا نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں ٹھیک نہیں ہو پاؤں گا۔ میں نے اپنے بچوں سے ان کی ماں چھین لی۔ اپنی آخری سکرانی زندگی میں غصے سے ڈیر کھول لیا۔
غصہ ٹھیک کو کھا جاتا ہے اور میرے پاس تو پہلے ہی غسل بہت کم تھی۔
خیر، میرے جیسے مردوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ان کی زندگی میں اگر ایسا نہیں ہوگا تو شاید انہیں قتل نہیں آئے گی۔
رشتے غلوں سے محبت سے انصاف سے جلتے ہیں۔ اگر رشتوں میں انصاف کیا جائے تو ہر مصائب جھیلے میں آسانی رہتی ہے۔
آپ سب میرے لیے دعا کیجئے گا کہ میرا رب مجھے اور میری ماں کو دوسروں کے ساتھ کی گئی نا انصافیوں کو بھلا کر ہمیں معاف کر دے اور ہماری زندگی سہل کر دے۔ ہمیں سکون دے۔ آمین۔

جوہر جوشاندہ®

EXTRA STRENGTH



دُور رکھے زکام، کھانسی، نزلہ!

Extra
Strength

دن میں 3 بار...
عادت بنالیں!



زکب، شہد، چاکلیٹ اور شوگر فری ہیں یہی کتاب ہے!

www.qashri.com | Qashri Official | www.qashrihealthshop.com